کیا ہم مسلمان ہیں؟

ایک سوال

جس کا جواب آنکھوں کو
اشکوں سے اور قلب و روح
کو سوز و گداز سے بھر دیتا
ہے۔

PART
1

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

کیا ہم مسلمان ہیں

(جلد اوّل)

شمس نوید عثمانی



اخلاص، رقّت اور سوز و
درد میں ڈوبا ہوا
تاریخی صداقتوں کا
ذکرِ جمیل

مکتبہ تجلّی دیوبند

صفحات ٢٠٨

قیمت مجلّد .... دو روپے ۵۱ نئے پیسے

مطبوعہ .... مئی [illegible]ء

مطبع .... اسلامی پرنٹنگ پریس دیوبند

طابع .... مکتبہ تجلّی دیوبند

پانچویں بار -------- ایکہزار

انتساب

میں اس کتاب کے اس ثواب کا انتساب جسکی توقع خالص رحمتِ خداوندی کی بنیاد پر ہے حسب ذیل ہستیوں کے نام مخصوص کرتا ہوں :-

- حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلیل القدر "ستاروں" کیلئے جنکی زندگی اس کتاب کا خون حیات ہے۔
- اپنے والدین کی روحوں کے لئے جنھوں نے خون دل و جگر سے مجھے پروان چڑھا کر قلم اُٹھانے کے قابل بنایا۔
- اپنے شیخ گرامی حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے نام جنکی دعاؤں اور فیض نظر سے مجھے رحمتِ خداوندی کا سایہ ملا۔
- اپنے بڑے بھائی مسعود جاوید صاحب کیلئے جو میری یتیم و یسیر زندگی کا سہارا بنے۔
- اپنے بھائی اور "دوست" مولانا عامر عثمانی کیلئے جنکی تحریک پر اس کا آغاز ہوا اور جنکے مشوروں نے تحریر کے نوک پلک درست کرنے کا سلیقہ سکھایا۔

رحمتِ خداوندی کا طلبگار شمس نوید عثمانی

پیش لفظ

اگر میں کہوں کہ جو سلسلۂ مضامین عزیزی شمس الرحمٰن سلمہٗ اللہ تعالیٰ نے "کیا ہم مسلمان ہیں" کے عنوان سے تجلی میں قائم کر رکھا ہے اس کی کوئی بھی قسط میں ایسے صبر و سکون کے ساتھ نہیں پڑھ پایا کہ آنکھیں نہ بھیگیں اور قلب و روح میں گدازوگداخت کی ایک خاص کیفیت محسوس نہ ہو تو آپ پلٹ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ تیرے دل کی کمزوری اور اعصاب کے ضعف کا نتیجہ ہے۔

بے شک میں اپنے اعصاب کے قوی ہونے کا مدعی نہیں مگر یہ تو آپ بھی مانیں گے کہ موم جیسی نرم شے بھی اسی وقت پگھلتی ہے جب شمع کی لو شعلہ بنکر اسے آنچ پہنچاتی ہے۔ لو شعلہ نہ بنے یا شعلہ تپش و حدت سے خالی ہو تو موم ٹس سے مس نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری اثر پذیری کو ضعف کا ثمرہ قرار دینے کے باوجود اس قوت تاثیر کا انکار نہیں کیا جاسکتا جو عزیز موصوف کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ آپ کی آنکھیں ان تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے نم نہ ہوں اور آپ کے قلب و روح ان سے کوئی گہرا اثر نہ لے سکیں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے سنگ و آہن پر ہلکی آنچ کے انگارے کوئی اثر نہیں کرتے — اس کے باوجود کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ انگارے تپش و حدت سے خالی ہیں۔

عزیز موصوف سے میرا خون کا رشتہ ہے اس لئے یہ تو موزوں نہ ہوگا کہ میرا قلم ان کے اوصافِ حمیدہ کو شرح و بسط سے بیان کرے۔ تاہم تحدیثِ نعمت کے طور پر اتنا عرض کر دینا بہر حال بیجا نہ ہوگا کہ سوز و اثر کی جو نعمت موصوف کی تحریروں میں پائی جاتی ہے اور سرشاری کی جو شراب ان کے لفظ لفظ سے چھلکتی ہے اس کا تعلق محض فن، محض مشق و مزاولت اور محض ملکۂ تحریر سے نہیں ہے بلکہ اس کا سرچشمہ وہ گہرا اخلاص اور تعلق مع اللہ ہے جس سے ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رچا ہوا ہے۔ تقویٰ اور کردار۔ اللہ کا خوف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت۔ دین و اخلاق کی قدروں سے عملی وابستگی اور منکرات و مشتبہات سے وحشت و اجتناب یہ ہیں وہ اوصاف جو ان کے رشحاتِ قلم کی اثر انگیزی کا مصدر و منبع ہیں۔ وہ ہم جیسے بے توفیق اور متساہل لوگوں میں نہیں ہیں جو زبان و قلم کے اسٹیج پر تو رستم و افلاطون نظر آئیں لیکن عمل کے اسٹیج پر چیونٹی سے زیادہ تیز نہ چل سکیں۔ وہ اللہ کے فضل سے ان بلند اقبال نوجوانوں میں ہیں جنھیں خلوصِ نیت کے ساتھ خلوصِ عمل کی نعمت بھی خدائے بخشندہ نے بطورِ خاص مرحمت فرمائی ہے۔ بطورِ خاص اس لئے کہ آج کی دنیا میں ایسے نوجوانوں کا وجود نوادرات میں سے ہے جو دنیا کو اس نظر سے دیکھیں جس نظر سے اللہ کے سچے رسولؐ اور اس رسولؐ کے جلیل القدر صحابہؓ نے دیکھا تھا۔ جھوٹی تعریف سے خدا کی پناہ۔ اس میں شمہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہے کہ شمس الرحمٰن کی تحریروں کی شدتِ تاثیر کا مخزن و منبع ان کا وہ کردار ہی ہے جس پر ہم جیسے کوتاہ عمل اور بے توفیق لوگ بجا طور پر رشک کر سکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی تحریروں سے لوگوں کو فائدہ پہنچیگا اور پہنچ رہا ہے

یہ یقین اس لئے نہیں کہ مختلف جریدے تجلی سے ان کے شہ پارے نقل کرتے ہیں اور ہر حلقے میں ان کی نگارشات کو پسند کیا جا رہا ہے۔ یہ مقبولیت لائق شکر ضرور ہے لیکن میرے یقین کی بنیاد اس سے ہٹ کر وہی مخصوص شے ہے جس کا میں نے تذکرہ کیا۔ یعنی صاحب تحریر کے قول و فعل کی ہم آہنگی اور اخلاص و للّٰہیت کی جلوہ طرازی مجھ سے بہت لوگ کثرت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تجلی کی ڈاک تفہیم الحدیث اور "مسجد سے میخانے تک" کو کتابی شکل دوں۔ لیکن افادیت کے مذکورہ یقین ہی کی بنا پر میں نے مکتبہ تجلی کو "کیا ہم مسلمان ہیں" سے آغاز کرنے پر آمادہ کیا ہے اور الحمد للہ کہ آج یہ مبارک آغاز انجام پا گیا ہے۔ میں نے اس کتاب میں کچھ ایسے رشحات بھی شامل کرا دیئے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ انکی موجودگی میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جو حضرات تجلی پڑھتے رہے ہیں ان کے لئے بھی یہ کتاب بالکل ہی "سکنڈ ہینڈ" ثابت نہ ہوگی!۔

طویل پیش لفظ سے قارئین کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا لیکن رخصت سے پہلے اتنا اور عرض کرتا چلوں کہ "افادیت" سے میری کیا مراد ہے اور صدیوں پہلے کی ان سچی کہانیوں سے مجھے قوم و ملت کے حق میں مجھے کس نفع کی توقع ہے۔

جن حضرات کے ذہن و قلب پر مادہ پرستانہ طرز فکر کا غلبہ ہے اور وہ ہر چیز کو ظاہری اسباب و علل اور مادیت ہی کی ترازو میں تولتے ہیں وہ تو یقیناً اس نکتے کو نہ سمجھ پائیں گے کہ ملت مسلمہ کے موجودہ مسائل میں پارینہ ماضی کی یہ کہانیاں کیا کارفرمائی کر سکتی ہیں۔ لیکن اسلام نے جو طرز فکر اور عقیدہ دیا ہے اس کی رو سے یہ بات ریب و ابہام سے بالاتر ہے کہ ہمارا ماضی ہی وہ مصدر و منبع ہے جس سے ہمیں زندگی، قوت اور عزم و ہمت کی متاع فراہم ہو سکتی ہے ہمارا دین جن راہوں سے آگے بڑھا ہے۔ ہمارے پیغمبر کی دعوت جن خطوط پر چل کر

کامیاب ہوئی ہے۔ ہمارے اسلاف نے جن قوتوں سے کام لے کر شہنشاہوں کے تخت الٹے ہیں ان کا سرچشمہ وہی قرآن و حدیث تو ہیں جنھوں نے ہمیں درس دیا ہے کہ جتنا جتنا خدا سے ڈروگے اتنا ہی اتنا دنیا تم سے ڈرے گی۔ جتنے خلوص کے ساتھ تم خدا کے دین پر صبر و استقامت کا ثبوت دوگے اتنے ہی التفات کے ساتھ خدا تمہیں عزت و کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ تم خدا کے حضور جھکوگے۔ خدا دنیا کو تمہارے قدموں میں جھکا دے گا۔ جب ایک تنہا انسان محمدؐ بن عبداللہ نے پوری دنیا کے بالمقابل توحید کی دعوت پیش کی تھی تو ظاہری اسباب کی بنا پر آخر کون گمان کرسکتا تھا کہ یہ دعوت مخالفت کے بڑے بڑے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے گی۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ خدا پر بھروسہ کرنے والے صابر پیغمبر کی استقامت نے ہر طوفان مخالفت کا منہ موڑ دیا اور وہی فضا جو تہہ بر تہہ ظلمتوں کا مسکن تھی نور و نالش سے جگمگاتی چلی گئی۔

آج حالات کتنے ہی مختلف ہوں لیکن حریف قوتوں پر فتح پانے اور عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کے لئے ہمیں بہرحال وہی صلاحیتیں درکار ہیں جن سے ہمارے اسلاف نے کام لیا تھا اور جن کے طفیل قادرِ مطلق کی رحمت و نصرت کمزور بندوں کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ آپ دیکھتے ہیں غذاؤں کی کتنی ہی نئی قسمیں ایجاد کر لی جائیں لیکن انھیں تناول کرنے کے لئے نئے منہ اور نئے دانتوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح احوال و ظروف کتنے ہی مختلف ہوں مگر ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہی پرانی صلاحیتیں درکار ہوں گی جنھوں نے کفر و شرک کی فولادی قوتوں سے اپنا لوہا منوایا تھا۔ عزم و ہمت، جرأت و پامردی، صبر و استقلال اور سرگرمی و جفاکوشی۔ یہی ازلی و ابدی صفات فوز و فلاح کا سرچشمہ ہیں اور جب

ملت مسلمہ کے معاملہ میں ان کا ذکر آتا ہے تو ان کے مجموعے کا نام ہوتا ہے اسلام!۔
وہ اسلام جو ایک خدا کا خوف دیکر ہر دوسرے خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔
اسلام سے وفاداری کا رشتہ استوار کر لو پھر دیکھو کامرانی و فلاح کے اسباب و وسائل کس طرح پردہ غیب سے ظہور میں آتے ہیں۔ خدا کے قادر و مطلق ہونے پر سچا عقیدہ رکھنے والوں کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ اگر خدا کسی قوم سے خوش ہو تو اسکے ادنیٰ سے اشارے پر وہ تمام اسباب و ذرائع پیدا ہوتے چلے جائیں گے جو قوموں کی سربلندی کا راستہ ہموار کرتے ہیں اور جن کا تصور بھی ظلوم و جہول انسان پہلے سے نہیں کر سکتا۔

شمس نوید کی دہرائی ہوئی کہانیاں ہمیں یہی تو سبق دیتی ہیں کہ اسلاف جیسی عزت و عظمت چاہتے ہو تو ان کی طرح خدا کو خوش کرنا سیکھو۔ انھوں نے خدا کی خوشنودی کو ہر شے پر مقدم رکھا۔ نتیجے میں دنیاوی عزت و کامرانی ان کے پیر چومنے لگی۔ تم بھی خدا کی نافرمانی سے توبہ کر کے وفاداری کی راہ پر آؤ۔ پھر دیکھو فلاح و عزت کے اسباب کس طرح ظہور میں آتے ہیں اور مصائب و آلام کے بادل کس طرح چھٹتے چلے جاتے ہیں۔

یہ سبق دنیا کا سب سے نفع بخش سبق ہے اور شمس نوید جس دلنشیں انداز میں اسے پیش کر رہے ہیں وہ ضرور بہت سے قلوب و اذہان پر اثر کرے گا اور کر رہا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اکیلے کوئی بڑا انقلاب لا سکیں۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ بہت سے لوگ ان کی تحریروں کے آئینہ میں اپنے چہروں کے داغ دیکھ کر چونک جائیں اور پھر ان داغوں کو دور کرنے کی سعی بلیغ کریں۔ ایک شخص پوری دنیا کی اصلاح نہیں کر سکتا لیکن وہ اگر دو چار دس بیس گمراہوں کو بھی راہ راست پر لے آئے تو یہ یقیناً ایک قابل رشک کارنامہ ہوگا۔

—————— عامر عثمانی

کیا ہم مُسلمان ہیں؟

نعمت — ایک لمحۂ فکریہ

ریگزار کی سرد خموش رات میں دنیا کا سب سے بڑا انسان سیدالانس وجن اپنے چند ساتھیوں سمیت ایک انصاری کے باغ میں داخل ہوا۔

اس کی فرمائش پر باغبان نے کچھ تازہ کھجوریں پیش کیں۔ یہ فرمائش اس بات کا اعلان تھی کہ صبر و فقر کی راہ پر چلتے ہوئے جائز لذتوں اور مباح نعمتوں کی طلب جرم نہیں ہے۔ کھجوریں نہایت لذیذ اور شیریں تھیں انھیں کھا کر سرد پانی پیا گیا تو قلب و روح کیفِ آسودگی سے معمور ہو گئے اسی عالم میں سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے روئے مبارک پر گہری سنجیدگی کے آثار ظاہر ہوئے اور اس سنجیدگی میں تشویش، احتیاط اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ نعمتوں سے حظ اندوز ہونے کا یہی لمحہ ایک عظیم لمحۂ فکریہ ثابت ہوا —— لذت کا تاثر کام و دہن ہی پر ختم ہو جائے تو سیدالانبیاءؐ اور ایک عام آدمی میں کیا فرق رہا۔ یہاں تو کوئی بھی تاثر روح کی گہرائیوں سے اُرے رکنے والا نہ تھا "زندگی" بھوک اور اس کی آسودگی سے ایک قدم آگے بڑھنے کے لئے بیتاب تھی —— لیکن وہ قدم کیا ہے؟ —— وہ سمت سفر کونسی ہے جسے کسی بھی عالم میں بدلا نہیں جا سکتا؟

صحابہؓ یہی سوچ رہے تھے اور ان کی نگاہیں اپنے محبوب آقا کی طرف اٹھی ہوئی تھیں "جس دن قیامت آئے گی" حضورؐ نے ٹھنڈے پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے ایسی آواز میں فرمایا جو پتھروں کے سینے سے پانی نکالنے کی طاقت رکھتی تھی "جس دن قیامت کا زلزلہ محسوس کیا جائے گا تم لوگ اس نعمت کے لئے خدا کے آگے جواب دہ ہوگے!"۔

اللہ اکبر! ——— یہ کسی شاعر، کسی فلسفی، کسی نجومی کے الفاظ نہیں تھے۔ یہ اس دانائے راز کے الفاظ تھے جس کے نطق سے وحی کے مقدس پھول جھڑا کرتے تھے۔ وہ وحی جو کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔

حضرت عمرؓ پر زبردست اضطراب طاری ہوا۔ کھجور کے بقیہ خوشے ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ رہے ——— "لذت" کے آغاز سے انسان اپنے "انجام" کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا اس نعمت کے لئے بھی ——— اے خدا کے رسولؐ؟"

"ہاں اس کے لئے بھی!" پیغمبرؐ کے لہجے میں حقیقت کی صدائے بازگشت کا جلال گونج اٹھا "ہاں ——— بس تین چیزیں دست احتساب سے بچ سکیں گی۔ ستر ڈھانکنے کے لئے کپڑا، بھوک فرو کرنے کے لئے زندہ رہنے کی حد تک غذا اور سر چھپانے کے لئے ایک گوشۂ زمین"۔

یہ بظاہر ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ معمولی ہے! ——— آہ! زندگی کی بنیادی ضرورتوں اور فاضل خواہشات کے درمیان یہ لطیف خطِ امتیاز کیا معمولی ہو سکتا ہے! ——— یہ قدر نعمت کا حقیقی احساس۔ یہ بے نظیر تقویٰ۔ یہ خدا کو ہمہ وقت روبرو پانے کی منزل احسان! اسی کا نام تو بندگی ہے، عبادت ہے، خدا پرستی ہے۔

یہی لطیف خط امتیاز ہے جس کی سمت چل کر صدہا پتھر ہیرے بن گئے اور یہی خط جب سے مٹا ہے دنیا والے ــــــ بلکہ یوں کہئے خود مسلمان بھی خدا کی نعمتوں کو بے شعور جانوروں کی طرح روندر ہے ہیں۔ سب کچھ مل جانے پر بھی جب کوئی کانٹا چبھتا ہے، کوئی نعمت چھنتی ہے تو اپنی شرمناک ناشکریوں پر شرم سے پانی پانی ہونے کے عوض وہ شکوہ شکایت کا دفتر لے بیٹھتے ہیں ــــــ اس خدا کا شکوہ جو فیّاضی میں سمندر سے زیادہ وسیع الظرف اور داد وعطا میں سورج کی روشنی سے زیادہ بیکراں ہے۔ جس کی بخشی ہوئی ہر نعمت سونے کے پہاڑوں میں تل کر بھی بھاری رہتی ہے۔ لیکن ناشکرا انسان نہیں دیکھتا۔ نہیں سوچتا۔

ہے کوئی جو آج بھی اس احساس سے لرز اٹھے کہ خدا کی بے بہا نعمتوں کے انبار سے وہ ہر سانس ہر آن جو استفادہ کر رہا ہے اسکے لئے خدا کے روبرو اسے جواب دہی بھی کرنی ہے؟۔

زر، زن، زمین ــــــ یا آخرت؟

مدائن کے خوبصورت علاقے میں معززین شہر اپنے نئے حاکم کا خیر مقدم کرنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ احترام وعقیدت کے پرشوق عالم میں انھیں حضرت حذیفہ رض کا انتظار تھا جو امیرالمومنین حضرت عمر رض کی طرف سے گورنری کا پروانہ لئے اس آبادی میں داخل ہونے والے تھے۔

اقتدار اور مقبولیت عام کی طاقت سے مسلح حذیفہ اس آبادی سے کیا کچھ وصول نہ کر سکتے تھے۔ شاندار استقبال، عیش وعشرت کے سامان ــــــ زر وجواہر وہ سب کچھ آج کے عُمّال شب و روز حاصل کر رہے ہیں

لیکن انھوں نے ان مطیع و فرمانبردار انسانوں سے جو چیز مانگی وہ ان سب سے مختلف تھی۔ حضرت عمرؓ کا فرمان سنانے کے بعد جب وہ مجمع کی طرف دیکھ رہے تھے تو کتنی ہی زبانوں پر یہ الفاظ تھے "آپ کو جس چیز کی خواہش ہو حاضر کی جائے؟"۔

حذیفہ نے برملا جواب دیا۔

"صرف اتنی روٹی جس سے پیٹ بھر سکے اور اتنا چارہ جس سے میری سواری کا جانور زندہ رہ سکے اور بس"۔

یہ تھا وہ خراج جو ایک گورنر نے رعایا سے طلب کیا ——— ذرا دیکھو اقتدار و سطوت کا غرور کس طرح درویشی کے قدموں پر دم توڑ رہا ہے۔ کس طرح شاہی طمطراق صبر و قناعت کی پہنائیوں میں گم ہے۔ کس طرح دولت و شوکت کی چمک دمک خوف آخرت کے نور میں محو ہو کر رہ گئی ہے ——— ایک انسان زر، زمین، اقتدار، زندگی اور خواہشات ——— ہر شے سے دور بہت آگے۔ اس آخری عدالت کے تصور میں ڈوبا ہوا ہے جہاں بے لگم دکاست محاسبہ ہوگا۔ جہاں ہر نعمت و لذت کے بارے میں دلیل جواز کی سخت ذمہ داری ادا کرنی ہوگی اور جو ادا نہ کر سکا اس کی بدنصیبی کا کیا ٹھکانا۔

یہی وہ تصور تھا جس نے حذیفہ کے جسم و روح کی عفت کو لذت پرستی کی کثافت سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ وہ اقتدار و حکومت کے ہمہ گیر مسائل کے درمیان بھی اسی طرح درویش کے درویش رہے جس کا سارا اثاثہ چند سادے کپڑوں اور روٹی کے چند ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا ان سے جتنی قریب تھی وہ اس سے اتنا ہی دور تھے۔ سونے اور چاندی کے سانچوں میں ڈھلا ہوا کشش انگیز ماحول ان کی آنکھوں کو نہ چندھیا سکا۔

پھر جب مدائن کی مسند اقتدار سے اٹھ کر وہ مدینے واپس آئے تو ان کی آمد کی خبر سن کر امیر المومنین حضرت عمرؓ راستے میں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ ——— مسلم قلمرو کا حاکم اعلیٰ یہ جائزہ لینے کے لئے بیتاب تھا کہ اس کا فرستادہ جاہ وجلال اور عیش وعشرت کی امتحان گاہ سے کس حال میں واپس آیا ہے۔ اپنے دیکھا حذیفہ جو کچھ لے گئے تھے اس سے زیادہ کچھ ساتھ نہیں لائے۔ وہی درویشانہ سادگی وہی عجز وانکسار، وہی شان زہد وورع ——— محبت اور قدردانی کے جذبے نے حضرت عمرؓ کو پگھلا دیا۔ وہ آگے بڑھے اور حذیفہؓ کو بے اختیار سینے سے لگا کر بولے۔

"حذیفہؓ! تم میرے بھائی ہو ——— اور میں تمہارا بھائی ہوں"۔

کتنے سادہ اور مختصر الفاظ ——— لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب الفاظ کے جسد سے معانی کی روح نہیں نکلی تھی۔ جب ہر لفظ اپنے حقیقی مفہوم میں بولا جاتا تھا ——— اس وقت ایک عمرؓ جیسے مرد حق کا کسی کو خصوصیت کے ساتھ "بھائی" کہہ دینا ایسی وسعتوں اور گہرائیوں کا حامل تھا کہ آج ہمارے عہد ومیثاق اور مدح وثنا کے کئی دفتر بھی اس کی برابری نہیں کر سکتے۔

آخرت کا غم کھانے والے

عشاء کی نماز پڑھ کر حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ حسب معمول اپنی صاحبزادیوں کی خیر وعافیت معلوم کرنے تشریف لیجا رہے تھے۔ سرکاری مصروفیات سے تھکا ہوا دماغ ایک شفیق باپ کی تڑپ لئے ہوئے اب اولاد کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ لیکن دیکھو تو ان کے جن ہاتھوں نے ابھی ابھی حکومت کے خزانے سے بیشمار ضرورت مندوں کے لئے درہم ودینار بانٹے ہیں۔ وہ خود اپنی

محبوب صاحبزادیوں کی طرف جاتے ہوئے کس طرح خالی ہیں۔ ٹھیک اس درویش کی طرح جو دن بھر کے بعد تھکا ہارا خالی ہاتھ گھر آ رہا ہو۔ فاقہ تو نہیں لیکن گھر پر نیم فاقہ ضرور تھا۔ باپ کی آہٹ پاکر بیٹیاں خیر مقدم کے لئے دروازے تک آئیں۔ ان کے چہروں کی زردی تو باپ کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی لیکن یہ ضرور نیا تھا کہ انھوں نے اپنے منھ پر ہاتھ رکھ رکھے تھے۔

"کیا بات ہے؟" حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے پوچھا۔ لڑکیاں کچھ نہ بولیں۔ انّا نے جواب دیا۔

"آج ان بچیوں نے صرف پیاز اور مسور کی دال سے پیٹ بھرا ہے گھر میں کھانے کو کچھ اور نہیں تھا۔ پیاز کی بو چھپانے کے لئے یہ منھ پہ ہاتھ رکھ رہی ہیں" باپ آخر باپ تھا۔ معصوم بچیوں کا ایثارِ نفس اسے تڑپائے بغیر نہ رہا۔ آنکھیں نم ہوگئیں دل بھر آیا ——— مگر جذبات کی یہ موجیں تو بس موجیں ہی تھیں۔ صبر و قناعت، فقر و ایثار، زہد و تقویٰ اور ایمان و یقین کے جبل الذہب کو ذرا بھی جنبش نہ دے سکیں۔

"اے میری بیٹیو!" انھوں نے کہا "یہ کچھ مشکل نہیں کہ تمہارے دسترخوانوں کو انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں سے بھر دیا جائے۔ مگر ——— کیا تم پسند کرو گی کہ اس کے بدلے تمہارا باپ دوزخ کی آگ میں ڈال دیا جائے۔"

باپ کے یہ دلدوز فقرے صاحبزادیوں کے ضبط کا بند توڑ گئے۔ آنکھیں اشکوں سے تر ہوگئیں ——— یہ گریۂ غم نہیں تھا۔ اس میں شکایت کی تلخی بھی نہیں تھی ——— یہ تو خاموش جواب تھا باپ کے سوال کا ——— "نہیں" ہر آنسو پکار رہا تھا "ہمیں وہ راحتیں درکار نہیں

جن کے عوض ہمارا باپ دوزخ میں ڈالدیا جائے"۔

خوفِ خدا ـــــ غمِ انساں

انہی عمر بن عبدالعزیز رح کے ننھیا سُسر حضرت عمر ابن الخطاب رض کے دورِ خلافت میں جب ایک بار قحط پڑا تو ملک کے طول و عرض میں سب سے زیادہ بھوکا اور پریشان حال انسان خلیفۂ وقت کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا، آپ نے اپنی خوراک گھٹاتے گھٹاتے فاقہ کشی کی حد تک پہنچا دی تھی۔ شہد۔ گوشت اور ہر طرح کی لذیذ چیزیں اپنے لئے عملاً حرام کرلی تھیں۔ گھی کا استعمال یک قلم ترک کر دیا تھا اور نیم فاقہ کشی اور ذہنی اضطراب کے عالم میں جب آپ ضرورت مندوں کے سامانِ خورد و نوش کا بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھائے آبادی کے طول و عرض میں اُفتاں و خیزاں دوڑتے نظر آتے تھے تو لوگ یہ دیکھ کر غم سے کراہنے لگتے تھے کہ عمر رض کا سرخ و شاداب رنگ جل کر سیاہ ہوگیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب حضرت عمر رض فاقہ کشوں کے شریکِ حال رہنے کے لئے تمام غذاؤں سے دست کش ہو کر صرف زیتون کے روغن پر گذارہ کر رہے تھے۔ وہ اللہ کا پاکباز بندہ شاید بھوک سے جان ہی دیدیتا اگر دو باتیں مانع نہ ہوتیں ایک تو جان بوجھ کر جان دینے کی شرعی ممانعت دوسرے یہ خیال کہ اگر نظم و نسق سنبھالنے والا کوئی نہ رہا تو قحط کا دامن اور بھی دسیع ہو جائے گا۔ بھوک پیاس سے کہیں زیادہ جو چیز حضرت عمر رض کو ماہیِ بے آب بنائے ہوئے تھی وہ یہ لرزہ خیز تصور تھا کہ انھی کی خلافت کے زیر سایہ جو قحط انسانوں کو پیسے ڈال رہا ہے اسے دور کرنے میں خود ان کی مساعی کسی بھی درجے سے کم رہ گئیں۔ یا اپنی بھاری ذمہ داری کو وہ کما حقہٗ نہ نبھا سکے تو مالک یوم الدین کو کیا جواب دیں گے

یہی وہ تصور تھا جو فقر و فاقہ سے کہیں زیادہ ان کو گھلائے دے رہا تھا اور اسی لئے ریگستان کی جھلسا دینے والی دھوپ میں تپتی ہوئی زمین پر برہنہ پا غذا اور اناج کا بوجھ کمر پر اٹھائے وہ خود فراموشی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہے تھے۔ یہی وہ کرب تھا جس سے ان کی روح تڑپ رہی تھی اور انکی جسمانی صحت کا توازن تہہ و بالا ہو کر رہ گیا تھا۔

آہ! اسی اضطراب و وارفتگی کے عالم میں ایک بار انھوں نے اپنے معصوم صاحبزادے کو تربوز کی قاش لئے دیکھا اور جوش غضب سے کانپ اٹھے۔ وہ بھول گئے کہ یہ ان کا معصوم جگر پارہ ہے جو اس کمسنی ہی میں ان کے ساتھ ساتھ نیم فاقہ کشی کے تجربات سے گزر رہا ہے ——— اس وقت انھیں صرف ایک بات یاد تھی ——— صرف ایک بات ——— یہ کہ عامۃ المسلمین قحط کی آنچ میں تپ رہے ہیں اس لئے خلیفہ کے بچے کو کوئی حق نہیں کہ تربوز کی قاش سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ وہ دیوانہ وار بچے کی طرف بڑھے اور بیدردی کے ساتھ قاش کو اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے چیخے

"تم ..... تم پھل کھاتے ہو! اور رسولؐ خدا کی امت بھوکی مر رہی ہے"۔

العظمۃ للہ، سبحانہ تعالیٰ۔ تم نے دیکھا یہ کیسے لوگ تھے۔ ان کے سینوں میں کیسا دل تھا۔ ان کے ذہن کس طرح سوچتے تھے۔ اللہ کے آخری رسول نے کہا تھا "قسم ہے خدائے لایزال کی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھے اپنی اولاد، اپنے مال و متاع اور اپنی جان سے بھی زیادہ محبت نہ کرے"۔

غور سے دیکھو یہ واقعہ کیا اسی متن کی شرح نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کو اگر کچھ یاد تھا تو یہ کہ قحط کی ماری ہوئی امت رسول خدا کی امت ہے ——— وہ رسول خدا جس کی خاطر سب کچھ تج دینے کا ثبوت وہ پہلے بھی بارہا دے چکے تھے

یہی وہ روحیں تھیں جنھیں دنیا کسی بھی قیمت پر نہ خرید سکی جن کو کوئی بڑی سے بڑ نعمت اور حسین سے حسین آرزو اس یوم جزا کی یاد سے غافل نہ کر سکی جس میں ناشکری اور غرور سے بھری ہوئی کھوپڑیوں پر پہلی بار حقیقی اور مکمل انصاف کی آخری ضرب لگے گی - جہاں وہ نعمتیں زہراب بنکر رہ جائینگی جو زمین پر خدا کو یاد دلانے کے لئے پیدا کی گئی تھیں، لیکن آدمی نے انھی کی آڑ میں خدا کو بھلا دیا - اور یہ آدمی آج بھی اصرار کرتا ہے کہ میں مسلمان ہوں!-

کاش وہ خود انصاف کر سکے، سوچ سکے "کہ کیا ہم مسلمان ہیں؟"-

شہادتِ حق کی صدائے بازگشت

احد کی پہاڑیوں سے کتنی معصومانہ آواز آرہی ہے!

"اے سعد! کہاں جاتے ہو تم؟ ——— مجھے دامن احد سے باغ ارم کی خوشبو آرہی ہے!" ——— یہ انسؓ کی وہ پر شوق آواز تھی جس میں ایمان و یقین سے سرشار روح اپنی منزل ازل کو چھو لینے کے لئے تڑپ رہی تھی! ——— روح کے اس والہانہ شوق کے عالم میں وہ بھول گئے تھے کہ اس وقت وہ کس ہولناک معرکۂ کارزار میں محصور ہیں ——— ایک میدان حشر جہاں کفر و شرک کی بے رحم و سفاک بلائیں بھوکے بھیڑیوں کی طرح مجاہدین احد کی پشت پر سے ٹوٹ پڑی تھیں ——— جہاں چاروں طرف خوف و دہشت کا راج تھا ——— خون کی طغیانی موجزن تھی ——— مار دھاڑ کا فلک شگاف ہنگامہ برپا تھا جہاں مجاہدین احد کے صرف ایک دستے کی ذرا سی بھول سے اسلام کی فتح و کامرانی ——— کامرانی ایک دھماکے کے ساتھ زیر بار ہو چکی

جہاں خوف دہراس کے سرکش سیلاب میں پہاڑ تنکوں کی طرح بہتے جارہے تھے اور جہاد کی زلزلہ افگن دھمک آسمان ظفر سے ڈگمگا کر خطرات کے سیاہ پاتال میں ڈوب چکی تھی ——— جہاں خدا کے آخری رسولؐ کی شہادت کی افواہ نے ایمان ویقین کے کوہ افگن قدموں کو متزلزل کر دیا تھا اور خوف و مایوسی کے گرجتے بادل زندگی کے ہر افق سے کڑکتے برستے ابھرتے چلے آرہے تھے ——— جہاں ناگہانی حملہ کے موج در موج اندھیاروں میں تلواریں اندھی ہو کر دوست ودشمن کے سر قلم کر رہی تھیں ——— جہاں خدا کا محبوب ترین بندہؐ دشمن کے تیر وسناں کی دھواں دھار بوچھار میں خوں آلود چہرے کو اپنے ملکوتی جمال اور ما فوق الفطرت سکون قلب سے منور کیے ہوئے اسلام کی تاریخ کا وہ دردناک موڑ دیکھ رہا تھا جہاں حق و باطل موت اور زندگی کی کشمکش میں مشغول تھے۔

موت اور تباہی کے اس ہاہا کار اور دہشت دہراس کے اس فلک شگاف ہنگامہ پر ابھرتی ہوئی یہ آواز تیز سے تیز تر ہوئی۔ بلند ہوتی گئی اور ریگستانی میدان کے خونیں ذروں سے اونچی اٹھتی ہوئی احد کی کوہستانی چوٹیوں کو چھونے لگی۔ انسؓ اس پر خطر گھاٹی میں موت اور ہلاکت کے گھٹا ٹوپ اندھیاروں کا سینہ چیرتے ہوئے احد کے اسی پہاڑی مورچہ کی طرف تیز گام تھے۔ جہاں خدا کے رسولؐ نے محافظ دستے کے مجاہدین کو ہر حال میں سینہ سپر اور اٹل رہنے کی تاکید پر تاکید فرمائی تھی ——— اور جہاں سے اس دستے نے اسلامی فتح کا نظر فریب منظر دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ اس حکم کی اطاعت کا وقت پورا ہو چکا ہے ——— اور وقت آگیا ہے کہ جہاد کے معرکے سر کرنے کے بعد ارضی انعامات اور غنیمت کے اموال سے بہرہ اندوز ہوا جائے

لیکن وہ بھول گئے تھے کہ اطاعت اور تسلیم و رضا کا سب سے نازک وقت وہی ہے جب متاع دنیا کی چمک دمک عاقبت کی سرفروش جاں نثاریوں کو للچا رہی ہو۔ جہاں آنکھیں دل کو دھوکا دے رہی ہوں۔ اور جہاں عین الیقین اور ایمان بالغیب کے جذبات میں تصادم ہو رہا ہو!

چند انسانوں کی بھول ——— ایک معصوم بھول پوری ملت کی تاریخ پر تباہی کا دھماکہ بن کر پھٹ پڑی ——— چند قدموں کی لرزش سے زمین و آسمان تھر تھرا گئے۔ انسانیت کے مستقبل کی بنیادیں لرز اٹھیں ——— لیکن ابھی آزمائش کی سیاہ پوش گھٹاؤں میں کچھ بجلیاں کوند رہی تھیں ——— خوں آشام اندھیاروں کے جھکڑوں سے کچھ جگنو ٹکرا رہے تھے۔ ایک انسان جو بھول اور غلطی کی آندھیوں کی زد میں حقیقت کا چراغ جلائے موت و ہلاکت کی اسی پُر خطر گھاٹی کی طرف بیتابانہ بڑھ رہا تھا جہاں سے تباہی کے عفریتی لشکر اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

امتحان عظیم کی نزاکتوں کو نقطۂ عروج پر لانے کے لئے مشیت نے اشارہ کیا! غنیم کے آہن پوش لشکر حرکت میں آئے اور ایک انسان پر سیکڑوں تلواریں کوندنے لگیں ——— مگر وہ انسان بڑھتا جا رہا تھا۔ غیظ و غضب اور ظلم و استبداد کی قہرمانی طاقتیں غرائیں اور چنگھاڑتی ہوئی حملہ آور ہوئیں ——— مگر مجاہد کا رُخ نہ بدل سکیں ——— تیروں کی بوچھار ہوئی ——— پتھر اوپر پتھراؤ ہوئے ——— لیکن بڑھنے والا خود اپنے زخموں کے خون میں نہاتا ہوا باغ ارم کی خوشبو کی طرف بیتابانہ بڑھتا ہی رہا ——— آگ اور خون کے طوفان میں ایک سفینہ تھپیڑے کھا رہا تھا مگر موجوں کا سینہ چیرتا چلا جا رہا تھا ——— آخر ——— امتحان کی اس حشر انگیز کہانی کو ختم کرنے کے لئے موت کا فرشتہ

مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور زخموں سے پارہ پارہ جسم کو اپنی نورانی آغوش میں لئے ہوئے باغ ارم کی ابدی منزل کی طرف لے اڑا ——— انسان مر گیا تھا مگر دم توڑتی ہوئی انسانیت ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گئی تھی۔

احد کی گھاٹیوں سے آج پھر یہی آواز آ رہی ہے ——— "اے سعد کہاں جاتے ہو؟ دامن احد سے مجھے تو باغ ارم کی خوشبو آ رہی ہے ———"
آج پھر ملت اسلامیہ طاغوت کے جارحانہ حملوں کو شبخون مارنے کی راہ دے رہی ہے ——— آج پھر مجاہدین کا دستہ اپنے اسی مورچے سے ہٹ کر متاع دنیا کی نظر فریبیوں میں کود پڑا ہے جہاں خدا اور اس کے رسول نے اسکو آخری دم تک سینہ سپر رہنے کا اٹل حکم دیا تھا ——— آج پھر گھمسان کا گھر بپا ہے جہاں تلواریں اندھی ہو گئیں اور خود غرضیوں کی تاریکی میں دوست دشمن کا امتیاز گم ہو چکا ہے ——— آج بھی خدا کے آخری رسول کی طرح خدا کا آخری پیغام باطل کے وحشیانہ حملوں کی زد میں سکون واستقامت کے مینارۂ نور کی طرح ایستادہ ہے مگر اس کا چہرہ خوں آلود ہے اور اس کے ماننے والے انتشار کے طوفانی جھکڑوں میں اڑے پھر رہے ہیں۔

زمانہ انسؓ کو آواز دے رہا ہے ——— اور احد کی وادیوں میں گونجتی ہوئی انسؓ کی خاموش للکار زمانہ کو آواز دے رہی ہے۔

نئے اور پرانے طائف

پھولوں سے زیادہ معصوم فطرت، مگر شیطنت کے گھناؤنے ماحول کے ڈھالے ہوئے شریر انسانی بچوں کی بھیڑ شور مچاتی ——— تالیاں بجاتی ہوئی۔ ایمان باختہ نوجوانوں کے نرمست غول انسانیت سوز قہقہے لگاتے ہوئے ———

بوڑھے چہرے ــــــــ لاشوں کی طرح بے روح اور گناہ کی طرح تاریک دبے ضمیر۔ بوڑھوں کے چہرے ایک کربیہہ تمسخر کی جھریوں میں سمٹے پھیلتے ہوئے!۔

اور ــــــــ

اس انسانی جنگل کے طول و عرض میں جنگلی شور کے طوفانی ریلوں کے ساتھ اینٹوں کی اندھا دھند بوچھار! ــــــــ یہ جمانہ پتھراؤ ہاؤ ہو کا حیوانی خروش! ــــــــ یہ طائف کی سرزمین پر کس ہستی کا مجنونانہ خیر مقدم کیا جا رہا تھا؟ ــــــــ آہ کون جانے ــــــــ کیا آج طائف کے زرخیز نخلستانوں اور شیموں محلات کی آبادی میں کوئی تباہ کن ڈاکو گھس آیا تھا جس کو فاتحانہ انتقام کے نرغہ میں لیکر اہالیانِ شہر، شہری اتحاد۔ سماجی شعور اور انسانی جرأت و فرزانگی کی داد دے رہے تھے؟ ــــــــ یا اس وادی کے سیم و زر اور تاج و تخت پر حملہ آور کوئی سرکردہ غنیم گرفتار کیا جا رہا تھا؟ ــــــــ یا اس دیار کے جنگجو سورماؤں نے کسی ایسے "مخدوش کردار" کو دھر لیا تھا جسکے وجود سے زعمائے شہر کے حرم سخت خطرے میں تھے۔

آہ نہیں! ــــــــ ہرگز نہیں!

سنگ و خشت کے ظالمانہ نشانہ پر کوئی رہزن نہیں، بلکہ دیانت کیشی اور امانت داری کا ملکی ہیرو اور بین الاقوامی نشان تھا جس کے پرنور چہرے سے ٹپکتا ہوا معصوم جلال اور پشت پر اس کی طویل زندگی کا تابناک بیداغ افسانہ اس کے بدترین دشمنوں کے پتھریلے دلوں اور مردہ ضمیروں تک سے عقیدت و اعتماد کا شاہانہ خراج لے رہا تھا اور جس کو اس کے جانی دشمن انتہائی غیض و غضب کے عالم میں بھی کوئی اخلاقی گالی دینے کا تصور تک نہ کر سکتے تھے۔ وہ دوستوں

اور دشمنوں دونوں کا "امین صادق" تھا! ـــــــ ہاں اس بے رحمانہ، آخری حد تک بے رحمانہ پتھراؤ کی زد پر اس "انسان کامل" کے سوا کوئی نہ تھا جس کے پر نور قدموں میں کجکلاہ وحشی سرداروں کا عظیم قریشی وقار سر جھکا کر یہ بھیک مانگ چکا تھا کہ وہ "ایک نئے خدا" کا نعرہ بند کر دے تو وہ اس قابل ہے کہ عرب کا تاج و تخت اس کے حوالے کر دیا جائے ـــــــ مگر وہ انسان کامل جو اپنے خدا کی راہ میں بھوک اور پیاس سے محبت کرتا تھا شہنشاہیت کی نذر بھی اس کو نہ خرید سکی اور اپنے متاعِ دنیا اور اس کے مایا جال پر نفرت و غنا سے نظر ڈالی اور منہ پھیر لیا ـــــــ ہاں یہ وہی عفت مآب ہستی تھی جس کے اخلاقی انقلاب کے مقدس پیغام کو خریدنے کے لئے ریگستان عرب کی حسین ترین دوشیزگی کی بولی لگائی گئی تو شیطنت نے یہ دیکھ کر اپنا منہ پیٹ لیا کہ اس عجیب انسان کی رگ و پے میں جذبات کی نفسیاتی سنسنی کی جگہ انسانیت اور اس کے وقار کا غیور خون ـــــــ مقدس خون کھول اٹھا ـــــــ انسانیت کی المناک گراوٹ کے منظر نے اس کو آبدیدہ کر دیا اور غیرت انسانیت کے ایک حسین ترین جوش کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلنے لگے "جس چیز کو چاند اور سورج کی نذر بھی نہ خرید سکے یہ دنیا اس چیز کو متاعِ دنیا سے خریدنے کا خواب دیکھ رہی ہے ـــــــ آہ یہ لوگ مجھے نہیں پہچانتے!"۔

زمین و آسمان کا ہر ذرہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ خدا کے رسولؐ کی آواز ہے ـــــــ وہ آخری رسولؐ جس پر اس کے خدا کی زمین تنگ کرتے ہوئے طائف کی سرپھری انسانیت خود اپنی موت کا خوں چکاں جشن منا رہی تھی۔ انسان کی وہ آنکھ جس نے صدیوں سے گناہ کی تاریک و سیاہ رات کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا

خیرگی سے اندھی ہو کر حقیقت کی "صبحِ درخشاں" پر پتھراؤ کر رہی تھی - اینٹیں برسا رہی تھی !

"انسانو" اس نے درد بھری آواز میں طائف کی آدم خور بستی کو پکارا "سن لو کہ خدا کے آخری پیغام کے سوا میرا کوئی پیغام نہیں ہے ——— یہ تمہارے اس خدا کا پیغام ہے کہ زمین و آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں بھی کوئی اس کی گرفت سے بچ کر نہیں جا سکتا اس سے پہلے کہ موت انسان کی گناہ آلود لاش کو محفوظ عشرت گاہوں سے گھسیٹ کر شہنشاہ کائنات کے حضور میں لیجا پٹکے کیوں نہ انسان تشکر نعمت کی والہانہ تڑپ کے ساتھ خود ہی اپنے خالق کی طرف دوڑ پڑے" -

حقیقت کی کیسی دلنشیں آواز تھی یہ ——— کیسی دلدوز پکار ! - مگر عشرت کدوں کی گناہ آلود سرمستیوں میں انگڑائیاں لینے والے انسانی درندوں نے پاگلوں کی طرح قہقہہ لگایا، لیکن وہ ابھی اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے "تم ا- تم ہو خدا کے رسول ؟ ! ——— (ہاہاہا) کیا خدا کو اس کام کے لئے تمہارے سوا کوئی اور نہ ملا ؟ ——— (کچھ دیر رک کر ——— سنجیدگی کے ساتھ) ہم تو صاف دیکھتے ہیں کہ تم محض ہم جیسے ایک انسان ہی ہو !، ایک انسان جو روٹی کھاتا اور پانی پیتا ہے ! ——— اور بازاروں میں خرید و فروخت کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے !" -

یہی تھے وہ انسان جن کی نظر میں خدا کے رسولؐ کا (خدانخواستہ) واحد "جرم" یہ تھا کہ وہ ایک "انسان" کیوں ہے ؟ - آہ ——— انسان اور انسانیت و بشریت سے اس قدر بیزار ! ——— مایوس اور اس درجہ مایوس ! کیا طائف کے اس المیہ سے بڑا کوئی اور المیہ ممکن ہے ؟ ——— کاش ہم اس کا جواب

نفی میں دے سکتے ـــــ کاش ہم مسلمان "مسلمان" ہوتے !۔ آہ جغرافیہ پر بکھرے ہوئے یہ بیشمار جدید طائف !۔ جہاں ایک بار پھر خدا کے رسول ؐ کو رسول جاننے والے یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ رسالت تسلیم کرنے کے لئے محمدؐ کی بشریت کا انکار کرو ـــــ جہاں ایمان و عمل کی چلتی پھرتی لاشیں اپنے خون کردار سے ڈھلی ہوئی اینٹیں اور پتھر کے دل اٹھائے ہوئے اس اسلام کی حقیقی بنیادوں کو سنگسار کر دینا چاہتی ہیں جس کی تہ میں طائف میں ٹپکا ہوا لہو وہ مقدس لہو" جذب ہو کر اسلام کو سیراب کر چکا ہے۔

کفر زدہ طائف کے پتھراؤ میں مقدس خون سے رنگین قدموں کی قسم! دور حاضر کے نئے طائف اور ان کے ہولناک مناظر خدا کے رسولؐ "کا دل" خون کرنے کے لئے کافی ہیں۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا....

"وادی احد میں اسلام خطرے میں ہے!"۔

بوڑھوں، بچوں، بیماروں اور عورتوں نے مدینہ میں خطرہ کی گھنٹی گونجتی ہوئی سُنی اور انسانیت کا وہ معذور کمزور طبقہ جس کے کاندھوں کو خدا اور اسکے رسولؐ نے شمشیر و سناں کے خوں ریز معرکوں کے بار گراں سے آزاد رکھا تھا۔ پناہ گاہوں میں چھپنے کے بجائے پناہ گاہوں سے باہر نکل پڑا ..... پارہ کی طرح بیتاب ـــــ بجلی کی طرح تڑپتا ہوا ـــــ شہادت کے لئے ماہیٔ بے آب وہ کس خطرہ سے پناہ ڈھونڈھ کر زندہ رہنے کی تمنا کریں جب ان کی زندگی کا حاصل اور ان کی آرزوؤں کا روح رواں " اسلام" خطرے میں ہے: ـــــ اسلام خطرے میں ہو تو پھر کوئی خطرہ خطرہ نہیں ـــــ جب دین پر

آنچ آرہی ہو تو متاع دنیا ان کے کس کام کی!۔

خدا، رسولؐ اور اسلام کے قدموں پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لئے ضعیف انسانیت کا ہجوم بیرحم طاقتوں سے ٹکرانے کے لئے والہانہ شوق کے عالم میں رواں دواں تھا —— زندگی خود ہی موت کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی تھی —— بینا ہیں خود ہی خطرات کو للکارنے کے لئے قربانی و ایثار کے نشہ میں وجد کرتی چلی جا رہی تھیں —— اور لوگوں نے دیکھا کہ اس کارواں میں سب سے آگے ایک عورت تھی —— یہ ام عمارہ تھیں جو اس موت و ہلاکت کے دہانے پر جست کرنے کے لئے بجلی کی طرح کوندتی جا رہی تھیں۔ جہاں خدا کا آخری پیغمبر تیر و سناں کی بوچھار میں محصور تھا۔ جہاں سچ مچ اسلام خطرہ میں تھا!۔

—— آخری ایمان و یقین کا یہ نسوانی پیکر جس کے سارے وجود کو خدا اور اسکے رسولؐ کی محبت نے شعلۂ جوالہ میں تبدیل کر دیا تھا، آہن و فولاد کی دیواریں ڈھاتا ہوا —— بے ضمیر انسانیت کے آہنی جوش کفر کے پرخچے اڑاتا ہوا —— وار کرتا اور زخم پہ زخم کھاتا ہوا اس معرکہ کارزار تک جا پہنچا جہاں شیطنت حق کا آخری چراغ گل کرنے کے لئے آندھیوں کی طرح پھنکار رہی تھی اور درندوں کی طرح پوری وحشت و قوت سے دہاڑ رہی تھی —— مرد اور بیرحم مرد جس کے سینہ میں کفر و شرک کی قساوت نے گوشت کے دل کو پتھر کے ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا تھا، فوج در فوج، موج در موج ہو کر اس تنہا عورت کے وجود پر جھپٹ پڑا جو دیکھتے ہی دیکھتے طاغوتی فوج کو موت کے گھاٹ اتارے دے رہی تھی —— جس کی للکار سے احد کا میدان جنگ گونج رہا تھا اور جس کے رجز سے زمین و آسمان اور کائنات کی فضائیں مرتعش ہو کر رہ گئی تھیں —— جو حق و باطل کے تباہ کن معرکہ میں چٹان کی طرح سینہ سپر ہو کر زخم پر زخم کھا رہی تھی۔ مگر اپنے لہو میں نہا نہا کر جس کا عزم شہادت

تازہ دم ہو رہا تھا ـــــ جس کو رسولِ خدا نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا "شاباشں اے ام عمارہ! اسلام تم پر فخر کرتا ہے"!۔

"نہیں اے خدا کے رسولؐ!" عمارہ نے خون میں نہایا ہوا چہرہ رسولِ خدا کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "میں کچھ اور بھی چاہتی ہوں" ـــــ اور یہ کہتے ہوئے ان کی زندگی کی کوئی حسین ترین آرزو ان کے روح و دل کی گہرائیوں سے جسم کے ریشہ ریشہ سے بیتابی بن کر ابل پڑی ـــــ کیسی تڑپ تھی ان کی آواز میں کتنا درد ـــــ کس قدر سوز! اے خدا کے رسولؐ! دعا فرمایئے کہ میں موت کے بعد آپ کے قدموں میں اٹھائی جاؤں" ـــــ اور جب خدا کے رسولؐ نے دعا کو ہاتھ اٹھائے تو وہ اس طرح پرسکون و مطمئن ہوگئیں جیسے دولتِ جہاں مل گئی ہو ـــــ جیسے ان کی تھکی ہوئی پرشوق آنکھیں زبانِ حال سے کہہ رہی ہوں "سب کچھ خدا سے مانگ لیا تم کو مانگ کر۔ اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد!"۔

"اے خدا کے رسولؐ! اب مجھے کسی غم کا غم نہیں۔ کسی مصیبت کا خوف نہیں مجھے سب کچھ مل گیا!"۔ ام عمارہ بار بار وجد کے عالم میں یہ الفاظ دہرا رہی تھیں اور خدا کا رسولؐ عظیم ترین شفقت اور مشفقانہ رقت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا! کون ہے جو ام عمارہ کی اس "دعا" کے لئے متاعِ دنیا کی قیمت پیش کرے؟ ـــــ یہ متاعِ دنیا جس کے سونے چاندی کے سلاسل نے ہمارے پورے وجود کو جکڑ لیا ہے ـــــ جس کے چمکتے ہوئے سراب میں ہمارے ایمان و یقین پیاس سے دم توڑ رہے ہیں ـــــ آہ ہم مسلمان ہیں! کیا ہم "مسلمان" ہیں؟ ـــــ

جلالِ یقین

میدانِ احد پر سوگ اور ویرانی کی شام درد و کرب کے عالم میں خون

تھوک رہی تھی۔

آج اس میدان کے خون میں نہائے ہوئے میزبان ذرّوں نے قوموں کے عروج وزوال کی پوری تاریخ کو اپنے اوپر گذرتے ہوئے دیکھا تھا ——— کس طرح ایک انسانی امّت خدا اور اس کے رسولؐ کی چشم ابرو کے اشاروں پر حرکت کر کے اپنی آخری درجے کی بے سرو سامانیوں کے باوجود اپنے مقابلہ پر جنگی ساز و سامان سے لیس ایک خونخوار لشکر کو شکست و ہزیمت کے پاتال میں اوندھے منھ دھکیل سکتی ہے. مگر پھر کس طرح چند قدموں کی ایک ہلکی سی "معصومانہ" لغزش چشم زدن میں پوری قوم کے قدموں تلے سے زمین کھسکا سکتی ہے!۔ کس طرح فاقوں اور زخموں سے نڈھال مُشت بھر مٹی کے انسانی ڈھانچے جب ایمان و عمل کے سوز سے دہک اٹھتے ہیں تو بے پناہ شعلۂ جوالہ بن کر آہن و فولاد میں ڈوبے ہوئے عساکر کو جلا کر راکھ کر سکتے ہیں لیکن پھر کس طرح رسولِ خدا کے صرف ایک فرمان کے خلاف چلتے ہی خوفناک ہوشربا مایوسیوں کی بھول بھلیاں میں اس بری طرح گم ہو سکتے ہیں کہ خود اپنی پرچھائیوں کو نہ پہچان پائیں اور خود اپنے ہی ساتھیوں پر تلواروں کے اندھا دھند وار کرنے لگ جائیں!۔

اسی زمین اور دنیا کی تاریخ میں خدا کی پر اسرار مشیت نے یہ قوموں کے عروج وزوال کا ایک عظیم تجربہ کرایا تھا اور اب اس تجربہ کی تکمیل کے بعد ساری کائنات نڈھال پڑی ہوئی تھی۔ ہر سمت ہو کا عالم طاری تھا۔ ایک بھیانک سکوت کے بوجھ تلے جنگ کا خوں آلود میدان کراہ رہا تھا ——— کیسی ہولناک خاموشی! جیسے کسی مہیب طوفان کی آمد سے پہلے اچانک گرجتے ہوئے سمندر خاموش و گنگ ہو جاتے ہیں! ——— ہاں یہاں بھی ایک طوفان

اور آنیوالا تھا! ۔ خدا ابھی ایک دوسرا تجربہ کرنے والا تھا۔

اہل باطل کے مغرور فوجی جنھوں نے فتح کے ساز چھیڑ دئے تھے ــــــ شیطانی بھیڑیئے اور کرگس جن کی شکل انسانوں کی سی تھی مگر انسانیت پر جان دینے والوں کی جان لیکر بھی جن کا جوش انتقام سرد نہ ہوتا تھا ــــــ مجاہدین کی لاشوں پر وحشت و بربریت کا ہولناک رقص کر رہے تھے۔ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی لاشوں کا خون پی پی کر درندوں کی طرح ہانپ رہا تھا ــــــ خدا کے نام پر شہید ہو جانے والوں کی لاشوں کا مثلہ کیا جا رہا تھا ــــــ مردہ انسانوں کے کلیجے چبائے جا رہے تھے۔ عورتیں جنسی لگاوٹ کی مکمل حیا سوزیوں کی اداؤں میں فتح کے ترانے الاپتی ہوئیں وحشی مرد کی سفاکیوں کو خراجِ عقیدت پیش کر رہی تھیں۔ اور فتح کے ناپاک نشہ سے سرمست درندے کبر و غرور کے فلک شگاف نعروں سے فضاؤں کا سینہ چھلنی کئے دے رہے تھے۔ خدا کی زمین پر جھوٹے خداؤں کا نام بلند ہو رہا تھا ــــــ لیکن اس جشنِ دیوانگی سے دور ایک کوہستانی گوشہ میں فتح و شکست کا زخم کھائے ہوئے اللہ والے اپنے مقدس رسولؐ کے خوں چکاں زخموں کو اپنے منفعل آنسوؤں سے دھونے میں مصروف تھے۔ ان کے جسم ہی نہیں روحیں بھی زخم خوردہ تھیں۔ ان کے وجود کے ہر ہر رگ و ریشہ سے سُرخ سُرخ خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا۔ آج ان کی پوری زندگی اشک و خون میں نہائی ہوئی کھڑی تھی۔ یہ تصور کس قدر جانکاہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک لغزش کے نتیجے میں خدا کے محبوب رسولؐ کے قلب و جسم کو گزند پہنچ گیا تھا۔

لیکن زخموں سے نڈھال انسانیت کے علمبرداروں کو ابھی ابھی ایک دوسری جنگ کے آتشکدہ میں کودنا باقی تھا۔ ایک عظیم ترین مگر خاموش و بے آواز

جنگ! جہاں ہتھیاروں کی جھنکار کے بجائے عقائد و کردار کی تاب و تواں آزمائی جانے والی تھی۔ جہاں دست و بازو کے کس بل کی جگہ قلب و روح کی توانائیوں کا امتحان درپیش تھا۔ جہاں خدا یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جن انسانوں کے قدموں میں لغزش واقع ہوتی تھی ان کے سینوں کی گہرائیوں میں خدا پر ایمان رکھنے والے قلوب بھی اپنی جگہ اٹل ہیں یا نہیں؟۔ وہ اپنی اس "شکست" کو دشمن کے تیغ و سناں اور آتش و آہن سے منسوب کرتے ہیں یا اس "برا طرح دشمن" کی دسیسہ کاریوں سے جو خود ان کے اپنے ہی وجود کے اندر دنیاوی سود و زیاں کی جذباتی کمین گاہوں میں روپوش بیٹھا تھا؟ وہ انسان پر حملہ آور ہوتے ہیں یا انسان کے اندر چھپی ہوئی باطل قوتوں پر یورش کرتے ہیں؟۔

یہ جہاد نہیں ——— جہاد زندگی کا میدان کارزار تھا۔ کتنا خطرناک مگر کس قدر سادہ و خاموش! کتنا خاموش مگر کس قدر کوہ افگن اور ——— اس "دوسری جنگ" کا ہولناک بگل وہ بھاری بھرکم آواز تھی جو احد کے ایک مرتفع مقام سے بلند ہو کر اب ریگستان کے افق سے افق تک گونج اٹھی تھی۔ یہ ابوسفیان کی پکار تھی۔ نہیں! یہ کفر و باطل کی للکار تھی جو شکست کے باوجود ابھی تک اپنی فتح کی حقیقت سے بدگمان تھا! ——— وہ سوچ رہا تھا کہ میدان جنگ پر کفر کا پرچم لہرانے والوں نے مجاہدین کے جذبۂ ایمانی پر بھی تسلط حاصل کیا ہے کہ نہیں؟ ——— اور اگر خدا کا پیغام بلند کرنیوالے دل و دماغ آج ان کی تلواروں سے بچ کر نکل گئے ہیں تو درحقیقت یہ فتح مبین یک عظیم الشان دھوکا ہے ——— وہ یہ خبر حاصل کرنے کے لئے بیتاب تھا کہ میدان جنگ میں انسان کام آئے ہیں یا اسلام؟ یہی وہ جذبات تھے جو اس کی پکار میں حشر اٹھائے ہوئے تھے

"کیا تم لوگوں میں محمدؐ ہیں؟" وہ چیخ اٹھا "کیا تمہارے درمیان محمدؐ زندہ ہیں؟ ——— بولو کیا محمدؐ زندہ ہیں؟" - غیرت ایمانی کو بے قرار کر دینے والا کتنا بنیادی سوال تھا یہ! - اس للکار کو سنتے ہی زخموں سے چور مجاہدین نے تڑپ کر آنکھیں کھولدیں - خدا کا رسولؐ زخمی ضرور ہوا تھا - مگر اپنی مکمل حسین توانائیوں اور مقدس رعنائیوں کے ساتھ ان کی نظروں کے سامنے موجود تھا - ان کے سینوں میں عزم و یقین کی برق تپاں کوندتی چلی گئی اور ان کے جذبات یہ جوابی نعرہ بلند کرنے کے لئے بیتاب ہو گئے کہ "ہاں محمدؐ زندہ ہیں ——— وہ زندہ رہیں گے ——— وہ زمین پر خدا کی آخری آواز ہیں ——— وہ انسانیت کا نالۂ نیم شبی ہیں ——— وہ حق و انصاف کی ابدی تڑپ ہیں ——— وہ ایمان و یقین کی دائمی قوت ہیں ——— کون ہے جو اس قوت کو شکست دے سکے! ——— کوئی نہیں جو اس چنگاری کو پامال کر سکے!" - لیکن خدا کے رسولؐ نے حکم دیا کہ ایمان کے اس جذبۂ سرشار کو لفظ بنانے کا وقت نہیں آیا - رسولؐ کے ایک اشارے پر جذبات کا ایک سیلِ رواں رک کر دل کی گہرائیوں میں جذب ہو گیا ——— اسلام کوئی ردِ عمل کی وحشیانہ چیخ نہیں ——— وہ ایک مثبت عملی طاقت کا بحرِ ناپیدا کنار ہے - ابو سفیان نے اس سمندر کی خاموشی کو موت اور شکست کی خاموشی تصور کیا ——— لیکن اب بھی کوئی شے تھی جو اس کی فتح کی مسرت میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی ——— وہ اب بھی مطمئن نہ تھا ——— کہیں نہ کہیں حق کی زندگی کا خطرہ باطل کی فاتحانہ سرمستیوں کو اندر ہی اندر سراسیمہ کئے جاتا تھا ——— وہ کچھ دیر چپ رہا مگر جلد ہی اس سے زیادہ قوت سے چلایا "کیا تم میں ابو قحافہ (ابوبکرؓ) زندہ رہ گئے؟" ——— ایک بار کوئی جواب نہ ملا

تو تین بار اس نے یہی آواز لگائی۔ مگر ہر بار سکوت طاری رہا ـــــ ایک عمیق اور پُر وقار سکوت! اب اس نے آخری آواز بلند کی ـــــ "کیا تم میں عمر موجود ہیں ـــــ کیا تم میں عمر زندہ ہیں؟ ـــــ بولو کیا تمہارے درمیان وہ شخص زندہ ہے جس کا نام عمر ابن خطاب ہے؟" ـــــ سکوت بدستور طاری تھا ـــــ ہر بار اسلام کی سمت سے مکمل خاموشی، موت کی سی خاموشی کے سے آثار پا کر وہ وحشیانہ خوشی کے جنوں میں اب اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور چیخ اٹھا۔ یقیناً وہ سب مارے گئے! ـــــ یقیناً اسلام نے میدان احد میں جان دیدی ہے!"۔

یہ نعرۂ باطل ایک انسانی آواز نہیں، زہر میں بجھی ہوئی تلوار کا وار تھا جس نے زخم رسیدہ مجاہدین کی روحوں کو جوش و جلال سے تڑپا کر رکھدیا غیرتِ ایمانی کو پسینہ آگیا۔ یہ انسان پر نہیں خدا کی بے پناہ قدرت پر الزام لگایا جا رہا تھا یہ انسانی حمیت نہیں، دین کے ننگ و ناموس کے خطرہ کا سوال تھا۔ تلواروں کا زخم کھائے ہوئے جسموں میں باطل کی اس للکار کی چوٹ کھا کر ایمان و یقین کی روحیں بیتاب ہو گئیں۔ غیرت و حمیت کے خون کی گردش تیز ہوئی اور زخم شعلوں کی طرح سرخ و سوزاں ہو گئے اور یہ ہنگامۂ جذبات عمر ابن خطابؓ کے لبوں پر ایمان کا غلغلہ انگیز نعرۂ تکبیر بن کر دشت و صحرا اور ریگستان کی وسعتوں میں گونجتا چلا گیا۔

"اے دشمنِ خدا!" ـ ابو سفیان نے عمر کی پُر جلال آواز گرجتی ہوئی سنی "تو جھوٹ کہتا ہے! ـــــ یاد رکھ کہ ہم سب کو خدا نے کفر کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے اپنی طاقت سے زندہ رکھ چھوڑا ہے!"۔

ابو سفیان نے یہ جوابی للکار سنی کہ کتنی غیر متوقع اور کس قدر پُر شکوہ!

کتنی سنجیدہ مگر کتنی بے پناہ! اس کو محسوس ہوا کہ فتح و نصرت کے سارے خواب ایک دھماکہ کے ساتھ زمیں بوس ہو گئے اور باطل کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی ہے۔ اس کا سر ایک مردے کی طرح اس کے شانوں پر ڈھلک گیا! جشن وحشت کے سارے حوصلے سرد پڑ گئے۔ لیکن نئی الفوروہ کسی اچانک جذبہ کی برق ساما نیوں کے ساتھ چونک اٹھا۔ پھر اسی مرتفع مقام پر چڑھتا چلا گیا اور "ایمان" کی زندگی کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے اپنی بھرپور طاقت سے دوسرا وار کرتے ہوئے چیخا "ہبل کا بول بالا ہو! ہبل کا بول بالا!"—

رسول خداؐ کے اشارے پر عمر ابن خطابؓ کی آواز شدید تر جذبات میں للکارتی ہوئی ابھری "اللہ ہی سب سے اعلیٰ و برتر ہے۔ اللہ ہی سب سے اعلیٰ و برتر ہے"۔

"عزیٰ ہمارا ہے تمہارا نہیں!" وہ چیخا "عزیٰ ہمارا ہے تمہارا نہیں"۔

پیغمبرؐ کے جذبات کو عمرؓ کی گرجدار آواز نے زمین و آسمان کے درمیان نشر کرتے ہوئے کہا "خدا ہمارا کارساز ہے، تمہارا نہیں۔ خدا ہمارا کارساز ہے تمہارا نہیں!"

ایک ساعت کے لئے ابو سفیان کے جسم میں حیرت اور خوف، رشک و حسرت کی شدید سنسنی دوڑ گئی۔ نہ جانے وہ کس سوچ میں گم ہو گیا تھا — شاید یہی کہ "حق اور سچائی پر جان دیدینے کا تہیہ کرنے والوں کو گھائل تو کیا جا سکتا ہے، خاموش نہیں! خدا کو کائنات کا مقتدر اعلیٰ ماننے والے دل زخمی تو ہو سکتے ہیں، ٹوٹ نہیں سکتے! جہاد زندگی کا تیغ آزما سپاہی ٹھوکر تو کھا سکتا ہے مگر دشمن کے آگے ہتھیار ڈال کر سجدہ ریز نہیں ہو سکتا!"

"اے عمر!" آخر وہ حسرت و یاس اور ایک بے پناہ عقیدت کی

غیر شعوری تھرتھری میں ڈوب کر پکار اٹھا، "اے عمرؓ! تمہیں قسم ہے تمہارے خدا کی، سچ بتاؤ کیا ہم نے محمدؐ کو مار ڈالا ہے؟"۔

"ہرگز نہیں!" حضرت عمرؓ کی آواز میں ایمان و یقین کی زلزلہ انگیز دھمک تھی ــــــ حوصلہ تھا ــــ باطل کی خام خیالیوں پر ترس تھا ــــــ نفرت تھی ــــــ "ہرگز نہیں! ــــــ وہ زندہ ہیں اور اس وقت بھی تیری آواز سُن رہے ہیں"!

"اچھا؟" وہ گمراہ اٹھا "تو میرے نزدیک ابن قمیّہ سے زیادہ سچا ہے جس نے قتل محمدؐ کی خبر اڑائی تھی"۔

کون جانے یہ آواز باطل کے سربراہ کی تھی یا باطل کے وقار کے مسمار ہونے کا دھماکہ؟ اسلام کا ایک سپاہی خود کفر کی نظروں میں ایک کافر سے زیادہ قابل اعتبار! ــــ جھوٹ سچائی کی عظمت تسلیم کر چکا تھا ــــــ اندھیاروں نے روشنی کی عظمتوں کا اعتراف کر لیا تھا ــــــ اسلام نے طاغوت سے خراجِ عقیدت وصول کر لیا تھا۔ آہن و فولاد میں ڈوبا ہوا ایک مسلح لشکر باطل اسلام کے ایک گھائل سپاہی کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ یہ تھا انجام اس دوسری "خاموش جنگ" کا جو احد کے خوں آلود میدان کے بعد دل و دماغ اور ذہن و روح کی وادیوں میں لڑی گئی۔ جہاں اسلحہ کی جگہ عقائد اور دست و بازو کے بجائے دل کی دھڑکنوں کا معرکہ کارزار بپا ہوا تھا۔ یہ آخری جنگ فتح کے آفاقی اعلان پر ختم ہوئی۔ یہ وہ آخری کامیابی تھی جو احد کے تاریخی میدان میں ایک "زخم شکست" کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو عطا کی گئی۔

میدان احد ایک بار پھر زندگی کی حرارت سے دمک اٹھا۔ باطل ایکبار پھر

فتح کے باوجود اس طرح سوگوار و دل شکستہ واپس ہو رہا تھا جیسے اس نے شکست کا کبھی نہ بھرنے والا زخم کھایا ہو اور اسلام کی لہو میں نہائی ہوئی فوج پس منظر میں اپنے عزم و یقین کے جلو میں خونِ حیات سے سرخرو ہو کر ابھر رہی تھی جیسے مشرق سے نئی سحر سے پہلے شفق کی زرکار شعاعیں!۔

جہاد زندگی کا یہ خاموش میدانِ عمل آج بھی کفر و باطل کی یہ للکار سُن رہا ہے "کیا تم لوگوں کی رگوں میں محمدؐ، ابوبکرؓ اور عمر ابن خطاب کا مقدس ایمانی لہو موجود ہے؟"۔ دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کے کان اس آواز کو سُن رہے ہیں۔ مگر کوئی ایک دل غیرتِ ایمانی کا نمونہ پیش کرنے کے لئے یہ نعرۂ تکبیر بن کر لبوں تک نہیں آتا کہ "ان رگوں میں وہی خون آج بھی گردش کر رہا ہے

—— خدا ہی اعلیٰ و برتر ہے   خدا ہی ہمارا کارساز ہے

تمہارا نہیں!"۔

سجدۂ بندگی —— نقطۂ عروج پر

نہ جانے جنوبی ہندوستان کی سرزمین پر تاریخ نے اسلام کی کس طاقت کا لرزہ خیز جلال دیکھا تھا کہ صدیاں گذر گئیں مگر ہنوز تاریخ کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی ہیں! مسٹر ہنومنتیا سابق وزیر میسور نے جب مسلمانوں کے ایک اجتماع میں اس حیرت انگیز واقعہ پر سے نقاب اٹھایا تو ان کی غیر مسلم آواز میں اسلام کی اس بے پناہ ایمانی قوت پر تاریخ کی وہی صدیوں پرانی عقیدت کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

آج سے سیکڑوں سال پہلے ——

تانا شاہی گولکنڈہ کے قلعہ کی دیو ہیکل دیواریں دیکھ رہی تھیں کہ قلعہ کی

سر بفلک فصیلوں سے برستی ہوئی تیروں کی بے رحمانہ بوچھاریں اور نگ زیب کی سپاہِ اسلامی ایک ایسی عظیم شان و جبروت اور بے مثال استقلال کے ساتھ ایستادہ ہے جیسے خون کے سُرخ سمندر اور موت کی ژالہ باریوں میں کوئی سر بفلک چٹان کھڑی ہوئی ہو! تیروں کی بارش میں گوشت پوست کے جسم زخم پر زخم کھا رہے تھے مگر خوف اور خون کی طوفانی موجوں کا بے پناہ ریلا اس سپاہ کے کوہستانی استقلال میں ذرا بھی جنبش نہ پیدا کر سکا۔ چٹانوں اور پتھروں کے مستحکم قلعہ کا صدیوں پرانا جاہ و جلال جس کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ ہوا ہوگا کہ انسانی گوشت پوست کے لوتھڑوں میں کبھی ان چٹانوں اور تیروں سے ٹکرا جانے کی جرأت سر اٹھا سکتی ہے۔ جن کو عناصر کے موسمی غیض و غضب نے کبھی آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا تھا۔ جن کو برق باد کے طوفان اور زلزلے عقیدت سے دیکھتے ہوئے گذرتے تھے۔ آج اسی جاہ و جلال کو گوشت پوست میں لپٹی ہوئی مشت بھر انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے اپنے ایمانی استقلال سے پاش پاش کئے دے رہے تھے!۔ اسلامی سپاہ کے تیر و تفنگ کے حملہ میں قلعہ کی دیواریں چھلنی ہوئی جا رہی تھیں۔ پتھروں اور چٹانوں کا تعمیری پہاڑ اپنی بنیادیں لرزتی ہوئی محسوس کر رہا تھا، مگر وہ انسان جو چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے نہ جانے کب سے زندگی اور موت کے درمیان خطرات کے منجدھار میں پڑے ہوئے تھے۔ اپنے مجروح اور خوں چکاں زخموں کے ہجوم میں اس طرح سکون و اطمینان سے اٹل کھڑے تھے جیسے ان کے جسموں کے اندر چھپی ہوئی خدا شناس روحوں کو دنیا کی کوئی طاقت چھونے کی بھی جرأت نہیں کر سکتی! یہ قلعہ کی دیواریں حیرت میں گم تھیں، دیواروں پر ماہر تیر اندازوں کی ٹولیاں سراسیمگی کے عالم میں سوچ رہی تھیں اور انسانی تاریخ آنکھیں پھاڑے ہوئے

دیکھ رہی تھی کہ آخر ان مشت بھر مٹی کے انسانی جسموں میں وہ کونسی چنگاری شعلہ زن ہے جو نہ خون کے سیلاب میں سرد ہوتی ہے اور نہ تیر دتفنگ کی خوفناک آندھیوں میں بجھنے کا نام لیتی ہے! لیکن ابھی ان حیرت وعقیدت کے تماشائیوں کو اس جنگ کا اس سے بھی عظیم ترمی ذ دیکھنا باقی تھا!۔

ٹھیک اس لمحہ جب کہ ہفتوں کی موت اور زندگی کی کشمکش کا میابی کی منزل کو چھونے والی تھی۔ جب تیر دکمان کے خوں چکاں زخموں پر فتح کا نرم وشیریں ہاتھ مرہم رکھنے والا تھا۔ جب قلعہ کے باہر میدان میں خون اور پسینہ میں شرابور فوج کو یہ قیمتی موقعہ مل رہا تھا کہ وہ آہنی پھاٹکوں کو چیرتی ہوئی قلعہ کی چوٹیوں پر جا چڑھے اور تیروں کی بوچھار کرنے والے تیراندازوں کے سر پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے ——— ہاں ٹھیک اس وقت جب دنیا اپنی تمام رعنائیوں اور جاذبیتوں کے ساتھ مجاہدین کے قدموں میں ایک ادائے سپردگی کے عالم میں جھک جانے والی تھی۔ ٹھیک اسی وقت انسان نے اپنے خدا کی پکار سنی ——— "اللہ اکبر ——— اللہ اکبر!"۔ اللہ ہی عظیم ترین ہستی ہے۔ اللہ ہی عظیم ترین ہستی ہے ——— "حی علی الصلوٰۃ ——— حی علی الفلاح" (لہٰذا دنیائے رنگ دبو کی ہر پر فریب دلکشی سے منھ موڑ کر) نمازوں کی طرف چلو! فلاح کی سمت دوڑو! ——— خدا کی طرف تیز گام ہو جاؤ! ——— اور واقعی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ قصر گولکنڈہ کی شکل میں جو دنیاوی انعام ان کے ہاتھوں تک آپہنچا تھا انھوں نے اس سے منھ موڑ لیا اور "نماز و فلاح" کی اس پکار پر والہانہ جوش وخروش سے بڑھتے چلے گئے۔ حسین تمنائیں، لذیذ خواہشات، ہنگامہ خیز دلکش خواب اور پوری دنیاوی زندگی ان کے پیچھے پیچھے انکو پکارتی آرہی تھی

مگر وہ ہر طرف سے کٹ کر کائنات کے واحد پالنہار خدائے ذوالجلال کے آگے عجز و خشوع کے ساتھ صف آرا ہو گئے۔ جیسے نماز و فلاح کی اس پکار کے چند لفظ اتنی عظیم الشان قیمت رکھتے تھے کہ ان کو تخت و تاج اور قصر و ایوان کے بدلہ میں بھی فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس سود و زیاں کی ماری دنیا میں کسی اور ہی دنیا کے راہی تھے جن کی منزل اس زمین و آسمان سے دور ——— موت و حیات کے اس پار ——— دور ——— بہت دور کہیں تھی۔ ہیروں اور موتیوں کے انبار ان کی دسترس میں آیا چاہتے تھے۔ مگر انھوں نے صرف اپنے خدا کے لئے خاک کے حقیر ذروں پر پیشانی رکھ دینے کو پسند کیا۔ تانا شاہی فوجیں ان کی غلامی اور حلقہ بگوشی کے لئے مجبور ہونے والی تھیں مگر خدا کے بندے خود ہی عبودیت و بندگی کے جذبہ سرشار میں مالک الملک کے سامنے زمیں بوس ہو رہے تھے۔ سنگ و آہن سے ڈھلے ہوئے اور سیم و زر سے جھنکارتے ہوئے شاہی قلعہ کی کنجیاں ان کے جس دامن میں گرنے والی تھیں انھوں نے خود ہی اس دامن کو جھاڑ کر انسانی زندگی کے آخری انجام کے تصور میں داور محشر کے آگے دامنِ سوال پھیلا دیا تھا۔

کیسا عجیب اور کتنا حسین تھا یہ منظرِ جاں نثاری! ——— اسلام ہی نہیں۔ خود کفر بھی ان کی اس ادا پر سر دھن رہا تھا۔ تانا شاہ اور اس کے ماہر تیر اندازوں نے یہ منظر دیکھا۔ ان کو خود اپنی آنکھوں کے مشاہدہ پر یقین نہ آتا تھا کہ انسان، ان جیسے کچھ انسان ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ایک ان دیکھی دنیا اور نادیدہ خدا کے وجود پر ایسا یقین رکھتے ہوں کہ آنکھوں دیکھی دنیائے رنگ و بو اور محسوس نعمتوں کے لاکھوں شاہی خزانے بھی اس یقین کے آگے خیرہ ہو کر رہ جائیں

ٹھوس مادی حقیقتوں کی دنیا کے درمیان انسان غیب کی دنیا کے "خوابوں"
میں اس طرح گم ہو جائے! مگر ابھی تانا شاہ کو یہ خیال تھا کہ "یہ جوش بندگی"
شاید شمشیر و سناں اور تیر و کماں کے نرغے میں خدا کے آگے سجدہ ریز ہونے کے
خطرناک نتائج کا شعور نہیں رکھتا! اور جیسے ہی نماز پر قلعہ کی سمت سے
تیروں کی بوچھار اس خطرہ کی نوعیت سمجھائے گی، عقیدت سے جھکے ہوئے
سر وحشت و ہراس کے عالم میں گھبرا کر اٹھ جائیں گے۔ انسانی حملہ سے خائف
ہو کر "خدا کی اس صف آرا فوج" کا شیرازہ بکھر جائے گا ——— اب
اقامت کی آواز کے بعد "امام" جائے نماز پر آچکا تھا۔ اور دنیا کو دین کے
داؤ پر لگا کر ——— زندگی اور موت کے امید و بیم سے دور اپنے خالق
کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوا اس حقیقت کا اعتراف کر رہا تھا کہ "یہ جسم و جاں،
یہ موت اور زندگی اور یہ ساری متاع حیات تیری امانت ہے اس لئے
تیری پکار پر ہر شے حاضر خدمت ہے"۔ ادھر فوج کے ایک عام انسان نے
یہ جذبات پیش کئے اور جماعت میں ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے شاہ و گدا نے
اس کی آواز سے دل کی دھڑکنوں کی آواز ملائی۔ ادھر قلعہ کی فصیل سے ایک تیر
سنسناتا ہوا آیا اور ایمان کی قربانگاہ پر سپردگی و جاں نثاری کا دعویٰ کرنے
والے کے جگر کو چاک کر گیا۔ امام کی لاش خدا کا نام لیتی ہوئی جائے نماز
کے کنارے پر گری اور فی الفور "دوسرا امام" صف سے نکلکر اس قربان گاہ
پر سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ موت کے خوں ریز دہانہ پر ایمان و یقین کے
انسانی پہاڑ پوری شان سکون و استقلال سے کھڑے ہوئے تھے
قلعہ کے تیر انداز اور تانا شاہ یہ منظر دیکھ رہے تھے اور عالم حیرت میں ایک
بت کی طرح ساکت و صامت کھڑے تھے۔ دوسرا تیر کمان سے نکلا اور

دوسرے امام کو خاک وخوں میں غلطاں کر گیا۔ ایک ساعت کے لئے جائے نماز خالی رہ گئی۔ تیسرا امام کون بنے؟ اب کون ہے جو ایک یقینی موت کے نشانے پر جست کرے؟ نمازی سوچ رہے تھے۔ تیر انداز منتظر تھے۔ تانا شاہ نظر جمائے ہوئے تھا۔ زمین و آسمان سانس روکے ہوئے اس عجیب منظر پر نگاہیں مرکوز کئے ہوئے تھے۔ تانا شاہ نے سوچا کہ شاید کفر کا وار کاری ثابت ہوا ہے اور ایمان و یقین کا دل قاتلانہ گھاؤ کھا کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوا چاہتا ہے قلعہ کی فصیل سے تیر اندازوں نے فخر و مسرت کا وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ان کی بصارت پر ایک خیرہ کن بجلی کوند گئی۔ ان کے منھ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اب ان کے ہاتھ کپکپائے اور تیر و کماں چھوٹ کر زمین پر آرہے۔ ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے اس بار جس شخص نے خود کو موت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لئے پیش کیا تھا وہ کوئی سپاہی نہیں، بلکہ خود اورنگ زیب تھا! شہنشاہ نے فوجوں اور قلعوں کے کجکلاہ نے اپنی ساری عظمت و سلطنت کے خوابوں کو ایک سجدۂ بندگی پر نثار کرنے کا تہیہ کر لیا تھا! تانا شاہ اور تیر اندازوں کو بھولے سے بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ زمین پر حکومت کرنے والا ایک انسان اپنے دشمن کو زیر کرتے کرتے اپنے خدا کی آواز پر ہاتھ روک کر خود کو دشمن کے مہلک تیروں کی باڑ پر رکھ سکتا ہے۔ ان لوگوں کے پورے وجود جذبات کے ہیجان سے تھرتھرا گئے، نفرت و انتقام کے پتھروں میں عقیدت و مرعوبیت کی برقی سنسنی دوڑ گئی۔ انسانیت کی عظمت ایک زلزلہ بن کر قلعہ اور قلعہ کے بادشاہ پر رعشہ دوڑاتی چلی گئی۔

"نہیں!" تانا شاہ تیر اندازوں کو تیر اندازی کا حکم دینے کے بجائے والہانہ جوش میں چیخ اٹھا "نہیں! شہنشاہ پر کوئی تیر نہ چلایا جائے! یہ انسان

نہیں، دیوتا ہے!"۔ لیکن شہنشاہ نے اپنی پوری جماعت کے ساتھ اپنے خدا کے آگے سربسجود ہوتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ دیوتا نہیں، صرف انسان ہے۔ خدا کا بندہ اور ایک کمزور انسان ہے! جس کی گرد کو بھی اوہام پرستی کے دیوتا نہیں پا سکتے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب انسان نے اپنی انسانی عظمت کا یہ عملی ثبوت دیا تو گولکنڈہ کے قلعے ہی نہیں زمین و آسمان کے تمام خزانے قدرت نے اس کے قدموں پر نچھاور کر دیئے! لیکن تاریخ ہم خدا فراموشوں سے پوچھ رہی ہے کہ اے اسلام کا دعویٰ کرنے والو! تمہاری پیشانی میں بھی کوئی سجدہ ہے؟ کوئی ایسا سجدہ جو دنیا کو خدائے واحد کے آستانے پر جھکانے کا سبق دے۔؟

جنگ ـــــ زمین اور انسان کے درمیان!

جب خدا کے رسول نے مدینہ میں کھڑے ہو کر یہ سنسنی خیز اعلان کیا کہ روم کی شاہی فوجوں کا راستہ روکنے کے لئے تبوک کی طرف کوچ کیا جائے گا، تو کون توقع کر سکتا تھا کہ یہ آواز ان مٹھی بھر انسانوں کے جذبات میں یقین، جرأت غیرت اور سرفروشانہ جنون کا طوفان اٹھا دیگی۔ جن کے پاس وقت کی اس عظیم مادی طاقت سے ٹکر لینے کے لئے اس یقین کی دولت کے سوا کچھ بھی نہ تھا کہ ان کے ان دیکھے خدائے کائنات کی غیبی کمک ان کی پشت پر ہے؟۔

ریگستان کے آتشیں ذرے ان کے قدموں میں آبلے ڈال رہے تھے ٹوٹے ہوئے زنگ آلود ہتھیاروں کا حقیر ڈھیر ان کی بے سرو سامانی کا بیرحمانہ مذاق اڑا رہا تھا۔ مسلسل فاقوں کی آگ ان کی رگ و پے کا خون خشک کئے

دے رہی تھی۔ لیکن ان کا یقین و ایمان اس اٹل چٹان کی طرح نظر آتا تھا جو طوفانی سمندر کے وسط میں وحشی دھاروں کے تھپیڑے کھاتی ہے، مگر اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتی: نہیں! بلکہ وہ تو عزم و استقامت کا ایک چلتا پھرتا پہاڑ تھے جو خدا کے رسول ؐ کی آواز پر بڑھتے ہوئے ان نوجوں پر جھپٹ کرنے کے لئے بیتاب تھے جو آگ اور خون کا سیلاب لئے ہوئے ـــــــ آہن و فولاد میں سر سے پاؤں تک ڈوبی ہوئی اتنی ہولناکیوں سے پیش قدمی کر رہی تھیں کہ ان کی ٹھوکر سے پہاڑ بھی پاش پاش ہو جائیں، اور بپھرے ہوئے سمندر پچھاڑ کھا کر ڈھیر ہو جائیں! ـــــــ جن کی ننگی تلواروں کی تیز چمک طاقتور سورماؤں کو اندھا کرنے کے لئے کافی تھی۔ اور جن کے ہزاروں قدموں کی زلزلہ انگیز دھمک شاہی قلعوں کی بنیادیں ہلا دینے کی قسم کھا رہی تھی۔

لیکن زمین اور انسان کی تاریخ نے دیکھا کہ زمین و آسمان کی فیصلہ کن عظیم ترین طاقت "خدا" کو اپنا خدا ماننے کا خاموش عقیدہ ان انسانوں کے دل و دماغ کے نامعلوم گوشوں سے امنڈ کر جب اس اینٹ پتھر کی دنیا میں داخل ہوا تو زمین کی وسعتیں تنگ ہو گئیں اور نظریات و عقائد کے بیکراں یقین نے "کمزوری" میں وہ حسن و جلال سمو دیا کہ اس کی زد میں طاقت اور قہرمانیت پر خوف و حیرت اور عقیدت کی تھرتھری طاری ہو کر رہ گئی! اپنے روح و ضمیر میں ایک "وحدہٗ لاشریک" ـــــــ "فعال لما یرید" اور "علیٰ کل شی قدیر" خدا کا انقلاب آفریں تصور لئے ہوئے ـــــــ دل و دماغ میں سچائی اور انسانیت کا سرفروشانہ جنون دہکائے ہوئے ـــــــ اور اپنے دست و بازو میں ہتھیاروں کی جگہ ایمان و یقین کی بجلیاں بھرے ہوئے نہتا "انسان" ایک طرف تھا ـــــــ اور دوسری طرف آگ، لوہے اور سونے چاندی کا

سیلِ فراواں لئے ہوئے دیو پیکر پہاڑ اور پر شور سمندر اٹھائے ہوئے یہ پوری "زمین" جو گناہ، نفرت اور ظلم و استبداد کے انسانی لشکروں کی شکل میں درندوں کی طرح غرّاتی، زلزلوں کی طرح گرجتی، سمندروں کی طرح امنڈتی اور آندھیوں کی طرح سنسناتی ہوئی روم کے افق اور شام کی راہوں سے اس لئے اٹھ رہی تھی کہ مادی بے سرو سامانی سے کراہتے ہوئے "مدینہ" کو جغرافیے کے نقشے سے مٹا کر رکھدے اور انسانیت کی تاریخ میں ریگستان عرب کے ان نئے انسانوں کے خون سے ہمیشہ کے لئے یہ خونیں اعلان تحریر کردے کہ ٹھوس زمین کے جبڑے اس انسان کی ہڈیوں کو کس طرح پیس کر رکھدیتے ہیں جو اَن دیکھے خدا کا سہارا لیکر آنکھوں دیکھی خدائی کی زد پر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا ہو!

آج کی مادہ پرست دنیا "زمین اور انسان" کی جس گھمسان جنگ کے تصور کو ایک احمقانہ تمنا اور ایک خواب پریشاں سے زیادہ کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہو سکتی. ٹھیک اسی دنیا میں آج سے کچھ کم ڈیڑھ ہزار سال پہلے اسی زمین کے ایک انسان کامل ؐ نے جو خدا کا آخری رسول ؐ تھا اس تمنا کو ایک تاریخ ساز فیصلہ اور اس خواب پریشاں کو ایک ٹھوس تاریخی حقیقت بنانے کی للکار قبول کی تھی، اور پھر مکمل ہوش و حواس کے عالم میں اپنے گرد و پیش کے انسانوں کو آواز دیکر کہا تھا کہ وہ تاریخ کے صفحات میں کمزوری اور طاقت کے فرسودہ معیار بدل کر رکھدیں اور مستقبل کے لئے یہ جیتی جاگتی کہانی چھوڑ جائیں کہ ایک بے خدا روم کی عظیم سلطنت کا سیلاب جب مادی گھن گرج کے ساتھ اٹھا ہو تو ایک خدا شناس ریگستان کے ذرّے اس کا منھ پھیر سکتے ہیں۔

——— (۱) ———

ایک صدائے بازگشت گرد و پیش سے بلند ہوئی ——— کتنا حسین

اعلان! ـــــــ کیسی پرکشش پکار! ـــــــ اور کیسا بیش بہا موقعہ!!!"

ـــــــ "کیسا پرخطر نعرہ ہے یہ؟" ـــــــ دوسری آواز کراہتی ہوئی اُٹھی "للکار کیسی لرزہ خیز للکار!! ـــــــ کیسی زہرہ گداز گھاٹی بلا!" ـــــــ

ـــــــ "جہاد کے میدانوں میں" پہلی آواز کچھ اور عزم و حوصلہ کے ساتھ ابھرتی ہوئی آئی "ہاں جہاد کے میدانوں میں ہم اپنے فانی خونِ حیات کے چند قطروں سے اپنے لئے اس ابدی آگ کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں جس کا ایندھن لکڑی اور کوئلہ نہیں۔ انسان اور پتھر ہیں!"۔

"لیکن...." دوسری آواز پر خوف اور اضطراب سے لکنت طاری ہوگئی۔ "لیکن اے ان دیکھی آگ سے ڈرنے والو! کیا تم اس آگ کو بھول سکتے ہو جو تمہاری آنکھوں کے سامنے چہار جانب شعلہ زن ہے؟ ـــ اف! یہ آتش فشاں ریگستان کے دن! ـــــــ ہواؤں میں آگ لگ رہی ہے ـــــــ سورج کی سرخ کرنوں نے جیسے سارے ریگستان میں آگ لگا کر اس کے ذرّوں کو ان گنت شعلوں کے ایک لامتناہی دوزخ میں تبدیل کر دیا ہے!

شعلے! ـــــــ ان گنت شعلے!! ـــــــ شعلے ہی شعلے!!!"۔

"نہیں؟" ـــــــ پہلی آواز میں غیرتِ ایمانی کی دھمک سنی گئی ـــــــ "نہیں! ـــــــ آنکھیں دیکھ سکتی ہیں تو دل بھی اندھے نہیں ہیں! آنکھیں ایک آگ کو دیکھ رہی ہیں اور دل دوسری آگ کو! ـــــــ آنکھوں دیکھی آگ سے زیادہ ہولناک ہے وہ آگ جس کا تصور ہی انسانی روح کو جھلسائے دے رہا ہے۔ جس کی آنچ نظر آنے سے پہلے محسوس ہو رہی ہے ـــــــ جس کے نظر آنے سے پہلے ہی اس سے بچا جا سکتا ہے۔ مگر ایک بار نظر آنے کے بعد جس کی آتشیں

گرفت سے بھاگ نکلنا ممکن ہی نہیں!"۔

"اوہنہ!"۔

دوسری آواز نفرت و بیزاری کے زہر سے بھر گئی جیسے کوئی زہریلا سانپ پھنکار اٹھا ہو ——— "تم! تم یوں نہ سمجھو گے! لیکن تم اس آگ کے معنی خوب سمجھتے ہوں گے جو دوزخ ہی کی طرح ان دیکھی اور انجانی ہے! — بھوک کی استخواں سوز آگ جو معدہ میں سلگ اٹھتی ہے تو بستیوں کی بستیاں اور آبادیوں کی آبادیاں بھسم کر ڈالتی ہے۔ نادانو! بھوک، افلاس اور قحط سالی کے وہ بھیانک خطرے بھی تمہیں نظر آئے جو ہمارے جہاد پر جاتے ہی ہماری گلی کوچوں، اور گھروں کے اندر گھس آنے کے منتظر ہیں ——— کھجوروں کی پکائی کا یہ قیمتی زمانہ ——— کھجوریں، مدینہ کی آبادی کا واحد خونِ حیات! کیا ان کو حادثوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ اور ہے کہ پورا شہر اپنی موت اور بربادی کے اعلان پر دستخط کر دے؟ — اس طرح اس جنگ کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو انسان موسم کی بھٹی سے بچ نکلیں وہ جہاد میں جا کر دم توڑ دیں، اور جن کو موت بھی قبول کرنے سے انکار کر دے وہ جنگ سے لوٹتے ہوئے مدینے کے دروازے پر قحط کے بھوکے جبڑوں میں زندہ چبائے جائیں!"۔

"ہاں! ہاں!" ——— پہلی آواز میں شدید اکتاہٹ کی انگڑائی اور طنز کی گہری چوٹ تھی "ہاں ہاں خوب جانتے ہیں بھوک کیا ہے اور قحط سالی کسے کہتے ہیں!"۔

"یہ سب وہ درد ہیں جو موت پر ختم ہو جاتے ہیں ——— لیکن ہم اس درد کے تصور سے کانپتے ہیں جو موت سے شروع ہوتا ہے! اور کبھی ختم نہیں ہوتا

تم دکھ بھری موت سے دور بھاگنے کو کمال ہوش مندی قرار دیتے ہو لیکن اس دکھ کی ماری زندگی کو کیا کہو گے جس سے نجات پانے کے لئے موت کا آخری سہارا بھی ٹوٹ چکا ہو!"۔

غزوۂ تبوک کی تیاریوں کا پیغمبرانہ حکم سننے کے بعد یہ دو "انسانی ردِ عمل" دو بازگشت صدائیں جو مدینے کے گوشے گوشے میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں —— دونوں آوازوں کے پیچھے ایک ہی عقیدہ کا اعلان تھا۔ خدا، رسولؐ اور آخرت کا ایک ہی ایمان! —— لیکن ایک آواز کا نام صرف اس لئے "منافق" تھا کہ اس کا ایمان اس کے حلق سے نیچے نہ اتر سکا تھا۔ مگر دوسری آواز "مومن" کہلائی کہ اس کی زبان کی جنبشوں میں اس کی دلی دھڑکنیں سمائی ہوئی تھیں —— وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہی سوچ رہی تھی —— جو سوچا جا رہا تھا وہی کیا جا رہا تھا۔

لیکن ان دو آوازوں کے درمیان ایک "تیسری آواز" بھی تھی جس کو یقین اور کشمکش نے گنگ کر دیا تھا —— جن کے کان پہلی آواز پر مرکوز تھے اور دل دوسری آواز پر مائل —— جن کی زبانیں خدا کو پکار رہی تھیں اور جن کے دل خدا سے ملنے کو تڑپ رہے تھے۔ مگر جن کے پاؤں عملی فیصلے کے بجائے عملی تذبذب کی اس دلدل میں جا پھنسے تھے جہاں سے نکلنے کی ہر کوشش کے ساتھ قدم کچھ اور دھنستے چلے جاتے ہیں —— پہلی آواز پس منظر میں ڈوبتی چلی گئی —— دوسری آواز ایک وجد انگیز آہنگ سے ابھرتی چلی آئی —— اور تیسری آواز روحانی درد کی ایک مسلسل کراہ میں تبدیل ہو کر رہ گئی!۔

"آج آپ اس قدر مسرور کیوں ہیں؟"

اہل خانہ نے حضرت عمرؓ ابن خطاب کے بشرے میں کسی ولولہ انگیز جذبہ کا شعلۂ جوالہ دیکھ کر ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"کیا؟" آپ کی آواز میں احتجاج کی تلخی تھی، ایک چوٹ کھایا ہوا جوش اور امنڈتی ہوئی والہانہ سپردگی تھی" کیا تم لوگ بھول رہے ہو کہ مغرور رومیوں کی فوجیں رسولؐ خدا کی امت پر حملہ آور ہوا چاہتی ہیں! ——"

"لیکن ..... سوال میں اس بار کچھ اور ذہنی الجھاؤ کا اضافہ ہوگیا تھا "لیکن ..... دشمن کے حملے کی خبر پر یہ خوشی! —— مسلمان تو مدینہ کے گلی کوچوں میں فکر و تشویش سے سرگوشی کرتے پھر رہے ہیں کہ اس بار دشمن ہمیشہ سے زیادہ طاقتور ہے۔ —— موسم کی تمازت ناقابل برداشت ہے اور خطرہ ہے کہ کھجوروں کی فصلیں تباہ ہوگئیں تو ....."

"بس کرو!" عمرؓ کی غیرت ایمانی دنیائے دنی کے تذکروں پر مشتعل ہوکر گرج اٹھی۔ "جو بزدل یہ بات کرتا ہے اس کا جواب میری تلوار ہے! اس لئے کہ یہ بات کہنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا —— بزدلی اور ایمان ممکن نہیں کہ جمع ہو سکیں! (پھر ذرا رک کر دلریش برہمی کے ساتھ) تم اس شخص کو "مسلمان" کہہ سکتے ہو جو دشمن کی طاقت کے احساس کو اس دل میں جگہ دے رہا ہے جہاں خدا کی لامتناہی طاقت کے ایمان نے کسی خوف کے لئے جگہ نہیں چھوڑی۔ —— کیا وہ شخص مومن ہو سکتا ہے جو دشمن کو طاقتور مان کر خدا کو کمزور ثابت کرنے کی گستاخی کر رہا ہے! —— جو ریت کے جلتے ہوئے حقیر ذروں سے

خائف ہے مگر جہنم کے بھوکے شعلوں سے نہیں! ــــــ جو کھجوروں کی چند گٹھلیوں کے بدلے میں جنت کو بیچ ڈالنے پر تیار ہے!"۔

"معاذ اللہ! ــــــ خدا کی پناہ!!" ــــــ اہل خانہ موقعہ کی نزاکت کو محسوس کر کے سہم گئے۔

"صحنِ مسجد سے ابھرتی ہوئی آواز سنو!" عمرؓ نے والہانہ جوش کے ساتھ کہا" یہ خدا کے رسولؐ کی آواز ہے ــــــ یہ اس شخص کی آواز ہے جو زمین پر خدا کے عرش بریں کا آخری نمائندہ ہے ــــــ نہیں! ــــــ یہ صرف سننے نہیں کچھ کر گذرنے کا وقت ہے ــــــ ایمانی زندگی کا آخری فیصلہ ہے۔ جس کا ثبوت زبان کے لفظ نہیں خود اپنے جسم کا ٹپکا ہوا خون ہی دے سکتا ہے۔ صادق القول محمدؐ کے خدا نے ہم سے جس "جنت" کا وعدہ کیا ہے اس پر یہ ساری دنیا ہنسی خوشی قربان کی جا سکتی ہے ــــــ ذرا رک کر عجلت کے ساتھ) ہاں تم لوگ اس گھر کا ساز و سامان اکٹھا کر دو ــــــ سب کچھ ــــــ ایک ایک ذرہ!"۔

اہل خانہ اس غیر متوقع حکم پر چکرا گئے ــــــ وہ نہ سمجھ پائے کہ تبوک کے محاذ پر گھر کے برتن کس کام آ سکتے ہیں۔

"ہاں ہاں! ــــــ گھر یلو ساز و سامان!!" ــــــ عمرؓ کی آواز میں بچوں کی سی معصوم خوشی تھی۔ جوانوں کا جوش و خروش اور بوڑھوں کی پر وقار سنجیدگی تھی، اور ساتھ ساتھ قربانی اور جاں نثاری کی ایک ایسی اتھاہ تڑپ تھی جس کے لئے سمندر کی گہرائیاں بھی کافی نہیں ــــــ" ہاں ہاں! عمرؓ اپنے محبوب رہنما کی آواز پر اپنا گھر لٹائے بغیر چین نہ پا سکے گا ــــــ آج زندگی کے ساتھ سامان زندگی لٹانے کی باری ہے ــــــ (مجذوبانہ محویت کے سے عالم میں)

دل ہی دل میں سرگوشی کے انداز سے) "جو خدا ہمیشہ دینے کا عادی ہے وہ آج انسان سے کچھ مانگ رہا ہے! ——— اللہ اکبر ——— کیسا حسین موقع ہے یہ! ——— کتنا دل کش موڑ! ——— خدا کے رسولؐ کی پکار پر خدا کے بندے جانیں پیش کر رہے ہیں ——— دولت نذر کر رہے ہیں، ہتھیار لا رہے ہیں۔ لیکن عمرؓ اپنا نصف گھر لٹا دے گا اور اس کی قیمت میں ان محبوب ہونٹوں پر وہ محبت بھری مسکراہٹ صرف اپنے لئے دیکھ سکے گا جس کو حاصل کرنے کے لئے ہر مسلمان کا سینہ فرطِ شوق سے پھٹا جا رہا ہے ——— (دھیرے دھیرے) ابو بکر تمہارا بھلا ہو! تم نے ہمیشہ مجھے نیکی کی جنگ میں مات دی ہے ——— آج عمر تم پر ضرور بازی لیجانا چاہتا ہے! ——— کاش!.... اگر گھر کی کفالت کا بوجھ ایک فرض نہ ہوتا تو خطاب کا بیٹا اپنا سب کچھ رسولؐ خدا کے قدموں پر رکھ دیتا!"

اور جب اپنے ایک ہاتھ میں جان عزیز اور دوسرے میں گھر بھر کی نصف ملکیت اٹھائے ہوئے آپ "منزلِ شوق" کی طرف روانہ ہوئے تو دیکھا کہ چاروں طرف دین کی راہ میں دنیا لٹائی جا رہی ہے ——— قربانی کے شوق نے جذبے سے "جنون" کی شدت اختیار کر لی ہے ——— انسانی سمندر میں طوفان اٹھانے والا جنون ——— لوگ افتاں، خیزاں دوڑ رہے تھے ——— مدینہ کی پوری زندگی سمٹ سمٹ کر صحن مسجد کے اس گوشے کی طرف تڑپتی ہوئی جا رہی تھی، جہاں خدا کا رسولؐ "انسان" کا منتظر تھا ——— کاندھوں پر ہتھیاروں کے بوجھ لئے جا رہے تھے ——— دامنوں میں سمٹی ہوئی عمر بھر کی دولت جا رہی تھی ——— ایک ساعت پہلے جو زیور عورتوں کی کلائیوں اور گردنوں کو زینت دے رہے تھے ان کو وہی خواتین اپنے جسم سے نوچ نوچ کر آخرت کی قربان گاہ پر

بھینٹ چڑھائے جا رہی تھیں اور جس کے پاس کچھ بھی نہ تھا وہ قربانی کی پیاس سے جلتی ہوئی زندگی کو ہتھیلی پر اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ یہ اس عظیم ترین انسان کے غلام تھے جس نے آدمی کو دنیا کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد کیا تھا ـــــ جس نے چالیس سالہ صداقت کی زبان سے زندگی اور زمین ـ حیات اور کائنات کے آخری انجام کی خبر سنائی تھی ـــــ جس نے پرستش کی آوارہ بیتابیوں کو اس کے خدائے واحد کی طرف لیجانے والی سیدھی راہ دکھائی تھی ـــــ جس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار خدا کی جنت کے مقابلہ میں سلطنت کی پیش کش پر ٹھوکر مار دی تھی ـــــ جس کی صداقت پر انسان ہی نہیں طائف کے جاہد پتھر اور مکہ کے زہریلے کانٹے بھی گواہ تھے جس کی مقدس ہڈیوں کے زخموں اور گھائل رخسار کے خون کی بوندیں انسانیت کو خوں بہا بنانے کے لئے اس زمین کے سینے میں ہمیشہ کے لئے جذب ہو چکی تھیں۔

اور آج اسی "بہار بے خزاں" کا وہ بلند ترین منظر اس کی ردشنں آنکھیں کیف و سرور کے عالم میں دیکھ رہی تھیں، جس کے دیکھنے کے قابل صرف وہی "دو آنکھیں" تھیں جنھوں نے غیب کا سینہ چیر کر خدائے کائنات کے وجود کو پا لیا تھا ـــــ آہ! وہ منظر! ـــــ جو زمین اور انسان کی تاریخ میں نہ اس سے پہلے دیکھا گیا نہ اس کے بعد کبھی نظر آیا! آج زمین پر وہ انسان کھڑے تھے جن کی عظمت کو تسلیم کرنے کے لئے آسمان کے تمام فرشتوں کو سجدہ میں گر جانے کا خدائی حکم ملا تھا۔ اور جس کی عظمت کے متعلق ہلکے سے شک شبہ کے جرم میں ابلیس کی ہزار سالہ عبادت سوخت کردی گئی تھی۔

خدا کے رسولؐ نے شکر کے عمیق ترین جذبہ اور مسرت کے تھکا تبسم کے ساتھ جب اس حسین اجتماع کا جائزہ لیا جو لوٹنے پھر الٹ جانے کیلئے بیتاب تھا

"اے ـــــــ تو دل کی دھڑکنیں ہونٹوں پر تڑپ گئیں ـــــــ اے خدا کے سچے رسولؐ! ہماری قربانی قبول ہو!"۔ آج یہاں ہر فرد خدا کی راہ میں سب سے پہلے کام آنے کے لئے دوسروں سے بازی لیجانے کے لئے بیتاب تھا ـــــــ اپنے معبود سے ہر ایک بچھڑی ہوئی پاکیزہ روح اپنے خدا سے سب سے پہلے جا ملنے کے لئے بیتاب تھی۔ غمِ دوراں کی ساری تمنائیں اور حسرتیں آج صرف اسی ایک آرزو میں سمٹ آئی تھیں کہ ایمان کی اس آزمائش کو اس کے نام سے شروع کیا جائے اور اس کے نام پر ختم بھی ہو! آخرت پر دنیا کی قربانی کو قبول کرتے ہوئے محمدؐ کی سب سے پہلی جاں نواز مسکراہٹ اس کے حصے میں آئے آہ یہ لوگ! ـــــــ خدا کی قسم یہی اس کے مستحق تھے کہ خدا کا حسین ترین بندہ ان کے درمیان سے ظاہر ہو! ـــــــ اور خدا کی آخری آواز ان کے ماحول میں گونجتی چلی جائے!۔

"اے عمرؓ!" ـــــــ یہ خدا کے رسولؐ کی نغمہ آفریں صدائے دل نواز تھی۔ وہ آواز جس کی آڑ میں خدا انسانیت سے باتیں کرتا تھا "میرے ماں باپ آپ پر نچھاور! ـــــــ میں حاضر ہوں اے اللہ کے رسولؐ! ـــــــ عمرؓ فرطِ شوق و عقیدت سے آج اس انسان پر جان دینے کو کتنے بیتاب تھے جس کی جان لینے کے لئے کبھی مکہ کے گلی کوچوں نے ان کی تلوار بے نیام ہوتے ہوئے دیکھی تھی۔

"اے خطاب کے بیٹے"۔ آپؐ نے کمال شفقت کے ساتھ فخر و حسرت کے انداز میں فرمایا۔ "کیا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا ـــــــ گھر والوں کے لئے بھی کچھ چھوڑا؟"۔

"اے خدا کے رسولؐ!" عمرؓ کی آواز میں شکر کا عجز، مسرت کی بے پناہی

اور سپردگی وایثار کا حیات انگیز اظہار تھا۔" میرے پاس جو کچھ تھا اس کے دو ٹکڑے کئے، آدھا دین کے لئے حاضر ہے، آدھا دنیا کے فرائض کے لئے چھوڑ آیا۔"

اس ہمہ گیر قربانی کا اعلان سن کر سارے اجتماع پر ایک لمحہ کے لئے حیرت وعقیدت کا سناٹا چھا گیا خدا کے رسولؐ کا جاں نواز تبسم عمرؓ کے حصے میں آتا ہوا دیکھ کر ہر فرد ان کی شخصیت کو حسرت سے دیکھ رہا تھا ــــــ چہرے اس مایوسی کا حسین منظر پیش کر رہے تھے جو نیکی کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے کے ملکوتی احساس سے انسان کے اوپر طاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں ــــــ ابھی ایک انسان اس ہجوم میں ایسا بھی موجود تھا جس کے چہرے پر رشک بھری پریشانی کی جگہ کامیابی کا لطیف تبسم تھا ــــــ ایک تبسم جس کو احساس شکر اور جذبہ عبودیت نے عجز کی حسین ترین افتادگی میں سرنگوں کر دیا تھا۔ یہ ابوبکرؓ تھے! ــــــ دنیا کا پہلا بالغ نظر مسلمان ــــــ اور جب خدا کے رسولؐ نے ان سے یہی سوال کیا تو زمین وآسمان کے کانوں نے سنا کہ وہ اپنی ساری دنیا قربان کر چکے ہیں! ــــــ خدا اور اس کے رسول کے نام کے سوا ان کے گھر میں اب کچھ بھی نہیں!!۔

دل میں چھپے ہوئے ایمان آج کھلی آنکھوں اپنے نقطہ عروج پر نظر آرہے تھے! ایمان سے عمل تک پہنچنے کی گھاٹی آخری حدوں تک طے ہو چکی تھی۔ تبوک کے محاذ پر دین ودنیا کی آزمائش کی جو کوہ افگن لڑائی ہونے والی تھی۔ ابوبکرؓ وعمرؓ کی جاں سپاریوں نے اس کو صحن مسجد ہی میں مکمل کر دیا تھا ــــــ اس فوج کا ہر سپاہی جاں نثاری اور سرفروشی کی جو کہانی خون دل وجگر سے لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ "شیخینؓ" کے باب پر اختتام تک پہونچی تھی۔ جنگ سے پہلے

فتح ہو چکی تھی ——— امتحان سے پہلے امتحان ہو چکا تھا ——— عقیدے اور ایمان ہتھیاروں سے پہلے اپنا کام کر چکے تھے۔ جہاد کی جگہ جہادِ اکبر کا وہ معرکہ سر ہو چکا تھا جہاں انسان اپنے ہی وجود میں گھس کر اپنی کمزوریوں پر قاتلانہ وار کرتا ہے۔ خدا کے یہ سپاہی تبوک کے محاذ پر پہونچے تو یہ غلغلہ انگیز آواز بلند ہوئی کہ زمین کی عظیم مادی طاقت ضعیفوں کی ایمانی دھمک سنتے ہی الٹے پاؤں پلٹ گئی ہے اور "انسان اور زمین" کی جنگ میں جنگ سے پہلے ہی "انسان" فاتح ثابت ہو چکا ہے۔

تاریخ پکار اٹھی اور اس کی یہ پکار آج بھی افق سے افق تک گونج رہی ہے "اے زمین و آسمان! اے ذرّو اور ستارو! گواہ رہو کہ اس فاتح انسان کا نام "مسلمان" ہے! لیکن سیکڑوں سال کا فاصلہ طے ہونے کے بعد جب آج یہ پکار ابھرتی ہوئی آتی ہے تو اس کا جواب دینے کے لئے امتِ مسلمہ کے ٹوٹے ہوئے کھنڈروں کی صدائے بازگشت کراہنے لگتی ہے ——— "کیا ہم مسلمان ہیں؟"۔

اخلاق کا تیرِ نیم کش

"لائیے۔ میرا قرض لائیے ——— ابھی ——— اور اسی وقت"

تیوری چڑھائے ہوئے یہودی نے یہ بات خدا کے رسولؐ سے کہی ——— یہ الفاظ کا کھرا پن اور آواز کی درشتی اس عظیم انسان کی بارگاہ میں ایک لرزہ خیز حادثہ تھی جس کے غلام اس کی آواز کے مقابلہ میں اپنی آواز کی ذراسی بلندی کو بھی اپنی دائمی بربادی تصور کرتے تھے۔ لیکن آج ان ہی جاں نثار رندانہ گاروں کے درمیان خدا کے رسولؐ سے خدا اور رسولؐ کا ایک منکر اس طرح

بات کرنے کی جرأت کر رہا تھا جیسے اس کا مخاطب کوئی "نادہند" شخص ہو ——— جیسے اس کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ ہو کہ وہ اس وقت اس "صادق وامین" سے ہمکلام ہے جس کے ہاتھ میں اس کے بدترین دشمن کی امانت بھی ہمیشہ محفوظ رہی ہے!۔

صحابہ اس انداز گفتگو پر چراغ پا ہو گئے ——— قریب تھا کہ ان کے جذبات حرکت میں آجاتے، مگر وہ یہ دیکھ کر حیرت سے گنگ اور عقیدت سے دم بخود رہ گئے کہ محمد عربی کے مقدس بشرے پر اتھاہ صبر و سکون بدستور قائم ہے۔ آپکے لبوں سے جو الفاظ نکلے وہ قرض کی فی الفور ادائیگی نہ کر سکنے کے "حرف اعتذار" کے سوا کچھ نہ تھے۔ ایک اعتذار جو انتہا پسند مطالبہ قرض کی ناروا درشتی اور دل خراشی کی نسبت سے کچھ اور نرم ——— کچھ اور دلنشیں ہوتا جا رہا تھا ——— حیوانیت کے مقابلہ میں انسانی شرافت جلوہ افروز تھی ——— دلخراش لب و لہجہ کے جواب میں زبان سے پھول جھڑ رہے تھے ——— گستاخانہ ترش روئی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ پیغمبر کی اخلاقی رفعت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا ——— ایک پیغمبر کے لئے کتنا آسان ہے یہ جاں گداز کام کہ بیرحمانہ حملوں میں اپنے قلب و روح کو مجسم روح ہو جانے دے، لیکن یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت ہے کہ ایک حق دار کو حق کے مطالبہ سے بزور قوت روک دے۔ وہ ہر زیادتی کو برداشت کر سکتا ہے مگر کسی پر زیادتی کرتا ہے نہ کرنے دیتا ہے۔ صحابہ اسی احساس سے سینہ پر صبر کی بھاری سل رکھے ہوئے دل ہی دل میں تڑپ رہے تھے۔ لیکن یہودی کو جیسے ان میں سے کسی بھی نزاکت کا احساس تک نہ تھا!۔ بےحسی اور احساس کے درمیان یہ خوفناک کشمکش شروع ہوئی تو گھنٹوں جاری رہی ———

یہودی ایک بلائے بے درماں بن کے رہ گیا تھا۔ آں حضرتؐ نے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ معذرت نے اثر نہ کیا تو شریفانہ خاموشی اختیار فرمائی اور جب شریفانہ خاموشی سے اس کو تکلیف محسوس ہوئی تو پھر اپنے اعتذار کو نرم ترین انداز میں دہرا دیا مگر یہودی کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ اس کے تیور مزید گستاخانہ ہوتے گئے۔ آپؐ کے صبر و ضبط کا انداز دیکھنے والوں کے لئے کچھ اور دردناک ہوتا گیا اور نہ جانے کیسے صحابہ خون کے گھونٹ پیتے رہے۔

یہ ڈرامائی صورت حال ظہر کے وقت سے فجر تک جاری رہی !۔

صحابہ حیران و سرگرداں تھے کہ اس سخت آزمائش کا خاتمہ کب اور کیسے ہونے والا ہے ؟۔

نفرت، غصہ اور بے بسی سے دہکتی ہوئی نظریں ہر لمحہ اس کی منتظر تھیں کہ کب رسولؐ خدا کی پیشانی پر ناگواری کی ہلکی سی شکن ظاہر ہو اور کب صحابہ کی تلوار یہودی کا سر تن سے جدا کر دے۔

لیکن ان کو کیا خبر تھی کہ لوہے کی تلوار جس سر کو کاٹ کر اپنے قدموں پر گرا سکتی ہے حق و صداقت کا "اسوہ حسنہ" اس کو جیتا جاگتا جیت سکتا ہے ——— وہ نہ جانتے تھے کہ آج رسالت کی عظمت کو سمجھنے کے لئے والہانہ عقیدت کے خوابیدہ جذبات اہانت کا لباس پہن کر آئے ہیں۔

آخر انھوں نے یہ جاں نواز منظر بھی دیکھ ہی لیا ——— گھنٹوں سے جو زبان خدا کے رسولؐ پر ناشائستہ تقاضوں کی بوچھار کر رہی تھی اسی زبان سے یہ الفاظ نکلنے شروع ہوئے۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے رسولؐ ہیں۔ ایک رسول جس کے

اخلاق کا معیار توریت نے پیش کیا ہے ——— میری مصنوعی گستاخی کا بہروپ اسی عقیدت تک پہونچنے کی ایک کوشش تھی جہاں آپ کے عظیم اخلاق کے سہارے میں آپہونچا ہوں۔"

خوفِ خدا ——— انسانیت کی آخری امید

صحابۂ خدا کے رسولؐ کے ساتھ سفر کر رہے تھے انھوں نے جہاں قیام کیا وہاں پانی ناپید تھا اور مسافر شدید پیاس محسوس کر رہے تھے جو لوگ پانی کی تلاش میں نکلے تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک غیر مسلم عورت ٹھنڈے پانی کے مشکیزے اٹھائے چلی جا رہی ہے۔ پیاسے انسانوں نے پانی طلب کیا مگر عورت نے انکار کر دیا ——— یہ لوگ اس عورت کو مشکیزوں سمیت گرفتار کر کے حضورؐ کی پیشی میں لائے۔

عورت کو خطرہ کا شدید احساس ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ پیاسے انسانوں کو پانی کا انکار کرنے کی نہ جانے کیا سزا تجویز ہونے والی ہے ——— وہ ایک عورت تھی ——— مردوں کی حراست میں بے نوا عورت ——— اس کو یقین تھا کہ یہ لوگ اس پر جو ظلم چاہیں کر سکتے ہیں اور وہ کسی ظلم کا دفاع کرنے کی طاقت نہیں رکھتی، لیکن حیرت اور عقیدت سے وہ دم بخود رہ گئی جب اس نے دیکھا کہ پانی کے مشکیزے ایک ہاتھ سے لینے کے ساتھ خدا کے رسولؐ نے دوسرے ہاتھ سے اس کی قیمت اس کی طرف بڑھا دی۔

"یہ کون لوگ ہیں جو اس وقت بھی" کسی سے " ڈرتے ہیں جہاں ان کو ڈرانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔" عورت سوچ رہی تھی یہ کون شخص ہے،

جو اس وقت انصاف کر رہا ہے جہاں ظلم و بے انصافی کے خطرات پوری قوت سے موجود ہیں! یقیناً خدا پران کا ایمان ایک حقیقت ہے یقیناً خدا ہے اور یہ خدا کے ماننے والے؟" عورت نے یہ سوچا اور ——— دوسرے ہی لمحے مسلمان ہو گئی! - رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

سچائی ——— ایک منھ بولتی تصویر

ابو رافع اور عبداللہ بن سلام جب خدا کے رسولؐ کے پاس جا رہے تھے تو خدا کا پیغام سننے اور سن کر بھنے سوچنے کے نہ جانے کیا کچھ طریقے ان کے ذہن میں ہوں گے! وہ ایک بڑی لمبی مہم پر روانہ ہوئے تھے آباؤ اجداد کے صدیوں پرانے عقیدوں سے دور ایک نئے دین کی آزمائش اور تحقیق کا سفر تھا یہ! کتنی طویل تحقیق کی ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی یہ۔ کتنا نازک اور محتاط موڑ نظر آ رہا ہوگا!! ——— لیکن ان کی نگاہیں جب اس انسانؐ کے چہرے پر پڑیں جو کہتا تھا کہ "میں خدا کا آخری رسول ہوں" تو وہ اس شخص کو دیکھتے ہی رہ گئے! ——— وہ چہرہ ——— روح کے جمالِ بیکراں سے جگمگاتا ہوا چہرہ خود ہی اپنا پیغام تھا اور خود ہی اس کا ثبوت بھی! - یہاں شخصیت خود ہی اپنا بہترین تعارف تھی ——— خاموشی خود ہی ایک یقینی اعلان تھی ——— صورت ہی سیرت و کردار کا شفاف آئینہ تھی!۔

ابو رافع اس کشش کی گرفت میں آئے اور ہمیشہ کے لئے حلقہ بگوش ہو کر رہ گئے۔ عبداللہ بن سلامؓ نے حقیقت کی یہ زندہ تصویر دیکھی اور تحقیق و جائزہ کا طولانی سفر بیک جنبش نظر طے کر لیا - وہ عقیدت کی شدت میں پکار اٹھے:

"لیس ھذا بوجہ الکاذب"۔

"نہیں یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا؟"۔

الفاظ پر شک کیا جا سکتا ہے ——— شک کیا جاتا ہی ——— شک کیا جاتا رہے گا۔

لیکن سیرت و کردار کی گواہی اور صورت کی خاموشی یقین دہانی ہر شک و شبہ سے بلند ہے۔ یہی وہ شئے ہے جس کا فوری بے پناہ تأثر ایک لمحہ میں صدیوں کے عقیدوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ جہاں ایک انسان عمر بھر کے مانوس عقائد سے ہٹ کر اور آباؤ اجداد کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتا ہوا ایک پر کشش "اجنبی" کی پکار پر دوڑتا ہے۔ لیکن کیا ہوا کہ عرصۂ دراز سے اسی "اسوۂ حسنہ" کے ماننے والوں کی یہ پکار بے اثر ہے ذوق و شوق کی پیش قدمی رکی ہوئی ہے اسلام کی طرف بڑھتا ہوا انسانیت کا سیلِ رواں آخر کہاں رک گیا؟۔

انسانی حقوق کا انصاف

شاہی خزانے کے دروازے پر یہودی آبادی ایک ایسا منظر دیکھ رہی تھی جو آسمان کی آنکھ نے اس زمین کے اوپر شاید اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا! آج یرموک کے محاذ پر ہرقل کی آہن پوش رومی فوجیں گھن گرج کے ساتھ نمودار ہو رہی تھیں اور اس آہنی سیلاب کا رخ موڑ دینے کے لئے حمص کے علاقہ سے مسلمانوں کے لشکر بستی سے کوچ کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

جنگ کے یہ وہی "ہنگامی حالات" تھے جن کی آڑ لیکر شہنشاہیت کا عفریت اپنی رعایا کے لہو کا آخری قطرہ تک چوستا آیا ہے —— جب فوجوں کے دہانوں میں کھیتوں کے کھلیان غلام ملک کو بھوک اور فاقہ کشی کے شعلوں میں بھسم ہوتا ہوا چھوڑ کر ہضم ہو جاتے ہیں۔ جب اسلحے کے کارخانوں میں نوآبادیوں کی دولت سمیٹ سمیٹ کر ڈھیر کر لی جاتی ہے اور انسانیت کی ضروریات کو اپاہج بنا کر مشین کے پہیئے خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ چکر کھانے لگتے ہیں۔ جب حکومتوں کے فوجی بجٹ اپنے ہولناک جبڑے کھول کر ملک کی ساری اقتصادی طاقت کو اپنے خسارے کی خوراک بنا لیتے ہیں۔ اور جب سیاسی مصالح کے قاہرانہ فرمان پر انسانی ہمدردی و ایثار کے خون سے دستخط ثبت کر دیئے جاتے ہیں لیکن —— حمص حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ آج جنگ کا طبل بجتے ہی شاہی خزانے کا منہ ذمی آبادی پر فیاضی کے ساتھ کھول دیا گیا اور شہر کے طول و عرض میں یہ صلائے عام گونج اٹھی کہ ذمی آبادی کا ہر فرد سال بھر کے جزیہ کی گرانقدر رقم حکومت سے واپس لیجائے!۔

"ہم یہ کیا سن رہے ہیں؟"۔ یہودیوں نے آپس میں کہنا شروع کیا اور انسانوں کے گروہ شاہراہوں پر اکٹھے ہو کر سرگوشیاں کرنے لگے "ہم کیا دیکھ رہے ہیں آخر؟"۔

"یہ مسلمان کیسی قوم ہے جو جنگ پر جاتے ہوئے آبادی کی دولت سمیٹنے کی بجائے اپنی دولت کو دونوں ہاتھوں سے ہمارے اوپر لٹا دینا چاہتی ہے"

"ہاں" اسلامی حکومت کا معصومانہ جواب تھا "بے شک جنگ کے سیاہ بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں اور جنگی تیاریوں کے لئے

سرمایہ کی ضرورت شدید تر ہو چکی ہے، مگر جو رقم حکومت نے تمہاری حفاظت کے نام پر وصول کی تھی وہ حفاظت کے خطرہ میں پڑ جانے کے بعد اسی طرح تمہاری طرف لوٹا دینی ضروری ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ شاید ہم اب اس حفاظت کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔ اس لئے جنگ کی ضروریات کو ناجائز دولت سے پورا نہیں کیا جا سکتا!"۔

"قسم ہے تورات کی!"۔ یہودیوں نے جذبات کی شدت میں فلک شگاف نعرہ لگایا" تمہاری عادلانہ حکومت ہم کو اپنی قدیم ظالمانہ حکومت سے بدرجہا پسند ہے۔ ہم آج تمہارے دوش بدوش ہرقل کی افواج سے معرکہ آرا ہوئے بغیر نہ رہیں گے اور اپنے خون کے آخری قطرہ تک دشمن کی افواج کو حمص میں داخل نہ ہونے دیں گے"۔

خیبر کی یہودی آبادی ہتھیار ڈالنے کے بعد مسلمانوں کے فاتحانہ داخلہ کی دھمک میں قتل و غارتگری کے نہ جانے کتنے بھیانک خواب دیکھ رہی تھی! وہ سب سوچ رہے تھے کہ طویل و خوں ریز مقابلہ کی سزا میں معلوم نہیں کہ کس قدر لرزہ خیز مظالم کا طوفان امنڈا آرہا ہے۔

یہی وہ موڑ تھا جہاں زمین کی تاریخ میں دشمن کے فوجی دفاع کی دیوار ڈھانے کے بعد فاتح "انسان" ظلم و بربریت کے بدترین درندے میں تبدیل ہوتا آیا ہے۔ جہاں مفتوح قوم اور شکست کھائی ہوئی آبادیاں خوف و ہراس سے زرد اور سیاہ ہو کر انسانیت سے آخری مایوسی کا اظہار کرتی ہیں۔ جہاں بیمار، بوڑھے، عورتیں اور بچے اندھا دھند بمباریوں اور سنگساریوں کی زد میں لڑکھڑا کر دم توڑتے ہیں۔ جہاں فصلیں اور سبزہ زار شعلوں کی بوچھاڑ اور دھوئیں کے بادلوں میں جھلس کر غائب ہو جاتے ہیں

جب مویشی عالم وحشت میں بھاگتے پھرتے ہیں اور طائر چیخ چلاتے ہوئے آشیانوں سے دور اڑتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ فتح کے نشہ سے بدمست "انسان" پاگلوں کی طرح چنگھاڑتا اور آبادیوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا ہوا بڑھتا چلا آرہا ہے۔

لیکن خیبر کی زمین نے پہلی بار محسوس کیا کہ خاک کے فرش پر مٹی کا انسان فتح وظفر کے بعد سر جھکائے ہوئے عجز و نیاز کے قدم اٹھا رہا ہے اس کے قدموں میں وحشیانہ اور مغرور دھمک کی جگہ ایک مقدس افتادگی کی ادائیں ہیں۔ آنکھوں میں خوں آشامی کی عقابی چمک کی جگہ ایک لطیف نور ہویدا ہے۔ "دشمن" کے ہاتھوں میں ننگی تلواروں کی جگہ بے گناہوں کے لئے محبت اور انسانیت کا گرم گرم لمس بیتاب ہے۔ شکست خوردہ قوم نے دیکھا کہ ان کے اندیشوں کے برعکس امن و عافیت، رحم و کرم اور شرافت و انسانیت کا ایک سیلِ سبک رو ہے جو سلامتی کا پیغام لئے چلا آرہا ہے اور اس کی موجوں میں فاتحوں جیسی خوں آشامی، درندگی، ہوس اور بیرحمی کا جوش نہیں بلکہ درگذر، نرمی، عفت اور پاکبازی کا مقدس حسن و جمال ہے۔ یہ انسانیت کا وہ حسن و جمال تھا جو ایک رسولؐ کے بشرے سے ابل رہا تھا اور مجاہدین کا ہر قدم اس کی نورانی روشنی میں آگے اٹھ رہا تھا فوجوں کی کمان کرنے والا "انسان" دل میں فاتحانہ لوٹ مار کی امنگوں کے عوض اپنی بلند و بالا پیشانی پر مفتوح قوم کی حفاظت کے لئے فکر و احساس کی گہری شکنیں اجاگر کئے ہوئے آرہا تھا۔

کمزوروں نے اپنی آنکھوں سے پہلی بار اس "غیبی طاقت" کا مظاہرہ دیکھا جس کے آگے ظلم و بربریت کا ہر سرکش جذبہ سرنگوں ہو جاتا ہے۔

عقیدت و تاثر کی شدت سے خیبر کے در و دیوار سکتہ کے عالم میں تھے۔
—— خوف و ہراس کی تاریکی چھٹنی شروع ہوئی اور مفتوحین کے بدحواس چہروں پر اطمینان و سکون کی وہ روشنی نمودار ہوئی جو روح کی گہرائیوں سے ابل کر آ رہی تھی۔ مقابلہ اور جنگ سے جھلسی ہوئی آبادیوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی شکست کس قدر حسین اور پرسکون ہے! شکست خوردہ یہودی سردار اب خفیہ پناہ گاہوں کے گوشے گوشے سے باہر نکل آئے اور فاتح کمانڈر کے روبرو کھڑے ہو کر مسلمانوں کے کردار کا امتحان لے رہا تھا ہارا ہوا انسان فاتح کے آگے ایک گستاخانہ جرأت اور بیباکی کے ساتھ اپنی حفاظت کا مطالبہ پیش کر رہا تھا۔ انسانیت پر اعتماد کا کیسا رقت انگیز منظر تاریخ کے افق پر صدیوں کے بعد طلوع ہو رہا تھا!۔

اور —— اس پر شور فتح کا غرور حرکت میں نہیں آیا۔ تلواروں نے انسانی خون نہیں پیا۔ انتقام کے نعرے بلند نہ ہوئے بلکہ رسول کریمؐ کے ایک اعلان پر مجاہدین کی فوج خدا کے آگے سجدۂ نیاز اور ادائے نماز کے لئے فی الفور جمع ہو گئی۔ دشمن کا غرور توڑ دینے والوں کا سر فرش خاک پر جھکا ہوا تھا۔ اور زمین کو دہلا دینے کی طاقت رکھنے والے قدم وہاں رکے ہوئے تھے۔ جہاں خشوع و خضوع اور عجز و افتادگی کی حدیں ختم ہوتی ہیں
—— اور جب خیبر اس شان سے فتح ہوا تو جسم ہی نہیں بلکہ غیر مسلم آبادی کے قلوب بھی اسلامی پرچم کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ فاتح کے دوش بدوش مفتوح قوم کے ہونٹوں پر بھی دلفریب تبسم کھیل رہا تھا جنگ اور امن۔ فتح اور شکست۔ مشرق اور مغرب دونوں مل گئے تھے
—— اب مفتوح قوم کے حوصلے اور زیادہ بلند ہوئے —— حقوق کے

مطالبات کی آواز میں انسانیت پر کلی اعتماد کا یقین ایک قدم آگے بڑھا۔ "ہماری زمینیں ہم کو واپس دیدی جائیں!" یہ شکست خوردہ فریق کا فاتح افواج سے دوسرا مطالبہ تھا" اس لئے کہ ہم تم لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر طور پر ان کھیتوں کی کاشت کر سکتے ہیں۔ پھر جو کچھ پیدا ہوگا وہ سب تمہارا نہ ہوگا بلکہ نصف تمہارا نصف ہمارا"۔

تاریخ کہتی ہے کہ یہ مطالبہ بھی منظور کر لیا گیا ——— اور انسانی حقوق کا پیار عملی طور پر طے کر دیا گیا۔ اور پھر جب پہلی فصل کے دو برابر نصف حصے کر کے اسلامی حکومت کے نمائندے حضرت ابن رواحہؓ نے یہودی قوم کے سامنے یہ اعلان کیا کہ" لو! جو حصہ تمہیں پسند ہو اٹھا کر لیجاؤ۔ اور جو ناپسند ہو وہ ہمیں دیدو ——— تو یہودی قوم احساس ممنونیت سے لرزہ براندام ہو کر چیخ اٹھی" خدا کی قسم! اسی انصاف کے دم سے آسمان و زمین اپنی جگہ پر قائم ہیں!"۔

لیکن آج دنیا کو انصاف، نکوکاری اور انسانیت کا درس دینے والی اسی مقدس قوم کا اخلاق دنیا کے لئے درس عبرت ہے۔ ایسا درس عبرت جس کا حق خون کے آنسو بھی ادا نہیں کر سکتے۔

سیاسی معاہدہ اور اخلاقی پاس عہد

"آج شاید وہ آزادی کی خوش قسمت ساعت کفار کے قہر و غضب کو عبور کر کے مظلومیت تک آپہونچی ہے جب میں بھی مکہ کی قید و بند کی تباہ کاریوں سے نکل کر مدینہ کی طرف اپنے بھائیوں تک پرواز کر سکونگا" حضرت ابو جندلؓ نے زیر لب فرمایا اور قدموں کو گھائل کرنے والی بے رحم

زنجیروں پر حسرت سے نظر ڈالی جن کو ان کے غیر مسلم باپ نے بیٹے کے پاؤں میں صرف اس لئے جکڑ دیا تھا کہ وہ دین حق کیوں قبول کر چکا ہے اور اس کے لئے ساری دنیا کو ٹھکرا دینے کے لیے کیوں آمادہ ہو گیا ہے، وہ نہ جانے کب سے ہجرت کے بعد مدینہ کے اسلامی مرکز سے دور مکہ کے وسیع قید خانہ میں روح فرسا سزائیں جھیل رہے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ کب یہ آزمائش کی سیاہ رات ختم ہو گی۔ اور کب وہ کفر کی زنجیریں توڑ کر آزادی کی فضا میں سانس لیں گے اور اپنی پیشانی مدینہ کی مسجد کے فرش پر رکھ کر خدا کا شکر ادا کر سکیں گے۔

"آج رہائی کی کوشش کا بہترین موقعہ ہے" انھوں نے دل میں سوچا "اس لئے کہ میرا باپ مکہ کے ذمہ دار سرداروں کے ساتھ حدیبیہ گیا ہوا ہے جہاں مدینہ سے آیا ہوا مسلمانوں کا لشکر کفار مکہ کے ساتھ صلح کی شرائط طے کر رہا ہے"۔ یہ سوچ کر انھوں نے ایک سخت کشمکش کے بعد اپنے قدموں کو زنجیروں سے اس قدر آزاد کر لیا کہ وہ گرتے پڑتے حدیبیہ تک جا سکیں اور افتاں خیزاں اس منزل پر آ پہنچے جہاں مدت سے بچھڑے ہوئے مسلمان بھائی ان کی نظروں کے سامنے کافی تعداد میں موجود تھے وہ انسان جو خاندانی عزیز و اقربا اور اپنے باپ کے لئے مذہب تبدیل کرتے ہی اجنبی اور دشمن ہو گیا تھا۔ اب ان سیکڑوں انسانوں کو اتنے پاس دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ جو سچ مچ اس کے تھے۔ جن کے جسم میں خواہ کوئی سا خون گردش کر رہا ہو مگر ان کی روحوں میں باہمی محبت و تعلق کا وہ سوز موجود تھا جس میں ان کے قلب ایک دوسرے کے لئے پگھل کر رہ گئے تھے ابو جندلؓ نے اطمینان اور کامیابی کا ٹھنڈا سانس لیا۔ بے کسی کے پرانے

احساس میں نئی ملی جرأت اور حوصلے بل کھاتے ہوئے ابھر آئے! ——— ڈوبا ہوا دل خوشی کی شدت سے ہونٹوں پر ہنسی بن کر آگیا لیکن ——— وہ نہ جانتے تھے کہ آزادی اور رہائی کی جو منزل نظروں کے سامنے آگئی ہے ابھی ان کے پاؤں اس سے بہت دور ہیں! ——— اور جو مسرت بھری مسکراہٹ ان کے لبوں پر موجود ہے اس کے لئے ایک آخری قیمت ابھی اور دینی باقی ہے انھیں کیا خبر تھی کہ تعلق ایمانی سے بیتاب ہوکر وہ جب مسلمانوں کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرف لپکنا چاہیں گے ٹھیک اسی وقت معاہدہ حدیبیہ کی ایک اہم شرط ان کے درمیان حائل ہو جائے گی۔

"دیکھو مسلمانو میں آپہنچا ہوں" مسلمانوں نے یہ دلدوز آواز سنی، مڑ کر دیکھا ابو جندل ؓ بیڑیاں پہنے اور خون ٹپکاتے ہوئے گرتے پڑتے ان کی طرف آرہے تھے۔ فرط مسرت میں وہ اس وقت یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کا ظالم باپ بھی اسی جگہ کھڑا ہوا غیظ و غضب کے ساتھ یہ عجیب منظر دیکھ رہا ہے وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ مکہ میں سزاؤں کا دور کیسا جاں گداز تھا اور اس دور کی بیڑیاں اب بھی ان کی رفتار کو روکنے کے لئے بھرا ٹھتے قدم پر زخم پر زخم لگائے جا رہی ہیں۔

کوئی نہیں جانتا کہ رسول کریم ؐ کے دل پر اس منظر سے کیا گذری اور مسلمانوں نے کیا کچھ محسوس کیا! جوش، محبت اور غیرت ایمانی کا تقاضا تھا کہ مسلمان قیدی کو ان زنجیروں سے آزاد کر کے کفار کے چنگل سے چھین لیا جائے۔ اور ظالموں کو اسی طرح گھائل کر کے واپس کیا جائے۔ مگر معاہدہ حدیبیہ کی وہ شرط اس بلند تر اور لطیف تر اصول کا مطالبہ کر رہی تھی جس کو ایسے جذبات کے لہو سے ڈھالا جاتا ہے جس کا نام اخلاقی زبان میں پاس عہد اور ایفائے وعدہ ہے!۔

اور آخر کار جب کفار پر مسلمانوں اور رسول کریمؐ کی کوئی درخواست کارگر نہ ہوئی بلکہ انھوں نے ایک نئی درشتی اور سختی کے ساتھ معاہدہ کی اس شرط پر عمل کا مطالبہ جاری رکھا تو رسول کریمؐ نے ابو جندلؓ کو تسکین دے کر پھر اسی شہر بلا کی طرف واپس کر دیا " تمہارے لئے اللہ کوئی راہ نکالے گا "

خود غرضی اور منافقت کی ماری ہوئی یہ دنیا یہ تصور کرنے سے بھی معذور ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس وقت کتنا عزیز رکھتا تھا. اس روحانی اور قلبی محبت کے جذبۂ بیتاب کو جہاں خون ریز تلواروں کی بھیڑ ابو جندلؓ کی واپسی کو منظور نہ کرا سکتی تھی وہاں کاغذ کے چند لفظوں میں سمٹی ہوئی معاہدہ کی ایک شرط نے تڑپتے ہوئے قلوب کی دھڑکن کو حد سے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا. جذبات کی پرجوش یورش اخلاقی اصول تک آکر برضا ؤ رغبت لوٹ گئی. پھر سب سے بڑا وہ ایثار تھا جو اس بے کس قیدی نے پیش کیا جو اپنے ہم مذہبوں کے پاس آکر ان کے ذریعہ پھر کفار کے ہاتھوں میں اخلاقی عہد کے نام پر واپس کیا جا رہا تھا۔ اس نئی ابتلا سے بچنے کے لئے ان کے پاس ایک ہی راہ تھی اور وہ یہ کہ مسلمانوں سے بیزار ہو کر دین سے بغاوت کر دیں اور کفر سے خاطر خواہ انعام حاصل کریں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ قیدی نے واپس جاتے ہوئے جس قدر شدید بیچارگی محسوس کی دین حق پر اس کا ایمان اتنا ہی اور مستحکم اور اٹل ہو گیا. وہ جانتا تھا کہ واپس کرنے والے اس کو واپس لینے کے لئے کس درجہ بیتاب ہیں مگر ایک سیاسی معاہدہ اخلاقی قوت کو آزما رہا ہے. اور وہ سب خونِ دل جگر دے کر اس آزمائش میں کامیاب ہوئے۔

لیکن آج جب کہ سیاست کے اصول ہی اس بنیاد پر ڈھالے گئے ہیں کہ ہر مفاد حق ہے خواہ کتنا ہی بڑا جھوٹ کیوں نہ ہو اور مفاد کے خلاف ہر چیز جھوٹ اور باطل ہے خواہ وہ کتنی ہی بڑی سچائی کیوں نہ ہو۔ آج کون ہے جو سیاست کو حق پسندی کا یہ کھویا ہوا کردار عطا کرے ۔۔ دنیا کے نقشہ میں بکھرے ہوئے کتنے مسلم ممالک وقت کی اس آواز کو سننا بھی گوارا کر سکتے ہیں ۔۔۔۔ عمل کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ سوچئے کتنی ذلیل پستیوں میں گر جانے کے باوجود ہم اسلام سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہم کو "مسلمان" ہی سمجھا جائے۔

ایمان ۔۔۔ امید و بیم کا سنگم

کیسی قاتلانہ بھول ہے یہ!

خدا نے انسان کو دو آنکھیں عطا فرمائیں تاکہ وہ رحمت اور جلال دونوں کو دیکھ سکے، مگر وہ صرف "ایک آنکھ" سے دیکھتا ہے۔ کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز پر جب سیکڑوں مناظر اور ہزاروں واقعات وقت کی تیز ترین رفتار پر گردش کرتے ہوئے گذرتے ہیں تو ہماری نگاہ ان کا صرف روشن رخ دیکھ کر رہ جاتی ہے مگر ان کا دوسرا مہیب اور تاریک پہلو ہماری عبرت پذیری کی دوسری آنکھ سے اکثر اوجھل ہی رہتا ہے زندگی اور کائنات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ذروں سے ستاروں تک خدا کی وہ بیکراں رحمت تو دکھائی دیتی ہے جس نے پورے نظام کائنات کو نورانی ہالے میں گھیر رکھا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ اس حسین ترین تصویر کا دوسرا رخ کیا ہوگا؟ اور جو بلند ترین طاقت اس قدر عظیم الشان

رحم و کرم کا مظاہرہ کر رہی ہے اس کے قہر و جلال کی شان کیسی ہوشربا اور کائنات سوز ہوگی!۔

خدا کے جمال اور جلال، رحمت اور قہر دونوں ہی کے مناظر ہماری شکر و عبرت اور امید و خوف کی دونوں آنکھوں کو زمین و آسمان کے مابین ہر لمحہ فکر و نظر کے لئے آواز دے رہے ہیں۔ زمین کی جس سرسبز و شاداب سطح پر پاؤں رکھے ہوئے ہم دلفریب بہاروں کے قافلے گذرتے ہوئے دیکھتے ہیں اسی کی تہہ میں آتشیں زلزلوں کی طوفانی موج بھی خدا کے ایک اشارے کی ہر لمحہ منتظر ہے جس سمندر سے اپنے دامن کو ہم جگمگاتے ہوئے بیش بہا موتیوں سے بھر کر کناروں پر پہنچتے ہیں اور جس کی سطح آب پر ہمارے جہاز اور سفینے دولت دنیا کا ساز و سامان لادے ہوئے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک کا فاصلہ طے کرتے ہیں وہیں غیض آلود طوفانوں کی گرج سوئی ہوئی ہے جس کی دیو ہیکل موجوں کے وحشیانہ تھپیڑے انسان کو اس کے ساز و سامان سمیت سمندر کی نامعلوم گہرائیوں میں دھکیل سکتے ہیں۔ جن ہواؤں کے ٹھنڈے اور خوشگوار جھونکوں سے ہماری زندگی تازہ دم ہوتی ہے ان ہی کی آڑ میں نہ جانے کتنی غارت گر آندھیاں ہماری گھات میں چلی آرہی ہیں جن اودی گھٹاؤں میں انسانوں کے احساسات کو برسات کی سرمستیاں محسوس ہوتی ہیں ان میں ہی پھونک ڈالنے والی بیرحم بجلیاں اور گرجتے ہوئے سیلاب کی چھنکار دبی ہوئی ہے۔ جس زندگی کے اعتماد پر مغرور ہو کر ہم انسانیت کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے نہیں ہچکچاتے اس کے سر پر ہر وقت موت کی تلوار لٹک رہی ہے۔ جس چاند اور سورج کی روشنی میں ہمارے دن رات جرم و گناہ کا کھیل کھیلتے ہیں، ان کی زرکار شعاعوں کی پشت پر جانے کتنے ہولناک

گہن مجتمع ہیں۔ پوری کائنات بتا رہی ہے کہ ساری کائنات کی موت کا آخری لمحہ "روزِ حشر" کا فلک شگاف ہنگامہ اٹھائے ہوئے ہر ساعت ہر لحظہ اس دنیا کے نزدیک تر آتا جا رہا ہے۔

اور پھر موت اور قیامت کے اس پار "آخرت" کی جو لامتناہی دنیا شروع ہوتی ہے اس کے دونوں کناروں پر بھی خدا کے جمال و جلال کے دونوں مناظر جنّت اور جہنّم کی شکل میں نوعِ انسانی کے منتظر ہیں۔ اس زمین پر کھڑا ہو کر جب ایک انسان دنیا میں امید اور خوف کے مناظر کی راہ سے ان دو آنے والی دنیاؤں کا تصوّر کرتا ہے تو غیب کے پردے میں چھپی ہوئی یہ دو بے پناہ حقیقتیں اس کے ایمان و یقین پر چھاتی چلی جاتی ہیں اور دنیا کی پوری زندگی آخرت کی بیکراں وسعتوں میں ذرہ کی طرح گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ وقت کا سیلاب انسانی زندگی کو موت کے اس پار جس انجانی منزل کی طرف بہائے لئے جا رہا ہے کبھی اس کا "ایمان" بھی اسی سمت میں تیز گام تھا۔ تیرہ سو سال پہلے کے وہ انسان جنّت کے اس حسین تصور میں ڈوب کر زمین کے خارزاروں سے آبلہ پا ہو کر بھی روحانی سرور کے عالم میں گذرتے تھے اور جہنم کے آہن گداز شعلوں کے خیال سے دنیا کے بہترین راحت و آرام کی آغوش میں بھی اس طرح تڑپتے تھے جیسے کوئی انگاروں اور کانٹوں کے بستر پر پڑا ہو۔ اس زندگی کے ہر افق پر خدا کے جمال اور جلال کی جھلک دیکھ کر وہ آخرت کے غیبی حقائق پر اپنا ایمان تازہ کرتے تھے۔ وہ ایمان جو ان کے قلب و ضمیر کی کسی ویران گہرائی میں موت کی نیند نہیں سو رہا تھا بلکہ زندگی کے ہر سانس میں اس کی آنچ دہک رہی تھی۔ وہ ایک ایسی روشن چنگاری کی طرح ان کی روح میں موجود تھا جس نے

ان کے سارے وجود کو پگھلا ڈالا تھا، اس آگ کو وہ کبھی دن کے ہنگامہ زار میں اپنے خون پسینہ سے سرد کرتے تھے تو کبھی راتوں کے سنّاٹے میں جا نماز پر ٹپکنے والے آنسوؤں اور درد بھری سسکیوں اور ہچکیوں سے! مگر وہ آگ کسی طرح نہ بجھتی تھی۔ وہ مجاہدانہ خون پسینہ کی نمی آنسوؤں کی نمی سے کچھ اور ملتہب اور روشن ہو جاتی تھی۔ ان کی امید اور خوف کی دونوں کھلی ہوئی آنکھیں زمین و آسمان کے درمیان ہر واقعہ اور ہر منظر کو حیرت و عبرت سے تکتی ہوئیں ان دو عظیم اور لافانی دنیاؤں پر مرکوز تھیں جو جنّت و جہنّم کی صورت میں ایمان و یقین سے انتہائی نزدیک اور جسم و جاں سے نامعلوم فاصلوں پر موجود ہیں۔ آخرت کے ایمان پر ان کی امید کا یہ عالم تھا کہ دنیا کے تمام سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر بے خوف و خطر میدان جہاد میں کود کر تلواروں کی دھار پر اپنی مقدس گردنیں رکھ دیتے تھے مگر ان کے "خوف" کی یہ شان تھی کہ خدا کی راہ میں نقد جان پیش کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ زندگی کا حق ادا نہیں ہوا۔ خدا کے جمال اور اس کی رحمت کے تصور میں ان کی زندگی کا ہر لمحہ ایک سجدۂ عقیدت اور نیاز عبدیت تھا مگر اس کے قہر و جلال کے لئے ان کی روح پر لرزہ طاری رہتا تھا ——— ساری زندگی اور پوری کائنات ان کی نظر میں خدا کے اسی جمال و جلال کا مظہر اور خاموش اشارہ تھی جس کی انتہائی مکمل شکل کا نام جنّت اور جہنّم ہے۔ پھر یہ ایمان اور حسن عمل جس قدر بلند ہوتا تھا یہ امید اور خوف کی شان بھی اتنی ہی بلند و نمایاں ہوتی جاتی تھی۔ وہ خدا کے جس قدر قریب ہوتے تھے اتنی ہی عبودیت اور بندگی کی کیفیات اجاگر ہوتی چلی جاتی تھیں۔

جب کبھی آسمان کے کناروں سے آندھیاں اور برق و باد کے طوفان

نمایاں ہوتے تھے تو دنیا کے سب سے بلند اور خدا کے آخری رسول کے چہرے پر خوف و اضطراب کے آثار واضح طور پر دیکھے جاتے تھے ایک شدید خطرہ کا احساس لئے ہوئے آپ ادھر سے ادھر تیز قدم اٹھانے لگتے اور ہونٹوں پر دعائیں جاری ہو جاتی تھیں۔

"اے خدا کے رسول!" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک بار سوال کیا" جب بادل آتے ہیں تو لوگ یہ سوچ کر خوش ہوتے ہیں کہ اب بارش ہونے والی ہے جو دنیا کو سیراب کر دے گی مگر آپ ابر و باد کو دیکھ کر فکر و اضطراب محسوس فرماتے ہیں"!۔

"مجھے یہ کیسے اطمینان ہو سکتا ہے" رسول کریمؐ نے حضرت عائشہؓ کے سوال کا جواب دیا کہ" ان بادلوں اور ہواؤں میں رحمت ہے عذاب نہیں ——— کیا تم نہیں جانتیں کہ قوم عاد کو ہوا کے ذریعہ ہی عذاب میں مبتلا کیا گیا تھا۔ جب بادل ان کی بستیوں پر امنڈ کر آئے تو وہ خوش ہوئے تھے کہ یہ ابر ہمارے لئے ٹھنڈا پانی برسائے گا حالانکہ وہ عذاب لئے ہوئے آرہا تھا"۔

قوم عاد کے سر پر جب عذاب الٰہی منڈلاتا ہوا آیا تو انھوں نے بھی زندگی اور کائنات کو امید کی ایک آنکھ سے دیکھا تھا اور خوف و عبرت کی دوسری آنکھ بند کر لی تھی۔ لیکن آج اسی زمین کی سطح پر ان کی عذاب رسیدہ آبادیوں کے کھنڈر عبرت پذیری کی آنکھ کھولے ہوئے خدا کے قہر و جلال کا وہ منظر دیکھ اور دکھا رہے ہیں جس کو قوم عاد نے دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

رسول کریمؐ کی زندگی میں ایک بار سورج گرہن ہوا۔ کاروبار میں مصروف انسان اور کھیل کود میں مشغول بچے آپ کے قریب میں جمع ہونے لگے۔ آپؐ کے

مقدس چہرے پر خوف و اضطراب کے گہرے آثار دیکھ کر وہ سب سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے؟ - آخر نماز کسوف کے لئے صفیں درست کی گئیں اور آپ نے اس قدر طویل قیام کیا کہ لوگ غش کھا کر گرنے لگے - مگر رسولِ کریمؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہونٹوں پر یہ الفاظ تھے کہ "اے رب! کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ آپ میرے موجود ہوتے ہوئے ان لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہ فرمائیں گے اور ایسی حالت میں جبکہ وہ گناہوں سے آپ کی پناہ ڈھونڈھ رہے ہوں ان پر قہر و عذاب نازل نہ کیا جائے گا۔"

"اے مسلمانو ؟" پھر آپؐ نے نماز کے بعد حاضرین کو خطاب فرماتے ہوئے درد بھری آواز میں ارشاد فرمایا تھا - تم جب کبھی ایسے مناظر دیکھو تو گھبرا کر نماز کی طرف متوجہ ہو جایا کرو۔ میں جو آخرت کے حالات دیکھ رہا ہوں اگر تم کو ان کی خبر ہو جائے تو ہنسو کم اور روؤ زیادہ ——— جب کبھی ایسی حالت پیش آئے تو نماز پڑھو ——— دعا مانگو اور صدقات دو۔"

اور پھر ایک رات آئی جو خدا کے آخری رسولؐ نے اپنی امت اور نوعِ انسان کے لئے خدا کے حضور میں روتے ہوئے گذار دی - قرآن کی یہ آیت تلاوت کرتے کرتے آپؐ پر گریہ طاری تھا اور تمام رات یہ دردناک منظر دیکھتے ہوئے گذرتی چلی گئی "اگر تو ان پر عذاب نازل کر دے تو تجھے اختیار حاصل ہے کہ یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے تو تو زبردست قدرت و حکمت کا مالک ہے"۔

حضرت انسؓ کی زندگی میں ایکبار ابر و باد کی وجہ سے دن میں رات کی سی تاریکی چھا گئی - حضرت خضر بن عبداللہ نے عرض کیا کہ "رسول کریمؐ کی زندگی میں بھی ایسی چیزیں پیش آتی تھیں"؟ -

"خدا کی پناہ!" انھوں نے جواب دیا "حضور کے زمانہ میں تو اگر ہوا ذرا بھی تیز ہو جاتی تھی تو صحابہ پر خوف قیامت طاری ہو جاتا اور لوگ خوف و ہراس کے عالم میں تمام کاموں کو چھوڑ کر مسجدوں کی طرف دوڑ جاتے تھے"۔

—— اور اب جب کہ حضور کا وہ زمانہ جس کو حضرت انسؓ کی آنکھ نے دیکھا تھا ہم سب کی آنکھوں سے صدیوں کے فاصلے پر جا کر چھپ گیا ہے جیسے اس کے ساتھ آخرت، قیامت، جنت اور جہنم کی ابدی حقیقتیں بھی ایمان کی نگاہ سے روپوش سی ہو گئی ہیں۔ دنیا میں آج گرجتے ہوئے مانسون ابھرتے ہیں، پرشور آندھیاں آتی ہیں، چاند سورج پر گرہن لگتے ہیں۔ بھوک، بیماری اور جنگ کے سیکڑوں "خوف" سر اٹھا کر انسانیت کی طرف دیکھتے ہیں مگر ان کی وہ "آنکھ" بند ہی رہتی ہے جس سے خدا کے جلال و جبروت کی جھلک اسی دنیا کے پردے پر نظر آیا کرتی تھی، آج کے یہ سب مناظر اور حادثے قوم عاد و ثمود پر نازل شدہ قہر و عذاب کا نمونہ سہی مگر ان کو دیکھ کر ہم پر وہی بے حسی اور بے خبری ضرور طاری ہے جو ان عذاب رسیدہ اقوام کی طبیعتوں میں راسخ ہو چکی تھی۔ عذاب رسیدہ قوموں کے احساسات سے ہماری یہ عملی مشابہت بجائے خود آثار عذاب میں سے ایک بنیادی چیز ہے۔ کس قدر مخدوش، المناک اور خطرناک ہے یہ علامت! کون جانے کہ یہ کس تباہی کا نشان اور کس زوال کا پیش خیمہ ہے! —— کاش اسی نشان اور علامت کا جھٹکا ہماری خوف و خشیت کی تاریک آنکھ میں ایمان و یقین کی بصارت کو جگا سکے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ اس کرۂ ارض کے ان دس خوش نصیب انسانوں میں سے ایک تھے جن کو سب سے پہلے قبول حق کے انعام میں جیتے جی

جنت کی خوشخبری سنادی گئی تھی۔ اور اس بلند ترین بشرؐ نے سنائی تھی جسنے کبھی اپنی زندگی میں "جھوٹ" نہیں بولا ـــــــ جس کو اس کے جانی دشمن اور قاتلانہ حسد رکھنے والے بدنصیب ظالم بھی "امین" کے لفظ سے پکارتے تھے۔ صدیق اکبرؓ کو اس عظیم ترین بشارت پر یقین کی پوری قوت کے ساتھ یقین تھا۔ مگر خدا کی رحمت کے اس عظیم الشان منظر کو دیکھتے ہوئے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خدا کا جلال کتنی زبردست حقیقت ہے۔ وہ بھی امید اور خوف کے درمیان پوری شان عجز و سرافگندگی کے عالم میں اس نازک ترین ساعت کے تصور سے لرزہ براندام رہتے تھے جب انسان کی تقدیر کا آخری فیصلہ بارگاہ ذوالجلال سے صادر ہونے والا ہے ـــــــ جہاں سے انسان زمین کے تمام دلفریب ہنگامہ زاروں سے دور ـــــــ بہت دور ـــــــ آخری فلاح و کامیابی یا بدترین حسرت و ناکامی کی طرف مڑنے والا ہے ـــــــ جہاں خدا کے سوا کوئی پناہ نہیں ـــــــ جہاں عمل خیر کے سوا کوئی سہارا نہیں اور جہاں ایمان و یقین کی دولت کے سوا کوئی ساتھی نہیں ـــــــ جہاں انسان کا جسم بھی اس کا ساتھ چھوڑ چکا ہوگا ـــــــ جہاں انسان پہلی بار اپنا بار حیات ڈھونے کے لئے جنت و جہنم کے درمیان تن تنہا کھڑا ہوا ہوگا۔

باغ کی ایک ٹہنی پر ایک معصوم پرندہ چہچہا رہا تھا ـــــــ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اس کی سُریلی آواز سنی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا "کاش! ابوبکر بھی تجھ جیسا ہوتا! آہ! آخرت کی باز پرس اور روز حشر کے مواخذہ کے خوف سے تو بالکل آزاد ہے! ـــــــ کس قدر لطف و سکون سے تو کھاتا پیتا ہے اور درختوں کے خوشگوار سائے میں ایک شاخ سے دوسری

شاخ پر پھدکتا پھرتا ہے"!۔

لیکن آج وہ مسلمان جس کو روز عظیم کے زلزلۂ محشر کا یقین ہے اور اس دردناک وقت کی نزاکتوں پر ایمان رکھتا ہے۔ اپنی تمام ترسیہ کاریوں پر اس نادان و معصوم طائر سے کہیں زیادہ مواخذۂ قیامت سے بے فکر ہے ——— وہ بھی آخرت کے ان تمام خوفناک مراحل پر ایمان رکھتا ہے جن پر ابوبکرؓ کا ایمان تھا۔ مگر اس کی بے خبری اور بے فکری پر شاخوں پر پھدکنے والے پرندے چیخ مارتے ہیں۔ اور اس کی روح سے جانوروں اور بہائم کی روح بھی پناہ مانگتی ہے یہ معصوم طائر اور بے عقل جانور بھی زمین و آسمان کی آواز سے آواز ملائے ہوئے اپنے خالق کی حمد و ثنا کا ترانہ الاپ رہے ہیں۔ مگر یہ انسان اپنی بھوک کو آسودہ کر کے اس بھوکی آگ کو بھلائے ہوئے ہے جو قیامت کے دن کروڑوں انسانوں کو نگل جانے کے بعد بھی ہل من مزید کا نعرہ لگاتی رہے گی۔ وہ آپ سر دچڑھاتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے نہیں سوچتا کہ میدان حشر میں زہرہ گداز دھوپ کے شعلے پانی کے تمام سرچشموں کو گرم بھاپ بنا کر اڑا دیں گے اور وہ جلتے ہوئے پسینہ کے سمندر میں ڈوب کر بھی پیاس کی شدت سے اپنے حلقوم اور زبان پر تشنگی کے کانٹوں اور شعلوں کے سوا کچھ نہ پائے گا۔ آہ یہ بےخبری، بے حسی اور بے بصری! جس کے بعد کوئی بے بصری نہیں! اف یہ خودکشی کا ہولناک منظر جہاں جسم کے ساتھ روح بھی لہولہان ہو کر رہ گئی ہے۔

حضرت عمرؓ ابن خطاب جو عرب کے آہنی انسان تھے اسلام کی حلقہ بگوشی سے پہلے ان کے قلب کی سختی اور ان کے بہادرانہ مزاج کی درشتی سے ریگستان کے وحشی بدو بھی تھر تھر کانپتے تھے۔ قبول حق سے پہلے جب تک ایمان و یقین کی روشنی سے انکو خدا کے جمال و جلال کا عرفان حاصل نہ ہوا تھا۔ ان کی خشمگیں شجاعت

خوف اور رحم کے نام سے واقف نہ تھی۔ یہ وہی تھے جنھوں نے اسلام کی آواز کو ہمیشہ کے لئے خاموش کرنے کے لئے رسول کریمؐ کو شہید کرنے کے خیال سے اپنی تلوار نیام سے نکالی تھی اور راہ میں اپنی عزیزہ بہن کی نازک پشت پر غیض کے عالم میں تازیانوں کی بوچھار کر ڈالی تھی ——— مگر جب اسلام کی صداقت ان کے روح وضمیر پر طلوع ہوئی تو خدا کے جمال وجلال کا مشاہدہ کرنے کے لئے ان کی امید اور خوف کی دونوں آنکھیں جذبات کی اس عمیق شدت کے ساتھ کھلیں کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا آخرت کے مواخذہ کا خوف ان پر اس طرح طاری ہوا کہ قلب کی ساری آہنی سختی گریۂ وبکا میں پگھل کر آنسو بن گئی اور اگر ان کو دنیا ہی میں مغفرت وجنت کی نوید نہ سنائی جاتی تو یقین تھا کہ زلزلۂ محشر کے دن کی دار وگیر کا خوف ان کو ہلاک ہی کر ڈالتا۔ اس مژدۂ مغفرت کے باوجود خدا کے جلال وجبروت اور انسانی نارسائیوں اور فروگذاشتوں کے تصور سے بیقرار ہو کر وہ زمین کے حقیر ذرّوں کے وجود کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے اور اپنی مٹھی میں خاک کے ذرّے اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ "تم کتنے اچھے ہو کہ تمہیں مواخذۂ عاقبت کا درد جانگداز لاحق نہیں"! —— عجز ونیاز اور تسلیم ورضا کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود ان کو اپنی ہستی زمین کے دوش پر بار گراں محسوس ہوتی تھی اور اس روح فرسا کرب سے تڑپ کر وہ کبھی چلا اٹھتے تھے کہ "اے کاش میری ماں نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا!"

"اگر قیامت کے دن یہ آواز آئے" ایکبار انھوں نے مومن کی امید وخوف کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا کہ "سوائے ایک انسان کے سب کی مغفرت

ہوگی تو میں سمجھوں گا کہ وہ بدنصیب ہستی میں ہی ہوں ——— اور اگر میدانِ حشر میں یہ آواز سنائی دے کہ ایک فرد کے سوا سب کو جہنم میں بھیجدیا جائے تو میں خدا کی رحمت سے یہ توقع کروں گا کہ وہ خوش قسمت انسان میرے سوا کوئی نہیں" ——— بیم ورجا کی دو متضاد انتہاؤں کو اس جامعیت اور خوبصورتی سے واضح کرنے کی مثال دنیا کے ادب میں شاید ہی مل سکے

امید وخوف کی یہ ایمان بھری قوت رکھنے والے اپنے رب سے جا ملے لیکن ہمارے سامنے زندگی کی یہ منزل سر ہونی باقی ہے۔ موت، قبر کی تنہائی، میدانِ حشر، آخرت کی دار وگیر اور جنت و جہنم سب ہمارے انتظار میں ہیں مگر ہمیں جیسے ان میں سے کسی کا انتظار نہیں۔

"قبر" ——— حیات انسانی کے بعد موت کی پہلی سخت ترین منزل ——— وہ برابر نوع انسانی کا انتظار کر رہی ہے۔ اس پر کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب اس کی ویران گہرائیاں یہ آواز نہ دیتی ہوں کہ "میں بیگانگی کا گھر ہوں ——— مٹی کا گھر ہوں" ——— پھر جب کوئی مومن قبر کی آغوش میں اتار دیا جاتا ہے تو وہ کہتی ہے "مبارک ہے تری آمد! بہت اچھا کیا کہ تو آگیا! ——— جتنے انسان زمین پر چلتے تھے تو ہی ان سب میں مجھے زیادہ محبوب تھا ——— آج جب کہ تو کشاں کشاں میرے پاس آگیا ہے تو میرے بہترین سلوک کو دیکھے گا" ——— اس کے بعد قبر کی تنگ زمین پھیلتی ہے اور صاحب قبر کی حد نظر تک پھیلتی چلی جاتی ہے اور اس کی دیواروں سے ایک خوبصورت دروازہ کھلتا ہے جس کی راہ سے فردوس بریں کی معطر خوشگوار ہواؤں کے جھونکے مرنے والے کا خیر مقدم کرنے کے لئے ان دیکھی دنیا سے قبر کی وادی میں پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی بدکردار

وجود اسی قبر کی گود میں پھینکا جاتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ "تیرا آنا منحوس ہے برا کیا جو تو آیا!۔ زمین پر جتنے آدمی چلتے پھرتے تھے ان سب میں میں تجھ سے ہی زیادہ نفرت کرتی تھی۔ آج تو میرے حوالہ ہوا ہے تو میرے سلوک کو بھی دیکھ!" ان الفاظ کے ساتھ وہ اس لاش کو اس طرح دباتی ہے کہ پسلیاں باہمدگر پیوست ہو جاتی ہیں اور بے شمار اژدہے اس کے سوراخوں سے ایسے نمودار ہوتے ہیں کہ اگر دنیا کو ان کے سانس کی گرمی پہنچ جائے تو تمام سبزہ زار جھلس کر سیاہ ہو جائیں ——— وہ اس کو ڈستے ہیں ——— ڈستے رہتے ہیں یہاں تک کہ قیامت کا ہنگامہ زار گرم نہ ہو جائے۔

"قبر" جو رسول کریمؐ کے الفاظ میں "جنت کا ایک باغ بھی ہے اور دوزخ کا ایک غار بھی" وہ ہماری عبرت پذیری کی آنکھ کے سامنے زندگی میں نہ جانے کتنی بار آتی ہے مگر ہم نہ اس کی آواز سنتے ہیں اور نہ "دوسری آنکھ" وا ہوتی ہے بلکہ وہی ایک بیجسی کی آنکھ پتھر کی طرح بے نور آنکھ سب کچھ دیکھتی رہتی ہے جس کو دیکھنے کے باوجود کچھ نظر نہیں آتا۔ شاید یہی وہ زندگی اور موت کے جاں گداز مراحل تھے جن کے تصور میں ڈوب کر حضرت ابن عمرؓ ہر وقت رویا کرتے تھے ——— گریۂ دیکا نے ان کی آنکھیں بے نور کر دی تھیں۔

"آخر تمہیں کیا ہوا ہے کہ روتے روتے اپنی جان گنوائے دیتے ہو؟"۔ کسی نے سوال کیا "زندگی میں ہنسنے کے لئے بھی بہت سی چیزیں موجود ہیں۔"

"میرے رونے پر تعجب کرنے والو!"۔ وہ تڑپ کر گویا ہوئے "اللہ کے خوف سے سورج روتا ہے ——— خدا کے جلال سے لرز کر چاند آنسو بہاتا ہے۔"

رسول کریمؐ کا گذر ایک ایسے نوجوان صحابی پر ہوا جو قرآن شریف کی

آیات تلاوت کر رہے تھے ۔ وہ جب " فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ وَرْدَۃً کَالدِّھَانِ " پر پہونچے تو بدن کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے — روتے روتے دم گھٹنے لگا —— " ہاں جس دن آسمان پھٹ جائینگے میرا کیا حال ہوگا ؟ —— ہائے میری بربادی !" یہ الفاظ ان کی زبان پر تڑپ رہے تھے اور ان کا یہ حال دیکھ کر خدا کا رسول ﷺ کہہ رہا تھا " اس انسان کے گریۂ دبکا کو دیکھ کر ملائکہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں " —— آج بھی فرشتے ہم جیسے انسانوں پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہوں گے کہ رینگنے والے انسانی جانوروں کو آسمان کے نیچے بدترین جرائم اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہوئے بھی کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ زمین ایک دن ہمارے قدموں کے نیچے سے ضرور کھسکنے والی ہے اور یہ آسمان یقیناً ایک دن پوری کائنات پر پھٹ کر گرنے والا ہے۔

خدا کے لئے خود اپنے ضمیر سے پوچھیے کہ " کیا ہم مسلمان " ہیں۔

زندگی آخری خطرے کے تصور میں

آدھی رات کی خاموش فضا میں زمین کی پرسوز ترین آواز آنسوؤں کا گداز لئے ہوئے مسجد گاہ سے بلند ہو رہی تھی —— دنیا کے سب سے پاکیزہ لمحات —— آخری پیغمبر کی نوائے درد ! —— " تجھے اختیار ہے اے معبود ! اگر تو انھیں مبتلائے عذاب کر دے کہ یہ تیرے ہی بندے ہیں اور —— اگر ان کو معاف کر دے تو تیری قدرت اور حکمت بے پناہ ہے "۔

الحاج دزاری اور گریۂ دگداز کے ناقابل تصور عالم میں قرآن کے

یہ ابدی الفاظ رسول آخرالزماںؐ کی مقدس زبان پر تڑپ رہے تھے
——— آہ وہ منظر کہ جس سے کائنات کی روح پر لرزہ طاری
ہو جائے۔ آج انسانی قلوب اس کے لئے پتھر سے زیادہ مردہ اور
برف سے زیادہ سرد ہو گئے قرآن کے پاکیزہ صفحات میں
ان دلدوز الفاظ کی گونج آج بھی زلزلہ محشر کا پیغام سنا رہی ہے
مگر اس کو سنکر ایمانی درد سے تڑپ اٹھنے والے انسان نجانے کہاں
گم ہیں! موت آج بھی انسانی لاشوں کو گھسیٹتی ہوئی اس اندھی گھاٹی
کی طرف لئے جا رہی ہے جس کی ہلاکتوں کا ہلکا سا تصور تمام دنیا کی
آسائشوں کو جلا کر راکھ کر دینے والا سوز چھپائے ہوئے ہے۔ جس کے
متعلق ہمیشہ "سچ" بولنے والے عربی رسولؐ نے صحابہؓ کو خطاب کرتے
ہوئے فرمایا تھا کہ "موت سے آگے کے جو بھیانک مناظر میری آنکھیں
دیکھ رہی ہیں اگر تمہیں نظر آ جائیں تو تمہاری ہنسی سلب ہو کر رہ جائے
اور تمہارے قہقہے آنسوؤں کے سیلاب میں دم توڑ دیں" ——— وہ
جس کی صداقت و امانت کا لوہا وہ بدنصیب، کور چشم کفار بھی مانتے
تھے۔ جن کو خدا کی عظیم ہستی تک نظر نہ آتی تھی رسالت کی بلندی سے یہ
الفاظ ادا کر رہا تھا اور صحن مسجد میں ان الفاظ کو سننے والے نہ جانے کونسی
دنیا دیکھ رہے تھے کہ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں، پھیپھڑے
پھٹنے لگے اور کلیجے منہ کو آ گئے۔

اگر رسالت ایک روشن سچائی ہے، اور اگر ان انسانی چیخوں کی
کہانی تاریخ کا زندہ واقعہ ہے تو کون ہے جو اس گلوگیر عذاب کو سینہ سے
لگانے کے لئے تیار ہے جس کے تصور سے دنیا کا ایک بلند ترین انسان

دوسروں کے غم میں رات بھر روتا رہا اور جس کے تذکرے نے سیکڑوں انسانوں کے ضبط کے بند پارہ پارہ کر دیئے تھے ؟ -

تاریخ کے پراسرار افق پر سیکڑوں انسانی چہرے ابھر رہے ہیں جنکے رخساروں پر آنسوؤں کی پیہم روانی نے سیاہ لکیریں کھینچدی ہیں ـــــــ جن کے دامن خود اپنے دل و جگر کے خون سے بھیگے ہوئے ہیں ـــــــ جنکی روشن آنکھوں میں آخرت کی دردناک پیکر کا یقین اور خدا کی رحمت و عفو پر ایمان، امید و خوف کا محشر جگائے ہوئے ہے ۔ آخرت کی محویت میں فاقوں سے نڈھال وجود ـــــــ خوف و خشیت کی تپش سے سرخ ہڈیاں ۔ جہاد زندگی کے کانٹوں میں آبلوں سے لدے ہوئے پاؤں ـــــــ نالۂ نیم شبی کی ہوک روح کی گہرائیوں سے امنڈتی اور ویران راتوں کو چیرتی ہوتی ـــــــ ان میں کوئی خواب آلود بستر سے اتر کر فرش زمین پر بچھی ہوئی جائے نماز پر سرنگوں ہے ـــــــ کوئی رکوع کی طویل کیفیات میں شل ہو کر رہ گیا ہے ـــــــ کوئی ہاتھ اٹھائے اور دامن پھیلائے ہوئے اپنے خدا سے نہ جانے کیا مانگ رہا ہے کہ دنیا کی لذت و سرور کے سارے طلسم ٹوٹتے جا رہے ہیں ۔ کوئی ابوبکرؓ شاخوں پر چہچہاتے والے طیور کی پرسکون آواز سن کر سرد آہیں بھرتے ہوئے اپنے آپ سے کہہ رہا ہے "اے کاش میں ایک طائر ہی ہوتا ! اور آخرت کے مواخذہ کے خوف سے میری روح کو نجات مل جاتی" ! ـــــــ کوئی عمرؓ ریت کے بے زبان حقیر ذروں کو سینہ سے لگائے رو رہا ہے اور ان کی قسمت پر رشک کر رہا ہے کہ زلزلۂ محشر کے دن ان کو جواب دہی کا خطرہ نہیں ۔ کوئی خبابؓ قبولِ اسلام کے نتیجہ میں جاں گداز ایذاؤں اور غزوات کے زخموں سے چھلنی جسم

لئے ہوئے بھی بستر مرگ پر بھی یہ سوچ کر اشک بار ہے کہ کہیں خدانخواستہ آخرت کے حصہ کی نعمتیں اسی دنیائے فانی میں تو نہیں مل گئیں اور اس طرح میدان قیامت میں کہیں میں خالی ہاتھ تو کھڑا نہ رہ جاؤں ــــــ کوئی عمرو بن العاصؓ جانکنی کے عالم میں اپنے بیٹے عبداللہ سے کہہ رہا ہے کہ "میری فتوحات کا نام نہ لو، میری تیر بازیوں اور جاں فشانیوں کے تذکرے بند کر دو ــــــ آہ کسے خبر ہے کہ مجھ سے توحید کے تقاضے کہاں تک پورے ہوئے ہیں اور خدائے ذوالجلال کے روبرو مجھے کس کیفیت میں پیش کیا جانے والا ہے؟" کوئی خلیفۂ وقت عمر ابن خطابؓ خدا کے رسولؐ کی زبانی بشارت مغفرت کے باوجود خدا کے قہر و جلال کے سامنے سراپا عجز و سرافگندگی بنکر چلا چلا کر کہہ رہا کہ "اگر میدانِ حشر میں یہ آواز آئی کہ پوری نوعِ انسانی بخشدی گئی، مگر صرف ایک آدمی جہنم میں جھونکنے کے لئے بچ گیا تو میں ڈروں گا کہ وہ بدنصیب میں ہی تو نہیں! ــــــ یہی وہ لوگ تھے جن میں دردِ آخرت کے آتش فشاں سوئے ہوئے تھے کہ اگر دنیا میں مغفرت کی بشارت نہ دی جاتی تو یقیناً یہ جوالا مکھی ان کو جیتے جی جھلاک کر ڈالتا ــــــ یوم حساب کو انسانی حقوق کے بار گراں سے سبکدوش ہونے کے لئے کوئی خلیفۂ وقت اپنی کمر پر اناج کا بوجھ لادے ہوئے جنگل میں ٹھیرے ہوئے ایک بھوکے خاندان کی طرف جاتے ہوئے باربرداری کی پرخلوص پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں خادم سے سرگوشی کہہ رہا ہے کہ "جس دن کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا تم میرے گناہوں کا بوجھ نہ ڈھو سکو گے!" ــــــ کوئی عمرؒ بن عبدالعزیزؒ خلافت کے جاہ و حشم اور سونے چاندی کے انبار کو ٹھکرا کر میلی کچیلی دھجیوں میں اپنی جان جاں آفریں کے حوالے کر رہا ہے اور کسی کے درد بھرے سوال کے جواب میں ان کی شریک حیات اس حقیقت نفر سے نقاب اٹھا رہی ہیں کہ "دوسرا لباس کہاں سے تبدیل کیا جائے

جب کہ ان کے جسم پر لپٹے ہوئے جوڑے کے علاوہ ان کے پاس کوئی دوسرا کپڑا موجود ہی نہیں ——— ان کے لئے دنیا کی زندگی دنیا کی فانی آرزؤں اور ارمانوں سے سجانے کے قابل ہی نہیں تھی وہ قدرت کے بیت المال سے اتنا ہی لیتے تھے جس کے بغیر زندگی بسر ہو ہی نہ سکے۔ وہ اس سراب آلود دنیا کے ریگزار پر ایک ایسے مسافر کی طرح جیتے تھے جس کی منزل بہت ہی دور ہو اور جس کے لئے سانس لینے کی مہلت نہ ہو" ——— کوئی فاطمہؓ دنیا کے شفیق ترین باپ سے یہ عبرت انگیز پیغام سنکر دولتِ دنیا کی آسائشوں سے "خوف انجام" کے نام پر منہ پھیر رہی ہے کہ "بیٹی! یہ نہ سمجھنا کہ تم پیغمبرؐ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے یوم آخرت کی سخت جواب دہی سے بچ جاؤ گی۔ خدا کی قسم اس دن کوئی طاقت خدا کے فیصلے کو نہیں بدل سکتی"

کوئی سمیتہؓ کفار کے ہولناک ترین مظالم کی خوں چکاں اور ہوشربا سختیوں میں بھی پیاس سے دم توڑتی ہوئی زبان سے یہی کہے جا رہی ہے کہ "میں اب بھی اپنے خدا کو ایک ہی مانتی ہوں۔ یہی عقیدۂ توحید ہماری زندگی ہے۔ زندگی لٹائی جا سکتی ہے مگر اس ابدی فلاح کے عقیدہ کو نہیں چھوڑا جا سکتا" ——— کوئی بلالؓ آہنی زنجیروں میں گھسٹتا ہوا زخموں سے چور چور ہو کر بھی اپنے قاتل دشمنوں کی بےرحم سماعت کو "احد احد" کا لاہوتی رجز سنائے چلا جا رہا ہے۔ کوئی عثمانؓ انسان کی دور افتادہ، آخری منزل کا خیال روح میں بیدار کئے اور حشر و نشر کے ان دیکھے واقعات پر ایمان رکھے ہوئے دولتِ دنیا کے راحت کدوں سے دور فرش زمین کی غیر کنکریوں اور سخت سنگ ریزوں پر عالمِ سوز میں کروٹیں بدل رہا ہے تو بھی تاریخ کی ایک اندوہناک گھاٹی میں قاتلانہ تلواروں کے نرغہ میں پھنسکر بھی مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے پرہیز کر رہا ہے اور وہ صرف اس لئے کہ اسکو ایک نہ ایک دن

اپنے رب کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کا خوف ہے ـــــــ کوئی علیؓ آدھی رات کے ڈوبتے ہوئے ستاروں کی چھاؤں میں تصورِ عقبیٰ سے ماہیِ بے آب کی طرح بے قرار ہے اور عالمِ اضطراب میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خود اپنی داڑھی پکڑے ہوئے اس طرح تڑپ رہا ہے جیسے کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ وہ بلک بلک کر رو رہا ہے اور جذب و جنوں کے عالم میں دنیا سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا ہے "اے دنیا مجھے دھوکا نہ دے، کسی اور کو دے، تو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے۔ یا میری مشتاق ہوتی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ میں نے تجھ کو تین طلاقیں دیدی ہیں جن سے رجعت نہیں ہو سکتی۔ تیری عمر کم اور تیرا مقصد حقیر ہے۔ آہ! زادِ راہ کم اور سفر دور دراز کا ہے۔ اور راستہ وحشت خیز ہے" ـــــــ

کوئی ابوہریرہؓ اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے بار بار شدتِ خوف سے غش کھا کھا کر گر رہا ہے کہ ـــــــ "قیامت کے زلزلہ انگیز دن خداوند ذوالجلال اپنے بندوں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لئے اترے گا تو پہلے تین شخص جو طلب کئے جائینگے وہ ایک قاری، دوسرا سرمایہ دار اور تیسرا ایک مجاہد ہوگا۔ خدا قاری سے کہے گا کہ "ہم نے تجھ کو قرآن کی تعلیم نہ دی تھی؟ تو پھر تو نے اس پر کیا عمل کیا؟" وہ مسئول قاری جواب دے گا کہ "رات اور دن میں نے تیرے ہی کلام کی تلاوت کی"۔ لیکن شانِ جلال کے ساتھ خدا فرمائے گا کہ "جھوٹ بکتا ہے! تو نے یہ سب اس لئے کیا کہ لوگ تجھ کو قاری کہیں" پھر جب دولت مند سے نعمتیں یاد دلا کر یہی سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ "میں نے صلہ رحمی کی اور صدقات دیئے"۔ خدا کی پُرجلال آواز آئے گی کہ یہ جھوٹ ہے! تو نے یہ سب کچھ صرف اس لئے کیا کہ لوگ تجھکو فیاض کہیں" ـــــــ پھر مجاہد کو نعمتِ حیات یاد دلا کر پوچھا جائے گا۔ تو وہ جواب دے گا کہ "جہاد فی سبیل اللہ کی آواز پر میں نے جنگ کی اور جان تک دیدی"۔ لیکن خدا فرمائے گا کہ یہ تو غلط ہے!

تیرا مقصد تو صرف یہ تھا کہ لوگ تجھ کو شجاع اور بہادر کہیں"۔ یہاں تک بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے زانو پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ" ان پر ہی سب سے پہلے دوزخ کی آتشیں لپٹ بھڑکے گی"۔

کوئی شفیا الاصحی رضی اس حدیث کو سن کر زار و قطار روتا ہوا کسی امیر معاویہ رض کی خدمت میں پہنچتا ہے تو وہ اس دن نیکیوں کے اس جانکاہ احتساب کے تصور سے دہاڑیں مار کر رونے لگتے ہیں، روتے جاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اقتدار وقت کا طافنور مجسمہ ہیں ——— روتے جاتے ہیں یہاں کہ ان کی موت کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے ——— پھر تاریخ دوسرے دور سے حجاب اٹھاتی ہے تو پہلی صدی ہجری میں ایک انسان نظر آتا ہے جو اندھیری راتوں کی ویران خاموشی میں خوف و خشیت کے سوز سے اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے ——— انسان کے لئے جو بلند ترین مسرت کا نشان اس کو موت کے اس پار نظر آیا ہے یہ اس تک پہونچنے کی ہوک ہے۔ یہ احنف رض بن قیس ہیں۔ یہی ہیں وہ جن کی ایک یا دو راتیں نہیں بلکہ تمام راتیں اسی کیفیت میں بسر ہوتی تھیں ——— یہی ہیں وہ جن کا معمول تھا کہ جب آخرت کے احتساب کا خوف ان پر بری طرح غالب ہوتا تو ان کا ہاتھ کالی رات کی تاریکیوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو پر بڑھتا۔ اس شعلۂ لرزاں پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ رکھ کر کس درد و حسرت کے ساتھ اپنے نفس سے سوال کرتے " اے نفس! کس چیز نے تجھے فلاں کام پر آمادہ کیا تھا؟" آگ ——— دنیا کی آگ ——— کا صرف ایک شعلہ گوشت پوست کی انگلی کو جھلس ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ مگر احنف رض جو کائنات کی سب سے دردناک آگ" شعلۂ جہنم" کے خیالات میں غرق ہوتے تھے اس تپش اور سوزش کی ٹیس کو بھولے ہوتے بار بار یہی سوال کرتے چلے جاتے " آہ! کس طرح تجھے اس فعل کی جرأت ہوئی جس کا انجام ہولناک آتش زدگی ہے"۔

—— ان کی آخرت شناس اور زندہ راتیں اسی ماوّاور روحانی کاوشوں کی آغوش میں اپنے اعمال گنتے ہوئے گذرتیں اور ان کے دن اکثر و بیشتر خواب زندگی سے آخری بیداری کے ٹھوس تصور میں اس کی فرصت ہی نہ پانے کہ کام و دہن کی تواضع کر سکیں تمام دن سورج کی کرنیں ان کے وجود پر سے اس حال میں گذرتیں جب کہ ان کے معدے اور آنتوں میں روزے کی بھوک پیاس شعلہ زن موجود رہتی۔ شب و روز کے اس پرسوز افسانہ کو کہتے کہتے آخر کار جوانی کی مغرور قوتیں درد و کرب میں ڈھلتی چلی گئیں۔ ضعیفی کا زمانہ زندگی کے دروازے پر آپہنچا۔ مگر اب اس درد و کرب پر ضعف طاری ہونے کے بجائے آخرت کی تڑپ چند در چند ہو گئی کہ اب وہ لمحہ قریب تر ہے جہاں حیات انسانی ایک آخری اور نازک انقلاب سے گذرنے والی ہے —— وہ سب سے بڑا انجام آنکھوں کے سامنے آجانے والا ہے جس کی ان دیکھی کہانی کو زندگی کے ہاتھ پاؤں آنکھیں بند کئے تمام عمر اچھی یا بری تشکیل کرتے رہے۔ جہاں دنیا بھر کے عیوب اور نقائص کو کریدنے اور تکنے والی نظر پہلی بار خود اپنے نامۂ اعمال کے وسیع و عریض آئینہ میں اپنے پورے وجود اور تمام زندگی کی حسین یا بھیانک شکل منعکس دیکھ کر خوشی سے دیوانی یا صدمہ سے پاگل ہو جائے گی۔ جہاں روئی کی نشیلی لذت اور خود فراموش نیندوں کے کیف و سرور سے تمام عمر دمکنے والے شادماں چہروں پر سیاہی کی غلیظ تہیں اور تباہی کی مکروہ جھریاں پیوست ہو کر رہ جائیں گی اور جہاں کرب آخرت اور درد انسانیت سے نڈھال بشروں پر پہلی بار کائنات افروز تبسم جنتِ ازل کی صبح اولیں کا جلال لئے ہوئے ہویدا ہوگا

"روزوں کا یہ تسلسل" ازراہِ غمگساری کسی نے کہا "ضعف پیری پر موت طاری کردے گا۔ کیا آپ کو نقاہت کا کوئی فکر ہی نہیں؟"۔

احنف رح بن قیس کی آنکھیں ان الفاظ پر سوز دل سے سرخ ہو گئیں۔ روح کی

ہوک الفاظ میں سمٹ آئی "کاش" وہ اپنے اس ہمدرد سے گویا ہوئے "کاش" تم اس طویل سفر کا کچھ تو اندازہ کر سکو جس کے لئے میں زندگی بھر تیاریاں کرتے کرتے بیدم ہوگیا ہوں مگر وہ مرحلے ہیں کہ ابھی اتنے ہی سخت و جانگسل دکھائی دے رہے ہیں"۔

حضرت اسودؓ بن یزید جو یوم حساب کو آنکھوں سے دیکھنے سے پہلے اپنی ایک قیمتی آنکھ کی بصارت اسی منظر کی خوفناکیوں کے تصور میں آنسوؤں کی راہ بہا چکے تھے تپتے ہوئے ریگستان میں اپنے اونٹ کو ہنکار رہے تھے۔ اونٹ جو ریت کے سُرخ ذرّوں پر تیز گامی دکھانے والا مخصوص جانور ہے۔ سورج کی غضب ناک کرنوں اور ریگستانی بھبوکوں اور بگولوں سے شکست کھا کر بدحواس ہو چکا تھا۔ مگر وہ نہ جانتا تھا کہ اس کا سوار ——— تقریباً عمر بھر خدا کی یاد میں روتے رہنے والا سوار ——— جو اس وقت بھی اپنے پروردگار کی یاد میں بھوک اور پیاس سے دوچار تھا تشنگی کی تشنج انگیز آگ کو سہتے ہیں اپنی سواری سے بھی دو قدم آگے چل رہا ہے۔ اس کی زبان بیچ بیچ سوکھ کر سیاہ ہوگئی ہے اور اس کا رنگ یکسر تبدیل ہوگیا ہے۔

آہ! انجانے آخرت کی کتنی بیکراں دولت ان کی نظر میں تھی جس کے حصول کے لئے وہ جیتے جی جان دینے کو تیار تھے۔ جس کے یقین نے عبادت کی ان جانگدازیوں میں بھی عمیق سکون کی روح بھر ڈالی تھی۔

"خدا اپنے جسم پر ترس کھائیے" فرط ہمدردی سے دنیا نے چلّا کے کہا۔

"ترس ہی تو کھا رہا ہوں" حضرت اسودؓ نے پوری صداقت کے احساس سے فرمایا "میں اس کو دکھ نہیں بلکہ اس دن راحت پہنچانا چاہتا ہوں جب دنیا کی پُرسکون لذتیں انسان سے غداری کریں گی اور جہاں بڑے بڑے دیوہیکل جسم بے کسی کے آخری احساس میں ڈوب کر ساری دنیا کی شاندار حقیقتوں کو ایک خواب پریشاں سے زیادہ نہ پائیں گے۔ اور آگ برساتی ہوئی قیامت اور رضائے الٰہی کے سوا کوئی

ٹھوس حقیقت زندہ نظر نہ آئے گی"۔

اس سخت گھاٹی کی سب سے پہلی منزل نماز ہے جس کے لئے کارکنانِ قضاؤ قدر انسانیت کے قافلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن کیا اسی لئے آج کے مسلمانوں کے اکثر و بیشتر مکانات میں مصلوں کا سراغ نہیں ملتا! پھر نماز کی تکمیل کے لیے جماعت کے احکام کو اسلام میں جو شدت و اہمیت بخشی گئی ہے ان کے پیش نظر تو گھروں کے مصلوں پر ادا کی ہوئی نمازیں بھی ادھوری اور بیجان نمازوں سے زیادہ نہیں۔۔ خاص طور سے عشاء اور فجر کی نمازوں کے لئے جماعت کی جو نازک ترین اہمیت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن گھروں میں ان اوقات کی جماعتوں سے غافل مجرم موجود ہوں ان کو رحمۃ للعالمین جیسی نرم دل ہستی نے انتہائی نفرت و بیزاری کے ساتھ آگ لگا دینے کے قابل قرار دیا ہے۔ آپؐ نے ہی فرمایا ہے کہ اگر عورتوں اور بچوں کا بے گناہ وجود حائل نہ ہوتا تو میں ان مکانات کو اپنے ہاتھ سے جلا ڈالتا جو خدا اور انسان کے درمیان شیطانی دیواروں کی طرح ایستادہ ہوتے ہیں۔

کون جانے کہ ان اوقات میں مسجدوں تک نہ جانے اور جماعت کی پاکیزہ آواز پر گھروں کے دروازے بند رکھنے سے نوعِ انسانی کس دولتِ عظیم سے محروم ہونے والی ہے اور کون سے عذاب کے آتش فشاں پہاڑ ایسے محرموں پر اپنے خوفناک دہانے کھولنے والے ہیں! کسے خبر ہے کہ رحمۃ للعالمینؐ کے ان غیض آلود الفاظ میں انسانیت کو کتنی المناک ہلاکت سے بچا لینے کی تڑپ کارفرما تھی!

لیکن شاید اسی لئے ہم مسلمان ٹھیک عشا اور فجر کے ان ہی نازک لمحات میں خوابِ غفلت کے آخری نشہ میں سرنگوں پڑے ہوتے ہیں جب مساجد کی بے رونق اور ویران جماعتیں بلک بلک کر ان روحوں کو آواز پر آواز دیتی ہیں

جن کو یقین ہے کہ آخرت ایک حقیقت ہے اور عذاب آخرت ایک اس سے بھی انتہائی لرزہ خیز اور ہولناک واقعہ!۔

جہاں عملی موت کا یہ عالم ہو وہاں جماعت کی پابندی میں تکبیر اولیٰ ہی سے جماعت میں شمولیت کے ثوابِ عظیم کی تڑپ اور ذوق و شوق کہاں سے آئے! لیکن جب آخرت کا ایمان و یقین انسانی قلب و روح تک جا پہنچتا ہے تو وہاں زندگی کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔ وہاں پھر حضرت اعمش رضؓ جیسے نمازی پیدا ہوتے ہیں جن کی تکبیر اولیٰ ستر سال کے طولانی عرصہ میں ایک بار بھی قضا نہیں ہوئی۔ اس یقین و ایمان سے پھر کتنے ہی ربیعؒ جیسے کردار ڈھلتے ہیں جو اس وقت بھی نماز با جماعت کے لئے گھسٹتے گھسٹتے ہوئے آغوشِ مسجد تک جا پہنچتے ہیں جب ایک طرف بڑھاپے کا انتہائی ضعف نظام جسمانی کو شکست دے رہا ہے اور دوسری طرف فالج کے حملے نے اعصاب کی قوت سلب کر لی ہے۔ آج جس طرح اس جہانِ گزراں کی چند روزہ زندگی کی حفاظت و خدمت کی جاتی ہے وہاں اسی طرح حیاتِ اُخروی کو روشن بنانے کی دھن سوار تھی آج جس طرح خطرناک مریض تیمارداروں کا سہارا لئے ہوئے ڈاکٹروں کے مطب اور شفاخانوں کے راستوں پر افتاں خیزاں چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ربیعؒ دوسرے مسلمانوں کے کاندھوں کا سہارا لیکر اپنے مفلوج پیروں کو پوری قوت سے گھسیٹے ہوئے اور خوف و خشیت اور رحمت خداوندی کی تڑپ میں خدا کے گھر تک حاضری ضروری سمجھتے تھے۔

"اے ابو یزید" ! درد و غمگساری کے ساتھ دنیا نے تلقین کی "اسی مجبوری کی حالت میں بھی شریعت کی رعایت سے فائدہ اٹھایئے اور گھر پر ہی نماز پڑھ لیا کیجئے"۔

مگر وہ ربیعؒ جو عذاب دوزخ کے ذرا سے تصور پر رو رو کر اپنی داڑھی آنسوؤں سے تر کر لیتے تھے۔ جو ایک لوہار کی تپتی ہوئی بھٹی کو دیکھ کر سر راہ غش کھا کر گر جاتے تھے

کہ یہ شعلے ان کو انگاروں کے اس بحر بیکراں کی یاد دلاتے تھے جس کا چھوٹا بسا معصوم نام "دوزخ" ہے ــــــ انھوں نے دنیا کا یہ ہمدردانہ مشورہ سنا اور بچوں کی سی معصومیت سے بولے "مؤذن جب کہتا ہے کہ آؤ نماز کے لئے۔ آؤ فلاح کی طرف" تو کس دل سے مسلمان ٹھیر سکتا ہے۔ اس کو اس آواز پر بڑھنا ہی پڑتا ہے۔ ہاں خواہ گھٹنوں ہی کے بل چلنا پڑے"۔ اس یقین و ایمان کے سائے میں پھر حضرت سعید بن مسیبؓ جیسے انسان ابھرتے ہیں جو مسجد کی حاضری کو چھوڑ دینا اس وقت بھی اپنی حقیقی موت تصور کرتے ہیں جب شاہراہوں پر موت اور ہلاکت کے مخطرات کا دور دورا ہوتا ہے۔

خودپرستی اور خداپرستی کا مقابلہ

"محمدؐ! ــــــ باھر نکلو"

غرور و نخوت سے اکڑے ہوئے لب و لہجہ میں کسی نے دربار رسالت پر آواز لگائی لیکن احساس لطیف پر گہری خراش لگنے کے باوجود فرطِ اخلاق سے مسکراتا ہوا چہرہ دروازے سے اس پکار کے جواب میں ظاہر ہوا۔ گستاخ للکار خودپرستی کی للکار تھی اور یہ خندہ پیشانی کا جواب خداپرستی کا اعلان تھا۔ دروازے پر تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ پکارنے والا بنی تمیم کے سرکش اور سربرآوردہ افراد کا ایک وفد ہے جس کے ساتھ نسلی مفاخرت کے گن گانے والے شاعروں کی ٹولیاں بھی ہیں اور تفاخر کے بل پر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر پیش کرنے والے فنکاروں کا جتھہ بھی۔

"کیا چاہتے ہو؟" ضبط نفس اور اخلاقی ایثار میں ڈوبی ہوئی آواز رسولؐ خدا کے میٹھے لبوں سے بلند ہوئی۔

"مجلس مفاخرہ!" ــــــ نسلی آن بان اور قبائلی سج دھج میں جھجتے ہوئے

وفد نے جواب دیا "ہم اس لئے آئے ہیں کہ ہمارے جادو بیان شاعر اور آتش نوا مقرر تم لوگوں پر یہ بات ثابت کر دیں کہ آج عرب کی سرزمین پر بنی تمیم سے زیادہ عظیم کوئی نہیں۔ کیا ہماری یہ للکار قبول ہے!؟"۔

"نہیں!" ——— وہ چہرہ جواب تنگ بہر ذاتی توہین پر شدتِ خلوص سے مسکرا رہا تھا یکایک انسانیت کے ساتھ اس اہانت آمیز مذاق پر غیرت حق سے تمتما گیا ——— "نہیں! ——— میں دنیا میں اس لئے تو نہیں بھیجا گیا ہوں کہ خون اور نسل و رنگ کے تھپیڑے کھا کر انسانیت کا خون ہوتا ہوا دیکھوں! ——— لیکن ——— اگر تم بندگانِ خدا کو مقابلے کے لئے للکار رہے ہو تو اس میدان میں بھی ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں"۔

مجلس مفاخرہ کا اذن پا کر کافروں کی ٹولی میں سے عطارد بن حاجب نے بنی تمیم کی عظمت و شان کا مغرور ترانہ چھیڑا۔ اور غرور و تکبر کی سرمستیوں کو تسکین دینے والی کوئی بات اپنے حریف کے کہنے کے لئے باقی نہ چھوڑی۔ بنی تمیم کے سرکش کافروں کے سینے جذبات کے غرور انگیز تلاطم سے پھول پھول گئے۔ اور وحشیانہ خود پرستی کا جنون فاتحانہ تمسخر کے ساتھ یہ دیکھنے کے لئے خاموش ہوا کہ اس خود ستائی کا جواب دینے کے لئے فریق ثانی کیا کہہ سکتا ہے!۔

لیکن ——— کافر یہ دیکھ کر حیرت سے شل ہو گئے کہ خدا پرستوں نے اپنے عجز و انکسار کا اقرار کر کے خود پرستی اور خود ستائی کے مغرور چہرے پر بھرپور طمانچہ مار دیا ہے!۔ مسلمانوں کے ترجمان کی آواز سنائی دی:۔

"اے بنی تمیم! ہم اور تم انسان ہیں جو خدائے ذوالجلال کے حقیر بندے ہیں ——— عظمت و کبریائی صرف خدا کے لئے ہے۔ اے بنی تمیم! تم خود فریبی کے جس جال میں گرفتار ہو ہمیں اس دامِ فریب سے اس ہستی نے آکر نکالا

جس کو مجلس مفاخرت کے لئے تم نے نخوت و غرور کے ساتھ للکارا ہے ــــــــ

اے بنی تمیم! تمہاری شاعری اور فصاحت نے تمہیں خود پرستی کے دھوکے میں ڈالا ہے مگر ہمیں خدا کی کتاب "قرآن" نے اس حماقت کی مہیب تاریکی سے نکالا ہے"۔

عرب کی تاریخ میں پہلی بار مجلس مفاخرت کی تان انسانی عجز کے اعلان پر ٹوٹ رہی تھی ــــــــ کافروں کا وفد ہکا بکا کھڑا تھا۔ لفاظی کے بل بوتے پر اپنی عظمت کا دھوکہ دینے والے حقیقت کی تیز روشنی کے آگے آنکھیں مل رہے تھے لیکن خیرگی ان کی اندھی بصیرتوں میں بھی پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن "کفر" نے اعتراف حق کے دھارے کا رخ پھیرنے کے لئے ایک بار پھر پوری قوت سے حملہ کیا۔ زبرقان نے کھڑے ہو کر دور جاہلیت کے جیکارے لگائے اور سچائی کے مقابلہ میں طاقت و تشدد کے گن گا کر مسلمانوں کے جذبات میں انانیت کی آگ لگانی چاہی۔

لیکن اس اشتعال انگیز لن ترانی کے جواب میں مسلمانوں نے فرط شوق میں "اللہ اکبر" کی وہی پر یقین آواز لگائی جو مکے کے کفر و شرک کا آہنی طلسم توڑ چکی تھی۔ آج انسانی خود پرستی کے مکروہ ترین بت پر فیصلہ کن وار کر رہی تھی۔ انسان خود کو چھوٹا مان کر اپنے خدا کی بڑائی کا اعلان کر رہا تھا۔

مسلمانوں کی طرف سے حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سامنے آئے اور رقت انگیز آواز میں گویا ہوئے :۔

"اے بنی تمیم! تم خود کو بڑا ثابت کرنے کی دھن میں ایسے مست ہوئے کہ اپنے خدا کی بڑائی کو بھول گئے!"۔

خود پرستی کے جواب میں خدا پرستی کے اعلان نے مقابلہ کی ساری وحشت انگیزیوں پر اوس ڈال دی۔ کافر اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ لیکن "حق" کی صدائے بازگشت کے طور پر اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کفر کی صفوں سے بیزار ہو کر نکلے اور مسلمانوں سے

بغل گیر ہوگئے۔ سچائی کی تاب نہ لاکر بھاگنے والے دشمن نے دیکھا کہ خود ان کی ٹولی کا ایک فرد یہ کہتا ہوا مسلمانوں سے جا ملا کہ "اے بنی تمیم! تمہاری خود پرستی میں وہ بات نہیں جو محمدؐ کی خدا پرستی میں ہے ـــــــ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدائے واحد ہی سب سے بڑا ہے ـــــــ اور میں گواہی دیتا ہوں یہ بات بتانے والا خدا کا سچا رسول ہے ـــــــ"

آج پھر دنیا کے طول و عرض میں انسانی خود پرستی ہمیں "مجلس مفاخرت" کے لئے للکار رہی ہے ـــــــ آج پھر خون اور نسل و رنگ کے پیمانوں سے انسان کی عظمت کو ناپا جا رہا ہے ـــــــ لیکن کون ہے جو خود پرستی کے عفونتی رخسار پر خدا پرستی کے بھرپور طمانچے لگائے؟ ـــــــ کیا خدا کی بے مثال کبریائی اور بڑائی نے ہمیں بھی ہماری نظروں میں چھوٹا اور حقیر ثابت کر دکھایا ہے؟ آج تو ذات پات اور نسل و رنگ کے ہزاروں بت ہماری آئینوں سے منھ نکال کر پوچھ رہے ہیں "کیا ـــــــ تم مسلمان ہو؟"۔

پاس ایمان و یقین

دربار رسالت میں امین و صادق صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحابؓ گرامی کے سامنے اس دنیا کی باتیں کر رہے تھے جو موت کی گود میں آنکھیں بند ہونے کے بعد آدمی کی نظروں کے سامنے آیا چاہتی ہے ـــــــ جنت اور جہنم ـــــــ آخرت کے دو فیصلہ کن موڑ اس تقریر دل پذیر کا موضوع تھے۔ بتایا جا رہا تھا کہ جنت کتنی حسین ہے اور دوزخ کس قدر ڈراونا! رسول کریمؐ کی زبان وحی ترجمان سے جو لفظ بھی نکل رہا تھا وہ سامعین کے دلوں میں اترتا جا رہا تھا۔ لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ جنت اور جہنم کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں بلکہ یہ دونوں دور افتادہ ان دیکھی دنیائیں آنکھوں کے سامنے آگئی ہیں۔

جنت اپنے پورے حسن وجمال کے ساتھ اور جہنم اپنی تمام ہیبت ناکیوں اور زہرہ گدازیوں کے ساتھ پیش نظر ہے ——— امید اور خوف کے دو نادیدہ پہلو جو آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی انسانی قلوب میں ہلچل پیدا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں جب نظروں کے سامنے گھوم گئے تو پوری محفل شور ہاؤ ہو سے گونج اٹھی ——— دماغ ایک اتھاہ سوچ میں گم ہو گئے ——— زندگی کے سود و زیاں سے بوجھل انسانی سر آخرت کے خوف سے لرزتے ہوئے دلوں کی طرف گریبانوں پر ڈھلک گئے ——— دل بھر آئے اور آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا ——— موت سے نہ ڈرنے والے بہادر مجاہد خدائے ذوالجلال کی عظمت و کبریائی کے سامنے ایک کمزور و ناتواں بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے ——— ہونٹوں پر استغفار کی ہچکیاں اور سسکیاں تھیں اور پورا وجود جذبات کے طوفانی تھپیڑوں میں ایک تنکے کی طرح بہتا چلا گیا ——— ان خدا کے بندوں میں ایک وفادار بندہ حضرت حنظلہ بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے ——— کتنے روشن ——— کتنے پاکیزہ تھے وہ آنسو جن میں اس دنیائے دنی کی کوئی ہوس۔ کوئی طلب اور کوئی تڑپ نہ تھی۔ جن میں خدا سے ملاقات کی بے پناہ آرزو عبودیت کی نارسائیوں پر سر دھن رہی تھی۔ آخر ذکر و فکر کی یہ محفل برخاست ہوئی اور یہ لوگ رسالت کے فیضان کا سوز لئے ہوئے دنیا کی سرحدوں میں داخل ہو گئے ——— حنظلہ اپنے گھر پہنچے تو بیوی بچوں کے درمیان اس دنیا کی زندگی نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ محفل رسالت کی یاد دھندلانے لگی اور "گھر" کے دیوار و در میں گھرا ہوا انسان گھریلو دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ متعلقین کو ہنستا بولتا ہوا دیکھ کر وہ بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو گئے لیکن یہ کب ممکن تھا کہ سفر آخرت کا راہی جس رہگزر کو دیکھنے کے لئے چلتا چلتا رک جاتے ان کی ہنسی کی آواز اٹکے ——— حنظلہ یکایک چونک اٹھے ———

لطیف ایمان و یقین کے احساس پر بجلی کی طرح گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"یہ میں ہنس رہا ہوں!!" ـــــ وہ سراسیمہ ہو کر سوچنے لگے "میں! ـــــ جس کے
سر پر موت کی ننگی تلوار لٹک رہی ہے؟ جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس ہنسی کا جواب دینے کیلئے
وہ آخرت کے محاسبے سے اب کتنی دور رہ گیا ہے! ـــــ محفلِ رسالت میں میرے
آنسوؤں نے مجھے میرے ایمان ـــــ دولتِ ایمان کا یقین دلایا تھا ـــــ مگر
یہ ہنسی کیا ثابت کر رہی ہے؟ ـــــ کیا ۔۔۔۔ میرا ایمان دو رنگی کا شکار ہو گیا ـــــ
اُف! میرے معبود! ـــــ کیا تیرا حنظلہ منافق ہے! ـــــ" یہ احساس نہیں
زلزلہ تھا جس نے ان کے پورے ڈھانچے کو تھرتھرا کے رکھ دیا ـــــ وہ لرزہ براندام
کھڑے ہوئے تھے ـــــ ہنسی دم توڑ چکی تھی مقدس چہرہ پر بیچارگی کی زردی
بکھر گئی ـــــ اور ایک بار پھر دل کی ہوک آنسوؤں اور ماتمی چیخوں میں ڈھل گئی
"حنظلہ! ـــــ منافق ہو گیا! ـــــ حنظلہ منافق ہو گیا" ـــــ اب گھر میں بیٹھنا
ممکن نہ تھا ـــــ گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا ـــــ خدا کا "دیوانہ" خدا کے رسولؐ کی
قیام گاہ کی طرف افتاں خیزاں چل دیا ـــــ کیسی خود فراموشی تھی! ـــــ کیسی
گہری تھی خدائے محمدؐ کی یاد! ـــــ کہ وہ بھری سڑکوں پر بچوں کی طرح روتے ہوئے
جا رہے تھے اور ہونٹوں پر وہی سنسنی خیز الفاظ تڑپ رہے تھے کہ "حنظلہ منافق ہو گیا!"
گھر والے تشویش و اضطراب اور حیرت میں پڑے رہ گئے ـــــ راہگیر چلتے چلتے ٹھٹک کر
رکے ـــــ سیکڑوں نظروں نے ان کی طرف یلغار کیا ـــــ سیکڑوں آوازیں تعاقب
کر رہی تھیں ـــــ سیکڑوں تبصرے اور سرگوشیاں ان کی "خود فراموشی" کو چھو رہی
تھیں ـــــ لیکن حنظلہؓ اس وقت نہ جانے کس دنیا میں تھے۔ ان کا جسم اس ہنگامے
کے درمیان چل رہا تھا مگر ان کی روح خدا اور اس کے رسولؐ کے پاس جا پہنچی تھی۔ اور
اس سے قبل کہ یہ جسم بھی وہاں پہنچے خدا کا ایک دوسرا پجاری اپنے ساتھی سے آملا ـــــ

یہ ابوبکر صدیقؓ تھے ——— دو روحوں نے درد دل کی کہانی کہی اور سنی اور دونوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ہی درد میں مبتلا ہیں ——— حنظلہ اب تنہا نہ تھے ابوبکرؓ بھی لرزاں وترساں ان کے نقش قدم پر چلے آرہے تھے ——— وہ جیتے جاگتے انسان خدا کے رسولؐ سے یہ پوچھنے جا رہے تھے کہ ہم زندہ ہیں یا مر گئے! ——— ہمارا "ایمان" معتبر ہے کہ نہیں؟ ——— ہماری متاع زندگی لٹ گئی یا محفوظ ہے ——— ہمارا خدا ہمیں مل سکے گا یا نہیں؟ ——— دو لرزتے ہوئے دل ——— دو خوف خدا اور محبت خدا سے سلگتے ہوئے دل رسول کریمؐ کے سامنے آئے ——— آنسوؤں سے سرخ آنکھیں اٹھیں ——— اور گلوگیر آوازوں نے اپنی سرگذشت بیان کی ——— اور ایمان ویقین کی کیفیت یکساں نہ رہنے پر اتنا اضطراب ظاہر کیا جیسے کوئی بدنصیب سر سے پاؤں تک تباہ ہو گیا ہو ——— وہ دل جو "کفر" کی بدنصیبیوں پر کڑھ کڑھ کر جانکنی کی سی اذیت محسوس کیا کرتا تھا ——— وہ دل اہل ایمان کو خدا کی یاد میں نیم جاں دیکھ رہا تھا ——— آپؐ کے جذبات اس وقت کیا تھے۔ اس کا اندازہ کون لگائے؟ کس میں طاقت ہے جو رسول اللہؐ کی نزاکت احساس کا تصور بھی کر سکے! ———

آپؐ مسرت اور شفقت کی شدت سے بیتاب ہو گئے۔ اور حنظلہؓ وابوبکرؓ کے درد کو اپنے جاں نواز تبسم سے تسکین دیتے ہوئے بولے کہ اے ایمان ویقین پر مرنے والو! تمہارا ایمان زندہ ہے ——— تمہاری آخرت خطرے میں نہیں!

"میرے سامنے تمہارے ایمان کی جو کیفیت تھی" آنحضرتؐ نے فرمایا "اگر وہ کیفیت برقرار رہے تو فرشتے تمہاری محفلوں ——— شاہراہوں اور بستروں پر گرم جوشی سے ہاتھ ملانے لگیں ——— بس اے حنظلہ! ——— یہ کیفیت گاہے گاہے ہی مناسب ہے"۔

یہ تھے وہ انسان جو "مسلمان" تھے۔ پاس ایمان ویقین کے دھڑکتے ہوئے دل! ——— رسالت و توحید کے احترام پر جان و دل سے قربان! ایمان کی تبدیلی کیفیت پر وہ منافقت کے خوف سے رو دینے والے ——— جو زندگی کے حقیر ترین معاملات میں ایمان کے آداب ملحوظ رکھنے کو زندگی اور موت کی سی اہمیت دیتے تھے ——— اور ایک ہم ہیں کہ ہمارا ایمان پیچ پیچ دم توڑنے توڑتے ہمیں پکار رہا ہے مگر ہمیں اس کی فرصت نہیں کہ اس پکار پر کان دھر کر یہ سوچنے کی توفیق پا سکیں کہ خدا کو منھ دکھانے کے لئے ہماری رو سیاہی کیا رنگ لائے گی؟۔

آہ! ہمارے دل کا یہ بگڑا ہوا نیم شکستہ آئینہ جس میں ہماری جھوٹی تصویر نظر آرہی ہے اے خدا! کیا یہ "جھوٹ" یہ جانگداز "دھوکہ" اس دن کھلے گا جس دن اپنے ہولناک عیوب کے ساتھ ہم برہنہ ہوکر میدان حشر میں جمع ہوں گے۔ جس دن تیرے دامن رحمت کے سوا کوئی لباس اور کوئی پردہ ہماری خطاکاریوں کو چھپانے کے لئے موجود نہ ہوگا۔

میرے مالک! ہمارے دلوں کو اس دن سے پہلے بیدار کر دے اور ہماری ہر بُن مو سے یہ دعا جاری کر دے

"اللّٰھم غشّنا برحمتك وجنبنا عن ابك"۔

یادگاریں:-

قریش کا پہلا وفد سرورِ انس و جن صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب پر سماجی دباؤ ڈالنے میں ناکام رہا تو دوسرا وفد آپہنچا اور تلخ و تند لہجے میں یہ منتقمانہ مطالبہ پیش کر دیا گیا کہ "اے ابو طالب! تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معبودانِ قریش کا احترام نہیں سکھا سکے ——— اسلئے اب ان کو ہمارے حوالے کر دو!"۔

ابو طالب کے لئے یہ الفاظ قیامت ٹوٹ پڑنے کے ہم معنیٰ تھے۔ وہ یہ تصور کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ عرب کے معصوم ترین انسان کو جابر و قاہر دشمنوں کے حوالے کر دینا بھی اس نازک مسئلہ کا کوئی حل قرار دیا جا سکتا ہے۔ محمد عربی سے ان کو اتنی ہی محبت تھی جتنی ایک ہونہار بیٹے سے ہو سکتی ہے۔ حالات کا یہ ہولناک مگر فیصلہ کن رخ دیکھ کر وہ بے بسی کے احساس سے تڑپ اُٹھے۔ ہر طرف تاریکی تھی مایوسی تھی۔ خوف اور ہراس تھا۔ لیکن ٹھیک اس وقت جب بیچارگی کے احساس سے ان کا سر سینے پر ڈھلک گیا تھا۔ ایک نئی امید کی کرن اس اندھیارے میں کوندی ——— انھوں نے پُرسوز آواز میں آں حضرتؐ کو پکارا ———

"لختِ جگر! اب دشمنوں کو دشمنی سے باز رکھنا بوڑھے ابو طالب کے بس سے باہر ہو چکا ہے۔ وہ لوگ میری نہیں سنتے ——— لیکن . . . . . لیکن کیا تم بھی اپنے بوڑھے چچا کے التماس پر کان نہیں دھروگے۔ اے بھتیجے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اس کام سے باز آجاؤ جس نے سارے مکہ کو تمہاری جان کا دشمن بنا دیا ہے"؟۔

پاکباز بھتیجے نے شفیق چچا کی یہ آواز سُنی اور اس کے چہرے کا۔ رنگ متغیر

ہو گیا۔ کیا یہ چچ یہ اسی ابو طالب کی آواز تھی جس کے سینے میں محمد عربیؐ کے لئے باپ کا دل دھڑک رہا تھا اور ماں کی ماممتا جس کی آنکھوں میں محبت کا نور بنکر دمکتی تھی
ہاں یہ اسی ابو طالب کی آواز تھی۔ نہیں! یہ دنیا کا آخری سہارا ٹوٹنے کی آواز تھی۔ یہ اس حقیقت کا اعلان تھا کہ سچائی کی راہ میں دنیا بہت دور تک ساتھ نہیں دے سکتی۔ اور آخر کار خدا کا نام لینے والے کے ساتھ خدا کے سوا کوئی نہیں رہ جاتا! ایک ساعت کے لئے آپؐ کے دل پر وہ سب کچھ بیت گئی جو اتنے ہوش ربا اور جانکاہ عالم میں ایک انسانی قلب پر بیت جانی چاہیئے۔۔۔ ابو طالب یہ دیکھ کر درد سے بیتاب ہو گئے کہ ان کے الفاظ کا جواب بھتیجے کی بھیگی ہوئی آنکھیں دے رہی ہیں۔

لیکن اس سے قبل کہ وہ تسلی کا ایک حرف منہ سے نکال سکتے۔ ان مقدس آنسوؤں سے عزم و یقین کا بے پناہ نور پھوٹ نکلا۔ جذبات کے مقابلے میں ایمان و یقین کا لامتناہی جوش پوری قوت سے موجزن ہو چکا تھا۔ ایک انسان انسانیت کی آخری بلندیوں پر کھڑا ہو کر دنیا کی لاش کو اپنے ہاتھوں سے دفنانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ایک بے پناہ عقیدت اور شدید حیرت کے عالم میں ابو طالب نے بھتیجے کی آواز سُنی۔

"میں نے جو کام شروع کیا ہے وہ میری اپنی موت یا اس کام کی آخری تکمیل سے ایک منٹ پہلے بھی موقوف نہیں کیا جا سکتا خواہ یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند ہی کیوں نہ رکھ دیں"!

کتنی صداقت، کیسی بیتابی اور کس قدر یقین و اعتماد تھا ان الفاظ میں! فولادی ثبات و عظم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے الفاظ ــــــ ابو طالب نے خوب محسوس کر لیا کہ محمدؐ کے سینے میں یقیناً کوئی ایسی قیمتی شئے موجود ہے جو ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ کاش وہ یقین کر سکتے کہ یہی محمدؐ کا خدا تھا! ــــــ کاش ان کے لبوں سے کلمۂ حق کی شہادت بلند ہو جاتی!۔ لیکن وہ خونی تعلق کے خوف

میں جس قربانی تک جا سکے وہ یہ الفاظ تھے ــــــ "نہیں! نہیں! ــــــ تم شوق سے اپنا کام کئے جاؤ بیٹا! ـ بوڑھا ابوطالب تمہارے ساتھ ہے۔ ہر حال میں وہ تمہارا ساتھ دے گا۔"

آہ ابوطالب اور ان کی قربانی کی یہ دردناک کہانی! جس سچائی کی راہ میں وہ اپنی جان پر کھیل رہے تھے اس سے محروم۔ ان کو دنیا سے جانا تھا! لیکن خدارا ایک منٹ رک کر سوچئے کہ وہ کفر کی حالت میں اسلام پر جس طرح جان نثار کئے دے رہے تھے کیا ہم اسلام کی حالت میں اس کا عشر عشیر پیش کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں؟ ـ اگر وہ "کافر" تھے تو کیا ہم مسلمان ہیں؟ ــــ ہاں مسلمان ہیں مگر ایسے مسلمان جن کے سیرت و کردار اسلام کے ساتھ بیرحمانہ مذاق کرنے میں مصروف ہیں!ـ

ثعلبہ بھی ایک انصاری تھے لیکن دنیا کا "مایا جال" ان کی "انصاریت" کی دولت لوٹنے کے لئے آگے بڑھا: "اے خدا کے رسولؐ!" ــــــ انہوں نے کہا "میرے لئے زر و مال کی افراط کے لئے دعا فرمائیے!"

"اے ثعلبہ!" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درد بھری آواز میں دکھ کے ساتھ فرمایا "یاد رکھو تھوڑا مال جس پر انسان اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتا رہے ان خزانوں سے بہتر ہے جنھیں پا کر وہ خدا کا شکر ادا کرنا بھول جائے"! لیکن ثعلبہ کا اصرار قائم رہا۔ شاید ان کو یہ غلط فہمی تھی کہ "شکر" سے غفلت کا جرم ان سے ممکن نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ احسانات کی جس قدر بارش ہو وہ اپنے محسن حقیقی کو اتنے ہی نظر انداز کرتے چلے جائیں۔ لیکن وہ بھول رہے تھے کہ یہ اس شخص کی تشخیص تھی جس کا دست مقدس حیات و کائنات کی نبض پر رکھا ہوا تھا۔

آخر آپ نے دعا کر دی ۔ دولت بارش کی طرح برسنا شروع ہوئی ۔ بھیڑ بکریوں کے بڑھتے ہوئے ریوڑ مدینہ میں رکھنا ناممکن ہو گئے تو ثعلبہ نے مدینہ سے باہر نکل کر قیام کیا مسجد کا فاصلہ بڑھا ۔ دنیا نزدیک آ رہی تھی اور خدا دور ہو رہا تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ عشا اور مغرب کی نمازوں میں ثعلبہ غائب ہیں ! —— دولت بڑھتی رہی —— فاصلے بڑھتے رہے غفلت بڑھتی رہی —— دولت دنیا کی زیادتی کے ساتھ اس دولت کا خزانہ گھٹتا رہا جو کسی فقیر کو مل جائے تو تاج و تخت کے بدلے بھی فروخت نہ کرے ۔ وہ دولت جس سے انسان خدا کی جنّت خرید سکتا ہے —— نمازوں میں ان کی غیر حاضری میں اضافہ ہوتا رہا ۔ اور آخر زکوٰۃ دینے کا داعیہ بھی ان کے دل سے دور ہو گیا —— خدا کے رسولؐ نے یہ سُنا تو آپ اس بدنصیب کی حالت پر روئے جس نے دنیا اور دین کو ایک ساتھ پانے کی ہولناک آرزو کی تھی ۔ آخر جبریل علیہ السلام قرآن کی یہ آیات لیکر نازل ہوئے ۔

" ایسے بھی لوگ ہیں جس نے خدا تعالےٰ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے فضل سے کچھ عطا فرمائے گا تو ہم ضرور اس کی راہ میں خرچ کریں گے اور نیکوکاروں میں ہو جائیں گے —— اور پھر —— جب خدا نے انھیں اپنے فضل سے دیا تو وہ بخیل بن گئے اور پیٹھ پھیر کر اعراض کرنے لگے ۔"

ثعلبہ آخر صحابی تھے ۔ وحی کی زہرہ گداز آواز سن کر وہ زکوٰۃ کی رکی ہوئی رقم لیکر آئے " لیکن تلافی کا دروازہ بند پایا ۔ ان کی زکوٰۃ قبول نہیں کی گئی ۔ خدا نے انکار کر دیا ۔ رسول نے انکار کر دیا ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے دورِ خلافت میں یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ " یہ دولت قبول کرنے سے حضورؐ نے منع کر دیا ہے ۔"

اف! دنیا کی محبت بھی کتنا خوفناک فتنہ ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان دین اور دنیا کی دو کشتیوں میں ایک ساتھ سفر کر سکے۔ ایک کی طرف بڑھنے کا لازمی نتیجہ دوسرے سے دور ہونا ہے۔ اگر کسی کو یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ خدا سے کتنا نزدیک ہے تو اُسے دیکھنا چاہئے کہ وہ دنیا سے کتنا دور ہے؟۔ لیکن کیا ہم یہ بات سوچنے تک کے لئے تیار ہیں؟ کیا ہمارے دل میں آخرت کے گھاٹے کا لفظ ہلکی سی ہلکی بیتابی اور ٹیس پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ ہاں اس لفظ میں تو بے شک آج بھی وہی طاقت ہے۔ مگر بولنے والی زبانیں اور سننے والے کان گُنگ اور شل ہو چکے ہیں۔ لیکن ہمیں اصرار ہے کہ ہم بہرحال مسلمان ہیں۔ عقیدہ کا کتنا حسین اصرار ہے! ۔ مگر عمل کیسا شرمناک اور ظالمانہ انکار!

نقوشِ دوام :-

آگ — سُرخ آگ پر ایک جیتے جاگتے انسانی جسم کا جلنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کو کچھ خدا کے وہی معصوم بندے جانتے تھے جن کو آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے ریگستانِ عرب میں سچ مچ شعلوں کی چادر پر گھسیٹا اور انگاروں کے فرش پر لٹایا گیا۔ سوچئے! اس سے زیادہ "معصوم" کون ہوگا جس کا جرم یہ اور صرف یہ ہو کہ وہ اپنے خدا کا ہو گیا ہے! اور جو اس وقت بھی وفا کے گیت گا تا رہے جب جھوٹ اور شر کی بے رحم سفاکیاں آگ کی سُرخ لپٹ بن کر اس سے یہ سوال کریں اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کے گوشت میں پیوست ہو جائیں — یہ تھی زمین کی وہ انسانی نسل جو کہتی تھی کہ "ہم مسلمان ہیں" شعلوں کی باڑھ میں سر سے پیر تک جھلس جھلس کر — ننگی تلواروں کے سائے میں —

تیز برچھوں کی انیوں پر، پتھروں اور تیروں کی بوچھاریں اور کوڑوں کی زد پر جو برابر یہی کہتی رہی:۔

"ہاں ہم مسلمان ہیں! مسلمان ہیں! مسلمان ہیں!"

ان میں عمار بن یاسرؓ تھے ——— خبابؓ بن ارت تھے ——— ان میں بلالؓ حبشی تھے اور ان میں بوڑھی سمیہؓ تھیں۔ اور ان جیسے نہ جانے کتنے مردوں اور عورتوں کا وہ سرفروش جھرمٹ تھا جو تاریخ کے صفحات پر اپنے چھاپوں کے نیلگوں پانی اور خون کے سرخ تازہ قطروں سے اس دین حق کی عظیم قیمت تحریر کر رہا تھا جو ہمیں ... پڑا پایا مفت مل گیا ہے! اسلام ان کے لئے کوئی "پیدائشی عقیدہ" نہ تھا جو ہاتھ پیروں اور آنکھ ناک کی طرح رحم مادر سے مفت ہی مل گیا ہو۔ نہیں بخدا کی قسم ان لوگوں نے تو ہوش وحواس کے عالم میں ان دیکھے خدا کی یہ آواز سُنی تھی کہ۔

"کون ہے جو ایک نادیدہ جنت کے لئے ایمان کی قربان گاہ پر نقد دل وجان پیش کرے؟"

اور ان لوگوں نے کامل ہوش وحواس کے عالم میں کہا تھا

"لے ہمارے معبود ہم! ——— ہم تیار ہیں"

اور پھر تاریخ کا غیر جانب دار ضمیر گواہ ہے کہ یہ لوگ سچے خریدار ثابت ہوئے۔

اور ——— جی ہاں! ہم بھی "مسلمان" ہیں!۔ مگر ہمارا حال کیا ہے؟۔ کہنے دیجئے کہ ہمارا حال سچ سچ یہ ہے کہ ہم خدا کی اس جنت کو مفت بھی لینا نہیں چاہتے مگر دوزخ کو ہر قیمت پر مول لینے کے لئے تیار ہیں۔ عملاً تیار ہیں۔ خدا کے حضور پانچ وقت مفت میں سر جھکا دینا ہمارے لئے شاق ہے۔ مگر دنیا کے حقیر ترین ٹھیکروں

کے لئے ہم چوبیس گھنٹے بڑے سے بڑے پہاڑ اٹھانے اور پاپڑ بیلنے کے لئے کمربستہ ہیں!——

انسان کے ساتھ محبت کی اخلاقی ہمدردی بھی ہمارے بس کا روگ نہیں رہی مگر نفس اور شیطان جیسے دشمنِ جاں کے اشاروں پر ہم دن کا چین اور رات کی میٹھی نیند تج ڈالنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ دس دس بیس بیس روپے خرچ کر کے چلئے اور سگریٹ جیسی زہریلی لتوں کو جاری رکھنا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں لیکن راہِ مولا میں ایک کھوٹا سکہ دیتے ہوئے ہماری جان پر بن جاتی ہے! اُف میرے معبود! کیا ہم اسی تاریک منزل میں آ پھنسے ہیں جہاں تجھے بھولنے والے تیرے دبارِ رحمت میں بھلا دئے جاتے ہیں! کوئی ٹھنڈے دل سے انصاف کرے کہ اگر صحابہ ؓ حقیقی مسلمان تھے تو ہم کیا ہیں؟ کیا "اسلام! اسلام" رٹنے والی زبان کا کوئی بھی تعلق اس دل سے باقی رہ گیا ہے جو بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنورتا ہے تو زندگی سنور جاتی ہے؟

رُو دے اے چشمِ عبرت اگر تیری آنکھوں میں کوئی آنسو باقی رہ گیا ہے—— مگر کہاں! عبرت کی آنکھ تو مدت ہوئی بے نور ہو چکی ہے۔

—— ۲ ——

غیرتِ حق بھی کیا چیز ہے جو ایک معصوم بچے کے سینے میں بھی جوانی کی آگ بھر دیتی ہے؟

زبیرؓ بن العوام اس وقت محض ایک کمسن لڑکے ہی تھے جب مکہ میں یہ لرزہ خیز افواہ اُڑی کہ مشرکوں نے آج تو خدا کے رسول ؐ کو گرفتار کر لیا ہے!—— یہ خبر سب نے سُنی۔ جوانوں نے بھی سُنی۔ بوڑھوں نے بھی اس افواہ کو سُنا، مگر غیرتِ حق کے آتش کدے سے جس ننھی سی چنگاری نے سب سے پہلے گھور اندھیارے

پر جست کی وہ خدا کی قسم ایک بچہ تھا ــــ ایک طفلک سادہ معصوم! ــــ زبیرؓ، عوام کا بیٹا زبیرؓ!

رگوں میں کھولتا ہوا خون بیتاب تھا کہ رگ رگ سے ٹپک پڑے ــــ ہاتھوں میں سونتی ہوئی ننگی تلوار نیم بسمل کی طرح بے چین تھی کہ جن ناپاک ہاتھوں نے دامنِ رسالتؐ کو چھونے کی گستاخانہ جسارت کی ہے ان کو جسم سے جدا کر دے ــــ اسی حال میں یہ بچہ ایک خطرناک فیصلے کے ساتھ مکہ کی گلی کوچوں سے آندھی کی طرح گذرا اور آستانۂ رسالتؐ پر تحقیقِ حال کے لئے آواز بلند کی۔ وہاں اس نے نجانے کس حال میں یہ دیکھا کہ محمد عربیؐ اس کے سامنے ہیں! محمد عربیؐ جن کے سوزِ دروں نے عرب اور عجم کے ناپید اکنار فاصلوں پر بچھڑی ہوئی انسانیت کو گلے ملا دیا! محمد عربیؐ جن کا نام لیتے ہوئے دل تڑپ کر ہونٹوں پر آتا ہے ــــ محمد عربیؐ جن کو دیکھ کر ساری کائنات بھول جاتی تھی اور انسان کو اپنا خدائے واحد یاد آتا تھا ــــ زبیرؓ نے یہ منظر دیکھا اور اس کا سارا خروشِ انتقام آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے رواں ہو گیا۔ ایک بچہ مسرت کی شدت میں بچوں ہی کی طرح رو پڑا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین شفقت اور حیرت کے ساتھ اس کو سینے سے لگانے کے لئے آگے بڑھے:۔

"اے زبیرؓ! ــــ یہ کیا!"

"جی؟" دوسری طرف سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز آئی:۔

"میں نے سُنا تھا کہ خدانخواستہ آپؐ کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔۔۔۔ آپکو۔۔"

زبیرؓ نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے جس کو مسرت کی ہچکیوں نے کہا الفاظ نے نہیں! ــــ مگر خدا کے رسولؐ نے سب کچھ سمجھ لیا ــــ آپؐ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

ہانپتا ہوا تنفس اب بھی بتا رہا تھا کہ ابھی ابھی اس معصوم بچّے کے سینے پر کتنا بڑا طوفانِ غیرت گذر چکا ہے ننگی تلوار اب بھی کہہ رہی تھی کہ نکلنے والا کس ارادہ سے نکلا تھا ـــــ لیکن شفاف آنکھوں سے چھلکتے ہوئے موتی اس حقیقت کا اعلان کر رہے تھے کہ یہ ایک بچّہ ہے ـــــ محض ایک معصوم و کمزور بچّہ! آپ کے ہاتھ بے ساختہ دعا کے لئے پھیل گئے ـــــ پیغمبرؐ کا دل خدا جانے اپنے خدا سے بچّے کے لئے کیا کچھ مانگ رہا تھا جس کے ہاتھوں اسلام کے نام پر سب سے پہلی تلوار بے نیام ہوئی۔

اسلام! ـــــ جس کے لئے سب سے پہلے ایک بوڑھی سمیہؓ نے جان دی!

اسلام! ـــــ جس کے لئے سب سے پہلے ایک معصوم زبیرؓ نے تلوار اُٹھائی!

یہی بچّہ جب سچ مچ جوان ہوا تو فرشتے اس کے نقشِ قدم پر چلے! معرکۂ بدر میں جب اسلام کا یہ سپاہی زرد رنگ کا عمامہ باندھے ولولۂ شہادت سے تڑپتا ہوا نکلا تو امین و صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"زبیرؓ کو دیکھ لو! آج ٹھیک اسی لباس میں فرشتوں کے لشکر ہیں۔"

یہی وہ محاذ جنگ وجہاد تھا جہاں لوہے کی تلوار تھک کر خم کھا گئی، مگر مجاہد زخم شہادت کی دھن میں کسی طرح نہ تھکتا تھا ـــــ آخر اس کی پُرشوق آرزو پوری ہوئی ـــــ اس نے ایک ایسا بھی کاری زخم کھایا جس کا خشک گہرا گھاؤ اس کے کفن میں اس کے ساتھ گیا ـــــ عروہ بن زبیرؓ کا بیان ہے کہ یہ گھاؤ کا نشان تمام عمر ان کے باپ کے جسم پر ایک عظیم یادگار کی طرح قائم رہا۔

عمر بھر تقدیر اُن پر دھن لٹاتی رہی مگر عمر بھر ان کی زندگی میں فقیروں کی سادگی قائم رہی ـــــ ان کے ایک ہزار غلام جب دن بھر کی محنت کا حاصل ایک بھاری بھرکم رقم کی شکل میں ان کے سامنے لاکر ڈھیر کر دیتے تو معًا یہ خیال آپ کی

روح کو جھنجوڑ ڈالتا کہ :-

یہ سب لوگ اپنے خون پسینے کی گاڑھی کمائی میرے سامنے لاکر ڈھیر کر دیتے ہیں. صرف اس لئے کہ یہ میرے غلام ہیں. جب غلامی کا تقاضا ہے تو پھر عبودیت کیا کہتی ہے ؟ —— اس غلام کو کیا کرنا ہوگا جو خدا کا غلام بھی ہے اور اس کی مخلوق بھی ؟ "

ان خیالات کیساتھ آپ کی نظر اس چمکتے دمکتے ڈھیر سے ہٹ جاتی اور آپ دونوں ہاتھوں سے اس کی پائی پائی اپنے معبود کی راہ میں لٹا دیتے.

اس انفاق کی کیفیت کا اندازہ دنیا کو اس وقت ہوا جب جنگِ جمل پر جاتے ہوئے آپ نے اپنے صاحبزادے عبد اللہ رضی سے کہا :-

" لختِ جگر! مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے قرض کا ہے بائیس لاکھ کی یہ ماتیں جو بطور قرض لی گئیں اور بطور قرض خرچ ہوئیں میری املاک فروخت کر کے ادا کر دی جائیں. اس میں سے ایک تہائی خاص تمہارے بچوں کے لئے وصیت کرتا ہوں. اگر مال پھر بھی ناکافی ثابت ہو تو پھر میرے مولا کی طرف رجوع کرنا "

" مولا ؟ " صاحبزادے نے پوچھا :-

" آپ کا مولا کون ہے اباجی ؟ "

جذب و شوق سے کپکپاتی ہوئی آواز آئی :-

" میرا مولا —— میرا خدا ! —— میرا خدا جس نے ہر آڑے وقت میں میری مدد فرمائی "

بنو قریظہ نے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو تحقیق حال کے لئے ایک ایسے ایلچی کی ضرورت درپیش تھی جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تن تنہا

ان عہد شکنوں کے درمیان جانے کے لئے تیار ہو سکے۔ یہ کوئی جہاد نہ تھا جہاں مجاہد کے ساتھ مجاہدوں کا لشکر جاتا تھا۔ یہ ایک خطرناک سفارت کا نازک مرحلہ تھا جس کی پُر خطر راہ میں ایک انسان کو یکہ و تنہا ایک فوج کا کام انجام دینا اور موت کی للکار قبول کرنا تھا۔ رسولِ خدا نے آواز دی:۔

"کون ہے جو اس کام کے لئے اپنی خدمات پیش کرے؟" اور تین بار یہ آواز دی گئی، ہر بار جو شخص پہل کرتا تھا وہ زبیرؓ بن عوام تھے۔

"میں! —— اے رسولِ خدا! میں!"

اسلام کے لئے اس جاں نثاری کا والہانہ جذبہ دیکھ کر آپؐ پکار اُٹھے:۔

"اے زبیرؓ! میرے ماں اور باپ تجھ پر نثار!"

جس ہستی کے حضور اس کے چاہنے والے انتہائی شوق کے عالم میں یہی الفاظ استعمال کرتے تھے آج اسی بلند و برتر ہستی کی زبانِ مبارک پر زبیرؓ کے لئے "فداک امی وابی" کے والہانہ الفاظ تھے۔ اللہ اکبر! زبیرؓ بن عوام کے بخت بلندی کی سعادتیں!

اور اب وہ زبیرؓ دنیا کے نشیب و فراز سے دُور ایمان و عمل کی راہ میں زخم پر زخم کھا کر ہمیشہ کے لئے سکون کی نیند سو رہے ہیں۔ وہ زخموں کی کسک ہمیشہ کے لئے ختم ہوئی اور اب اس کا ابدی انعام ابیر رحمت کا دائمی سائے کئے ہوئے ہے۔ لیکن ہم — ہم جو مسلمان ہیں — ہمارا کیا انجام ہو گا؟ — یہ سوال صدیوں سے فضا میں گونج رہا ہے مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں ملتا۔

مومن کی پریشانی

طلحہؓ کے چہرے سے گہری پریشانی ٹپک رہی تھی:

جیسے کوئی بہت بڑا جذباتی خطرہ سر پر منڈلا رہا ہو!—

یا جیسے کوئی سنگین مجرم رنگے ہاتھوں پکڑا جائے! شریک زندگی سُعدیٰ نے یہ حال دیکھا تو گھر کا سارا کام کاج چھوڑ کر گھبرائی ہوئی ان کے پاس آئیں اور پریشان حال شوہر کے چہرے کا جلدی جلدی جائزہ لینے لگیں —— "پریشانی کا راز کیا ہو سکتا ہے؟" انھوں نے سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا —— زندگی کے منگاموں میں دُور دُور تک کوئی ایسی بات دکھائی نہ دی جس سے ایسی پریشانی لاحق ہو سکتی ہو۔

"کیا بات ہے؟ آخر ان سے نہ رہا گیا اور بڑے پیار اور دل سوزی سے بول اُٹھیں" کچھ تو بتائیے آخر کیا حادثہ پیش آگیا ہے؟"۔

فکر و تشویش کے بھاری بوجھ تلے سینے پر ڈھلکا ہوا سر اُٹھا —— اور اضطراب میں ڈوبی ہوئی دو پُر نور آنکھیں سُعدیٰؓ کے معصوم چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا!

"للہ کچھ تو بولئے!" سعدیٰؓ کچھ اور بیتاب ہو گئیں۔ "آخر کیا ماجرا ہے؟ —— کیا مجھ سے کوئی قصور سرزد ہوا ہے؟"

"نہیں نیک بخت!" آہ سرد بھرتے ہوئے طلحہؓ کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی "قصور تمہارا نہیں —— میرا ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ میرے پاس کس قدر سرمایہ جمع ہو گیا ہے! اُف میرے خدا! —— سونے چاندی کے ڈھیر دنیا میں اپنے پیچھے یونہی چھوڑ گیا تو خدا کے پاس ان ہاتھوں میں کیا لیجاؤں گا!

اور یہ کہہ کر آپ خالی ہاتھوں سے کفِ افسوس ملنے لگے۔ نیک دل عورت نے اپنے شوہر کی یہ بات سُنی، لیکن ایک حرفِ تعجب بھی منہ سے نہ نکلا۔ طلحہؓ کی یہ عجیب و غریب پریشانی سعدیٰؓ کی نظر میں بھی بڑے فکر کی بات تھی۔ وہ محسوس کرتی تھیں کہ "اس سے بڑا بدنصیب کون ہوگا جس کے ہاتھوں میں تو سب کچھ ہو مگر دل میں کچھ بھی نہیں! —— جو دنیا کو سب کچھ دے جائے اور ساتھ کچھ

بنے جائے! ــــــــــ جو انسانوں کے درمیان خوش حال رہا ہو۔ مگر جب خدا کے حضور حاضر ہو۔ تو اس کو بھوکے ننگے بھکاریوں کی صف میں جگہ دی جائے!!

"آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟" سُعدیٰ رضؓ نے محبت بھرا دلاسا دیتے ہوئے کہا ــــ "سیدھا سادہ علاج ہے اس کا! روپیہ نکالئے اور راہِ مولا میں لُٹا دیجئے!"

اور طلحہؓ نے یہ الفاظ سُنے تو بچوں کی طرح خوشی سے کِھل گئے خدا کی راہ میں لٹا دینے کے تصور نے دولت کو سچ مچ ایک قیمتی خزانے میں ڈھال دیا جس کی امانت ہے اسی کے حوالے کر دینے کا خیال دل کا سارا بوجھ ہلکا کر گیا۔ دولت کا قیمتی ڈھیر ــــ پورے چار لاکھ دینار! ــــ مگر اس مردِ مومن اور مومنہ کو پورا یقین تھا کہ خدا کی جنت اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

چار لاکھ دینار کا خزانہ بے دریغ لُٹنا شروع ہوا ــــ بنو تمیم کے یتیموں نے اس دولت سے اپنے دامن بھرتے ہوئے سوچا کہ اسلامی معاشرے کی آغوش میں ان کے باپ کی شفقت پوری قوت سے زندہ ہے ــــ بیواؤں نے اپنے سہاگ کے جشن منعقد ہوتے ہوئے دیکھے اور قرض کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں نے ایک بار پھر خدا کی زمین پر آزادی کا سانس لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے طلحہؓ نے چار لاکھ دینار خدا کی راہ میں لُٹا دیئے۔ اپنے گرد و پیش کی دنیا کو خوش حال بنانے کے بعد وہ خود خالی ہاتھ کھڑے ہوئے تھے ــــ مگر اب اُنکی روحانی پریشانی ختم ہو چکی تھی ــــ اب ان کے ہونٹوں پر ایک لافانی مسکراہٹ کا نور تھا۔ ہاں اب ان کے ہاتھوں کی دولت ان کے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے سما گئی تھی۔ اب وہ اس طرح خوش و خرم اپنے گھر لوٹ رہے تھے جیسے کسی خوفناک جنگل

میں بھٹکنے والا پریشان راہی خطرات کی تاریکی سے نکل کر گھر کی راہ پر آ لگا ہو۔

۲

ایک بار پھر بھی طلحہؓ سوگ میں ڈوبے ہوئے کھڑے تھے!

عمر ابن خطابؓ کا ادھر سے گذر ہوا۔ وہ چلتے چلتے رُک گئے اور ان کی پریشانی دُور کرنے کے لیے نفسیاتی زندہ دلی کا انداز اختیار کرتے ہوئے فرمایا ——

—— "طلحہؓ! خیر تو ہے؟ کیا کسی سے لڑ گئے ہو؟"

"نہیں!" پریشانی سے تھکی ہوئی آواز طلحہؓ کے خشک ہونٹوں پر سسک گئی۔

"پھر کیا بات ہے آخر؟"

دلگیر آواز میں جواب ملا —— "اے عمرؓ! —— میں خدا کے رسولؐ کی ایک قیمتی بات بھول گیا ہوں۔ آپؐ نے کچھ الفاظ بیان فرمائے تھے اور کہا تھا کہ موت کی گود میں دم توڑتی ہوئی زبان ان الفاظ کو ادا کرے گی تو جاں کنی کا کرب دور ہو جائے گا اور چہرے پر طمانیت کی شگفتگی پھیل جائے گی —— میں نے ان الفاظ کو یاد کیا تھا، مگر حیف ہے مجھ پر کہ اب...... اب وہ الفاظ مجھے کسی طرح یاد نہیں آ رہے!"

حضرت عمرؓ نے مرد مومن کے جذباتِ غم کی شدت کو رشک اور مسرت کے ساتھ محسوس کیا اور بولے "کیا خدا کے رسولؐ نے ہمیں لا الٰہ الا اللہ سے بھی بہتر کوئی کلمہ سکھایا تھا؟"

طلحہؓ یہ سُنکر خوشی سے اُچھل پڑے —— "قسم ہے خدا کی! —— یہی تھے وہ الفاظ! —— بالکل یہی!!"

کیسی حسین ہو گی وہ دنیا جس میں طلحہؓ جیسے مرد اور سُعدیٰؓ جیسی عورتیں

آباد تھیں! — ہاں وہ مسلمان تھے — اور ہم بھی مسلمان ہیں — مگر فرق صرف یہ ہے کہ جہاں ہماری خوشی کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے ان کا غم شروع ہوتا تھا! — پھر ان کی خوشی کونسی خوشی تھی؟ کون ہے جو اس کا تصور بھی کر سکے؟ — ہم بھی مسلمان ہیں — مگر اس اسلام کی بلندیوں کا تصور کرتے ہوئے بھی ہماری زندگی تھک کر گر جاتی ہے جو طلحہؓ کے خدا ترس سینے میں اور سعدیؓ کی پاکباز فطرت میں رچا بسا تھا — آہ کیا ہم سچ مچ "مسلمان" کہلانے کے مستحق ہیں؟ اے کاش اس کا جواب اثبات میں ہوتا!!

جذباتی آزمائشیں:

حضرت سعد الاسودؓ اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت تھے کہ کالی صورت اور حسن و رعنائی سے محروم جسم کے اندر بھی ایک جگمگاتی ہوئی انسانی سیرت موجود ہو سکتی ہے — عام انسانی نگاہوں نے اب تک انھیں حقارت کیساتھ دھتکارا تھا، زمانے کی سطحیت پسندی نے اب تک ان کی شخصیت کی بے قیمتی کا مایوسانہ احساس ہی دلایا تھا۔ عام دنیا کے لئے ان کے اندر کوئی کشش موجود نہ تھی۔ انسانی آبادیوں میں ایک انسان اس ناکردہ گناہی کی دردناک سزا پا رہا تھا کہ وہ بدصورت کیوں پیدا ہوا ہے! — لیکن قدرت کا ہاتھ اس بدصورتی کا پردہ ہٹا کر ان کے اندر چھپی ہوئی ان روحانی رعنائیوں کو آشکارا کرنے والا تھا جن کی خبر اس سیاہ فام انسان کو خود بھی نہ تھی۔

اپنی بدصورتی سے خائف و مایوس انسان نے خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور یوں فریاد کی:۔

"اے محمدؐ! میں ایمان لانا چاہتا ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ مجھے جنت کے دروازے

پر اندر جانے سے روک دیا جائے گا۔"

انتہائی دلسوزی کے ساتھ وہ نظر سعد الاسودؓ کی طرف اٹھی جس میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ رحمۃ للعالمین کی نظر تھی۔ ہمیشہ سچ بولنے والی زبان سے درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ نکلے اور سننے والے کی سماعت پر آبِ حیات کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے ٹپکا گئے۔

"نہیں اے سعد! خدا کی جنت کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہے ــــ وہاں جانے سے تمہیں روکنے والا کوئی نہیں!"

"اچھا!" سعد الاسودؓ کا منہ حیرت اور خوشی سے کھلا کا کھلا رہ گیا اور پھر بے اختیار کلمۂ توحید کا پاکیزہ نعرہ ان کے سیاہ ہونٹوں سے بلند ہو گیا۔ سعدؓ ایمان لا چکے تھے ــــ خدا کا ایک دل شکستہ بندہ اپنے خدا کو پا گیا تھا ــــ سعدؓ مسلمان ہو گئے تھے ــــ انسانیت نے ایک مایوس انسان کو سینے سے لگا لیا تھا۔

لیکن کچھ دن بعد ایک بار پھر یہی انسان خدا کے رسولؐ کے پاس کھڑا ہوا دیکھا گیا ــــ ایک بار پھر اس کے چہرے سے خوں چکاں مایوسی ٹپک رہی تھی۔

"اے خدا کے رسولؐ!" سعد الاسودؓ نے دلریشی کے ساتھ کہا "اسلام نے مجھ سے جنت کا وعدہ تو کیا ہے مگر دنیا بدستور تاریک ہی ہے ــــ میں شادی کا آرزومند ہوں مگر کوئی شخص مجھے اپنی بیٹی دینے کے لئے تیار نہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹوٹتے ہوئے دل کی پکار کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "جاؤ! قبیلۂ ثقیف کے نومسلم سردار عمرو بن وہب کو خدا کے رسولؐ کا یہ فیصلہ سنا دو کہ اس کی بیٹی سعد الاسودؓ کے نکاح میں دیدی گئی!"

سعد الاسودؓ حیرت سے شل ہو گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص کو کوئی معمولی سے معمولی خاندان اپنے اندر جذب کرنے کو عار سمجھتا ہو، اس کو ایک معزز سردار اپنے گھرانے کا فرد بنانے پر آمادہ ہو جائے! — مگر سعدؓ جو اپنی صورت سے مایوس تھے رسالت کی عظمت کا یقین رکھتے۔ یہ رسالت کی آواز تھی جو اسلامی معاشرے میں تقدیر کے اٹل فیصلہ کا درجہ رکھتی ہے۔ سعدؓ امید وبیم کے شدید اضطراب کے عالم میں گرتے پڑتے روانہ ہوئے اور معزز سردار کے دروازے پر دستک دے کر اپنی شادی کی یہ پیش کش کر دی معزز سردار یہ بات سنتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ غیظ وغضب کے ابال نے اس کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا کہ اس پیشکش کے پس منظر میں رسالت کی آواز ہے —— اس کے سامنے محض ایک کالا بھجنگ انسان کھڑا تھا جس نے قبیلہ ثقیف کے خاندانی وقار کو للکارا تھا۔ سعدؓ اس در سے ٹھکرا دیئے گئے۔ مگر ابھی وہ چند قدم بھی جانے نہ پائے تھے کہ پیچھے سے ایک کانپتی ہوئی شرمیلی نسوانی آواز نے ان کو انتہائی بے تابی کے ساتھ پکارا "اے جانیوالے — اے خدا کے بندے! اگر یہ فیصلہ محمد عربیؐ کا فیصلہ ہے تو مجھے منظور ہے" یہ آواز عمر بن وہب کی صاحبزادی کی آواز تھی —— عورت نسلی وقار اور سماجی بندشوں کی جھوٹی عظمتوں کو ٹھکراتی ہوئی دین کی قربانگاہ پر اپنے جذبات کی قربانی پیش کر رہی تھی۔ بیٹی کے ایمان افروز فیصلے نے باپ کو جیسے گہری نیند سے چونکا دیا تھا۔ سعدؓ جن کو ابھی حقارت کیساتھ نکالا گیا تھا انتہائی اعزاز کے ساتھ واپس لائے گئے دنیا جس شادی کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی وہ شادی طے ہو گئی اور سعدؓ اس تقریب کا ضروری سامان خریدنے کے لئے بازار پہنچے۔ خوشی اور آرزوؤں کے جذبات

میں تلاطم بپا تھا۔ زندگی کی ایک کچلی ہوئی حسرت ایک حسین ترین تکمیل آرزو کی سمت بڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک نئی عظیم آزمائش کا موڑ سامنے آگیا —— انھوں نے بازاروں کو اس پکار سے گونجتا ہوا پایا کہ " اے خدا کے بندو! میدانِ جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ "

سعدؓ چلتے چلتے رُک گئے۔ جذبات کا طوفان اچانک ٹھہر گیا۔ نفس کی ساری دنیا اس ایک پکار میں گم ہو گئی۔ جذبات کے نشیلے خواب ایک لافانی حقیقت میں جذب ہو گئے۔ " نئی نویلی دلہن " کے خوابوں سے کھیلنے والا اب اپنی موت کو سینے سے لگانے پر تیار کھڑا تھا۔ دنیا کی لذیذ فرحتوں کی طرف بڑھنے والے قدم رُکے اور خدا کی طرف بڑھ گئے۔ شادی کے سامان کی جگہ انہوں نے جہاد کا ساز و سامان خریدنا شروع کیا۔ پھر راہ جہاد پر وجد کرتے ہوئے چل دیے۔ اب ان کے سامنے شبستان عروسی نہیں اس جنت کا تصور تھا جس میں خدا سے زیادہ حسین تر کوئی شے نہیں —— اب ان کی زندگی اس مقام پر تھی کہ جہاں موت ہی سب سے حسین آرزو ہوتی ہے جہاں انسان سُرخیٔ حنا کے بجائے شہادت کی مقدس آغوش میں اپنی سُرخیٔ خون سے کھیلنا پسند کرتا ہے، جذبات کے خوبصورت محل ہر گام پر ان کو پکار رہے تھے مگر جانے والا قبر کی تنہائیوں کی طرف کھنچا جا رہا تھا —— حسن و عشق کی خلوتیں بازو پھیلا رہی تھیں، مگر شہادت کا جذبۂ بیتاب تلواروں کی خوں آشام پرچھائیوں کی طرف لپکتا جا رہا تھا۔ خدا کا بندہ اپنے خدا کی ملاقات کے لئے بے قرار تھا —— میدانِ جہاد میں ایک خوبصورت عمامہ باندھے ہوئے ایک " مجاہد " جان دینے کے لئے بیتاب نظر آ رہا تھا مگر کوئی نہ پہچان سکا کہ وہ کون ہے؟ آج سعدؓ کی صورت نہیں

ان کی سیرت کا حسن دنیا کے سامنے تھا۔ ان کا جذبۂ جاں نثاری ایک ایسا دلفریب منظر پیش کر رہا تھا کہ دیکھنے والے رشک اور حیرت سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ یکایک ان کے ہاتھ کی سیاہی لباس کے اندر سے ظاہر ہوئی اور سب سے پہلے رسولِ خدا نے پہچان لیا کہ یہ سعدؓ ہیں ـــــ آپؐ نے اُن کو بے اختیار آواز دی۔ مگر آج خدا کے رسولؐ کی آواز بھی ان کو شہادت کی سرمستی سے نہ چونکا سکی۔ وہ بڑھتے رہے ـــــ لڑتے رہے ـــــ لڑتے رہے اور بڑھتے رہے اور عبودیت کی نامعلوم گہرائیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ دنیا پس منظر میں دھندلا رہی تھی۔ کائنات پسپا ہو رہی تھی ـــــ زمین و آسمان سمٹ رہے تھے اور ادب کے ساتھ پیچھے ہٹ رہے تھے اور ـــــ "انسان" اپنے خدا کے قدموں کو چھو لینے کے لئے اپنے وجود کی حدوں سے آگے نکلتا ہوا ہمیشہ کیلئے دنیا سے دُور نکل گیا۔ سیاہ فام جسم سُرخ خون میں نہایا ہوا فرشِ خاک پر پڑا تھا اور روح اپنے معبود سے جا ملی تھی۔ رسول خداؐ ان کی حسین لاش پر جُھکے اور شدتِ جذبات میں بے جان نعش کو زانوئے مبارک پر رکھتے ہوئے بولے ـــــ "اے قبیلۂ ثقیف! خدا نے اپنے سعدؓ کو قبیلۂ ثقیف کی بیٹی سے کہیں زیادہ خوبصورت دولہن عطا فرما دی ہے۔"

سعد الاسودؓ کی کہانی میں انسانی جذبات کے لئے کیسی عبرت کا سامان ہے لیکن کون ہے جو اس عبرت و نصیحت کے خزانوں سے اپنے دامن بھرے۔ کون ہے جو یہ بات سمجھ سکے کہ "انسان" انسانی چہرے کا نام نہیں، بلکہ اس "انسان" کا نام ہے جو آدمی کے اندر چھپا ہوا ہے! ـــ کون جانے کتنے ہی ایسے خوبصورت

چہرے ہیں جن کے اندر ایک "خوفناک انسان" چھپا ہوا ہے ـــــ اس حقیقت کو دیکھنے کے لئے چشمِ سر کی نہیں بصیرتِ ایمانی کی ضرورت ہے ـــــ کیا ہم اس حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں؟! اور اگر نہیں دیکھ سکتے تو سوچو کیا ہم پھر بھی مسلمان ہیں

دردِ انسانیت

ریاضتوں اور مجاہدوں سے تھکا ہوا ایک پریشان بوڑھا چہرہ عبادت گاہ کی کھڑکی سے اس مردِ مومن کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا جس کا نام عمر ابن الخطابؓ تھا۔ دیکھنے والا ایک مسیحی راہب تھا۔ ایک راہب جس نے دنیا کی ہر لذت اپنے اوپر حرام کر لی تھی محض اس لئے کہ وہ اپنے خدا کو پا سکے۔

حضرت عمرؓ نے اس چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور بے اختیار رو پڑے مسلمان حیران تھے کہ اس گریۂ دردناک کا راز کیا ہے؟ ـــ ایک مسلمان ایک غیر مسلم راہب کی صورت کو اپنے قیمتی آنسو کیوں پیش کر رہا تھا؟

"آپ ایک عیسائی راہب کو دیکھ کر رو رہے ہیں!" لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا اور زیرِ لب مسکرائے۔

"ہاں!" حضرت عمرؓ کچھ اور اندیشناک آواز میں بولے "میں ایک غیر مسلم کو دیکھ کر رو رہا ہوں۔ اے خدا کے بندو! اس سے زیادہ رونے کا مقام کیا ہوگا کہ ایک انسان ایسی عبادتوں میں اپنی جان کھپا رہا ہے جن کا انجام ہلاکت اور عذابِ جہنم کے سوا کچھ نہیں۔"

حضرت عمرؓ نے جو منظر دیکھا تھا وہی منظر آج ایک بہت بڑے پیمانے پر ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے — مگر کہاں ہیں وہ لوگ جو آگ کے یقینی عذاب کے تصور کو کانپ اُٹھتے تھے! کہاں ہیں وہ انسان جو اپنی جانوں پر ترس کھاتے ہوئے غیر مسلموں کی ناکام عبادتوں پر پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے؟ — کل اسلام کفر کی حالتِ زار پر رو سکتا تھا مگر آج کفر بھی شاید ہمارے "اسلام" پر رو رہا ہے۔ کیا ہم مسلمان ہیں؟

جنّت کے خریدار

بارگاہِ رسالت میں ایک جاگیر کا مقدمہ درپیش تھا۔ ربیعہ مدعی نے اور امراء القیسؓ مدعیٰ علیہ — قریب تھا کہ پوری جاگیر امراء القیس کی ایک قسم کی قیمت میں ان کے ہاتھ آجائے کہ اچانک رسولِ خداؐ نے فرمایا:۔

"خدا کو یہ بات پسند نہیں کہ صرف مالی منفعت کے لئے اس کا نام استعمال کیا جائے۔ ایسا شخص جب اپنے خدا سے ملاقات کرے گا تو اس کو اپنے سے خفا پائے گا۔"

"لیکن اے خدا کے رسولؐ!" امراء القیسؓ نے کہا "اگر کوئی شخص قسم سے بچنے کے لئے اپنے جائز حق سے دست بردار ہو جائے تو اس کا انعام کیا ہے؟"

"خدا کی جنت" — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ایک لمحے — ایک ڈرامائی لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔ ربیعہ کے چہرے سے مایوسی اور اضطراب ظاہر ہوا کہ مدعا علیہ کی ایک قسم اس جاگیر کو اپنے قبضے میں

لیا چاہتی ہے مگر وہ نہ جانتے تھے کہ امر ا لقیس اینٹ پتھر کی دنیا سے دُور اپنے خدا کی جنت کے تصور میں گم ہو چکے ہیں ـــــ قبروں سے پٹی ہوئی زمین حیاتِ ابدی سے جگمگاتی ہوئی جنت کے آگے ماند پڑ چکی ہے۔ ایک بندے نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ دنیا کا جائز حق حاصل کرنے کے لئے اپنے خدا کا مقدس نام استعمال کرنا گوارا نہ کرے گا۔

"میں قسم نہیں کھاؤں گا ـــــ میں قسم نہیں کھاؤں گا ـــــ خواہ میری یہ جاگیر میرے ہاتھ سے جاتی رہے!"

یہ ماضی کی بات تھی مگر حال کیا ہے؟ ـــــ حال یہ ہے کہ ہم دنیا کے حقیر منافع حاصل کرنے کے لئے جھوٹی قسموں تک سے دریغ نہیں کرتے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں! جی ہاں ہم مسلمان ہیں!!

اسلام ـ ایک بے پناہ سچائی

یہ دنیا ـــــ خدا سے مایوس اور مذہب سے بیزار نام نہاد مہذب دنیا جو خدائے حیّ و قیوم کے بجائے سائنس کے بے حس آلات پر اعتماد کرتی ہے۔ ـــــ جو حقیقت آشنا بصیرت کے بجائے خوردبینوں کے کمزور شیشوں پر دل و جان سے فدا ہے۔ جو حق گوئی کو چھوڑ کر حق پوشی کے فن پر فخر کرتی ہے اور جو سچائی پر طاقت کو اور سوزِ دروں پر قوتِ بازو کو فوقیت دیتی ہے ـــــ ہاں یہی مغرور دنیا خواہ اور سب ہی کچھ کر چکی ہو لیکن کبھی یہ نہیں کر سکی کہ انسان کے قلب و

روح کی گہرائیوں میں گھس جائے اور وہاں نفرت وانتقام کے اُبال کو ٹھنڈا کرکے اسے محبت و سپردگی کے لطیف ترین جوش میں تبدیل کردے۔ محبت اور نفرت کے پُراسرار جذبات۔ تہلکہ ڈالنے والے عظیم ترین جذبات پر قابو پانا "جھوٹ" کے لیے کبھی بھی ممکن نہیں ہوا۔ یہ کام ہمیشہ سچائی نے کیا ہے دھوکے اور جعل سے ہمیشہ انسان کی فطرتِ صالحہ نے نفور کیا ہے اور "سچ" کو جہاں کہیں محسوس کیا ہے فی الفور اس کی عظمت کے آگے جذبات نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ نفس اور ضمیر کی کشمکش میں سچائی کے اعتراف بالجہر اور اعلائے کلمۃ الحق کی توفیق صرف ان مٹھی بھر انسانوں ہی کو حاصل ہوتی رہی ہے جو سچ کو جاننے کے بعد اس کو ماننے اور استعمال کرنے کی جرأت پیدا کرسکے ہوں — یہ وہ نقطۂ عروج ہے جہاں آدمی خوب محسوس کرلیتا ہے کہ اس دنیائے فانی میں جو شے ہر شے سے زیادہ قیمتی اور عزیز ہے وہ زندگی نہیں، بلکہ سچائی پر جان دینا ہے۔ زندگی۔ حقیقی زندگی کا پہلا سانس ہی آدمی اس وقت لیتا ہے جب اس کے خون کا آخری قطرہ تک سچائی کو اپنے کردار کی "لوحِ محفوظ" پر نقشِ دوام بنادینے کے کام آجائے۔

اس زاویئے سے جب ہم اسلام کا تاریخی مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ کس طرح اور کس حد تک اسلام کے پیغام نے اپنے جانی دشمنوں کے جذبات پر فاتحانہ اثر کیا۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ وقت کی سرکش سیاسی قوتوں کو پست و زبوں کرکے دکھایا۔ مٹھی بھر انسانوں کی ننھی سی ٹولی نے آہن و فولاد میں ڈوبی ہوئی غنیم کی صفوں کو پرِ کاہ کی طرح اڑا

میں اُڑا کر رکھدیا ـــــ اور چٹانوں کی صلابت رکھنے والے شاہی قلعوں کو عرب کے پیدائشی غلاموں کے قدموں پر خم کر دیا۔ بلکہ اس نے اس سے بھی زیادہ حیرتناک فتح یہ بھی حاصل کی کہ جو انسان پوری قوت سے اس کا نام سننے سے جلتے تھے ان کی نفرت کو محبت اور سپردگی کے سانچوں میں ڈھال دیا ـــــ جذبات کے طوفانی دھارے کا رُخ بدل دیا۔ دل کی دھڑکنوں میں تہلکے ڈالدیئے ـــــ آرزؤں کی قسمت بدل دی اور جذبات وخیالات کی اَن دیکھی دنیاؤں کو مسخر کر کے ایک انسان کو بالکل دوسرا انسان بنا کر دکھایا ـــــ اسلام بھی اگر انسان کی "شاطرانہ دماغ" کی کوئی سیاسی اور نظریاتی تخلیق ہوتا تو جو لوگ ہوش وحواس کے عالم میں اس کے نام سے متنفر تھے اور اُس کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ دینے میں پسینے پسینے ہوئے جاتے تھے کبھی بھی اسلام کو دل کی گہرائیوں کے ساتھ اپنا کر اس کی راہ میں پروانہ وار قربانیاں پیش کرنے کی تحریک نہ پا سکتے ـــــ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ جو دشمن ایک دو دن نہیں ـــــ ـــــ سالہا سال تک اپنی دولت اور خون پسینے کو اسلام کو مٹا دینے کی راہ میں پانی کی طرح بہاتے رہے ہوں ـــــ جن کی پوری زندگی "اسلام دشمنی" کے مرکز پر سمٹ گئی ہو جو اس نفرت کے خوں آشام جنون میں دن رات کا سکون وآرام تج چکے ہوں وہ اچانک اسلام کو جھوٹ سمجھتے ہوئے اس پر اس طرح قربان ہو جائیں کہ جس کا خواب بہت سے سچائیوں کو ماننے والے بھی نہ دیکھ سکیں۔ اگر تاریخ انسان کے اپنے ہی ماضی کی کہانی ہے اور یہ کہانی ہمارے مستقبل کی میزانِ فکر وعمل میں کوئی بھی وزن رکھتی ہے تو اسلام کی اس نفرت سوز ـــــ انقلاب آفریں سچائی سے زیادہ سچا اور وزنی کوئی واقعہ اس تاریخ کے دامن میں موجود نہیں ـــــ

سہیل بن عمرو بھی اسلام کے ایک ایسے "تاریخی دشمن" رہ چکے تھے جن کو اس پیغام کو خود قبول کرنا تو کیا دوسروں کو قبول کرتے دیکھنا بھی شاق تھا۔ لیکن ان کی تقدیر کی "ستم ظریفی" سے جب اسی انسان کے گوشت وخون سے بنا ہوا اس کا اپنا بیٹا "مسلمان" ہوگیا تو سہیل کی اسلام دشمنی جنون کی حد تک پہنچ گئی۔ گلی گلی اور سڑک سڑک پر وہ اس نفرت کی آگ اگلتے پھرتے ـــــ زہر میں بجھی ہوئی تقریروں سے اسلام کے خلاف نفرت وانتقام کا آتشیں اشتعال پھیلاتے ـــــ لوگوں کو پکار پکار کر جمع کرتے اور کہتے کہ ان کی زندگی کا سب سے پہلا کام اس "پیغام" کو موت کے گھاٹ اتار دینا ہے ـــــ باپ کے مجنونانہ ظلم واستبداد کی یہ مہم "غیروں" ہی کو تختۂ مشق بنانے پر اکتفا نہیں کر رہی تھی بلکہ اس نے پوری بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ شفقتِ پدری کی شہ رگوں کو بھی کاٹ دیا تھا اور "باپ" کے ہاتھوں نے اپنے مسلمان بیٹے کو آہنی زنجیروں میں جکڑ کر قید وبند میں گھٹ گھٹ کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو محمد عربیؐ کے چاہنے والے انسانوں کے لئے ایک ناقابل برداشت گستاخ ترین کافر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جس کو رسول کریمؐ کے خلاف زہرناک لاف وگزاف میں ڈوبا ہوا دیکھ کر عمر ابن خطابؓ کی غیرتِ حق بار بار خدا کے رسولؐ کے سامنے یہ اجازت حاصل کرنے کے لئے تڑپ تڑپ کر آتی تھی کہ "میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے دانتوں کو پاش پاش کر دوں" ـــــ یہی وہ انسان تھا جو اسلام کے خلاف پہلی جنگ ـــــ جنگِ بدر میں کفر کی صفِ اوّلیں میں پیچ وتاب کھاتا ہوا نظر آیا ـــــ یہی وہ شخص تھا جس کے کفر کے مشتعل غلو نے صلح حدیبیہ کی دستاویز میں "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کاٹ دینے کی پہلی آواز اٹھائی تھی ـــــ یہی وہ اسلام کا آخری مخالف تھا جس نے اس وقت بھی اسلام

کے خلاف تلوار اٹھائی جب مکہ پر مسلمانوں کی چڑھائی ہو رہی تھی اور بڑے بڑے "اشتہاری مجرم" فرار و مصلحت کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ لیکن اب وقت آگیا تھا کہ ظالمانہ طاقت کا طلسم ٹوٹے اور مظلوم سچائی فاتحانہ شان سے حیات و کائنات کے روشن افق پر نمودار ہو ـــــ کفر و شرک کے ہزاروں سالہ بتکدے ان انسانوں کے قدموں پر اوندھے مُنہ گر رہے تھے، جن کو ضعیف و ناتواں سمجھ کر ان کے گھروں اور بستیوں سے تہی دامن اور بے دست و پا کر کے نکالا گیا تھا۔ لیکن آج اس کے باوجود ان کے فاتحانہ سر ایک نامعلوم طاقت کے احترام سے جھکے ہوئے تھے ـــــ نفرت و انتقام کے خلاف جوابی ردِ عمل کے بجائے ان کے سینے محبت و انسانیت کے جوش سے پھٹے جاتے تھے ـــــ ہاتھوں میں چمکنے والی تیز و برّاں تلواروں سے زیادہ ان کے سوز دروں کا یہی وہ "تیر نیم کش" تھا جو سہیل کے قلب میں ترازو ہو گیا ـــــ ہتھیاروں سے صرف سر جھکائے جا سکتے ہیں مگر اخلاق کی زد میں پتھریلے دل جھک جاتے ہیں۔ سہیل نے مایوسی کے ساتھ جب رسولِ خدا سے "امان" چاہی تو ان کو کامل یقین تھا کہ اس کے جواب میں ان کی گردن اڑا دی جائے گی اور زبان قلم کر دی جائے گی اور اس طرح ان کی عمر بھر کی اسلام دشمنی کا حساب پل بھر میں ہمیشہ کے لئے چکا دیا جائے گا۔ لیکن جس باپ نے اپنے بیٹے کو حق پسندی کے جرم میں بدترین عقوبتوں کے شکنجے میں کسا تھا اس بیٹے نے آج باپ کی دردناک پکار سُنی۔ وہی آج ایک سچا انسان ثابت ہوا اور وہی اپنے باپ کی جان بخشی کی درخواست رسولِ خدا تک پہنچانے کے کام آیا۔ سہیل اس دوران میں مایوسی کی کرب انگیز کیفیت میں زندگی کے سانس گن رہے تھے بیٹے کی غمگساری میں خون کے فطری جوش کی توجیہ

کی جا سکتی ہے، مگر محمد عربیؐ اپنے جانی دشمن پر کیوں ترس کھانے لگے! سہیل یہی سوچ رہے تھے اور ان کا وہ ماضی ایک ہولناک تصویر کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا جب وہ اسلام ـــــ خدا اور محمدؐ کے خلاف کے کے طول و عرض میں آگ لگاتے پھرتے تھے. لیکن سہیل یہ دیکھ کر حیرت و عقیدت سے سکتے میں آ گئے. کہ رسالت کا کشادہ سینہ اپنے اتنے بڑے دشمن کے لئے بھی تنگ نہیں اور یہ کہ ٹھیک اس وقت جب عمر بھر کے طویل جرائم کی آخری سزا دی جاتی تھی. رحم طلبی کے ایک پشیمان پکار پر محمد عربیؐ نے ان کی طرف رقت و شفقت کے نرم بازو پھیلا دیئے ہیں ـــ یہ سہیل کی زندگی کا وہ پہلا دن تھا جب ان کی زبان نے حضورؐ کے اخلاق کو بے ساختہ خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا " محمدؐ کبھی بھی بُرے نہ تھے. میں نے اُنکو بچپن میں بھی نیک دیکھا تھا اور بڑے ہو کر بھی ان کو نیک ہی پا رہا ہوں" یہ الفاظ کسی شاعر کے الفاظ نہ تھے ـــ یہ کسی چاہنے والے کی مبالغہ آرائی نہ تھی ـــ یہ کسی عزیز دوست کی اندھی محبت کا جوش نہ تھا ـــ یہ دشمن جاں کے الفاظ تھے ـــ جو گھر کی خطرناک تنہائی میں چھپا ہوا ایک انسان خود ہی کہہ رہا تھا اور خود ہی سُن رہا تھا۔ نہیں! یہ زبان کی چند جنبشوں سے ڈھلے ہوئے الفاظ نہ تھے۔ یہ دل کی دھڑکنیں تھیں ـــ یہ احساس حق کی زلزلہ انگیز دھمک تھی پہلی دھمک جو باطل اور جھوٹ کی ہٹ دھرمیوں کی ایک عمر دراز کی بنیادیں ہلا چکی تھی۔ یہ نفرت و انتقام کی وہ آخری ہچکی تھی جو صرف حق آشنا ہونٹوں پر سُنائی دیتی ہے ـــ آخر حق و صداقت کا یقینی اثر شروع ہوا اور اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرنے لگا اور جنگِ حُنین سے واپسی پر آنحضرتؐ نے دیکھا کہ سہیل

ہیں جو اس وقت اسلام کے دوست تھے جب ہم اسلام کے بدترین دشمن تھے۔"

اسلام اب ایک مقناطیسی کشش کی طرح ان کے قلب و دماغ کو مطالعۂ حق کی طرف کھینچے لئے جا رہا تھا۔ ایک طرف وہ جہاد کی راہوں میں خونِ حیات کے قطرے پیش کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کی آنکھیں کتاب اللہ کے اوراق پر آنسوؤں کی بارش کر رہی تھیں —— وہ شخص جو قرآن پڑھنے والوں پر کبھی بلائے بے درماں بنکر ٹوٹ پڑتا تھا۔ قرآن کا لفظ لفظ اس کے جذبات عبودیت میں تلاطم پیدا کئے دیتا تھا۔ قرآن شریف پڑھتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ —— اور گلوگیر آواز کتاب اللہ کے الفاظ کو سینے سے لگائے سینے کی گہرائیوں میں بیٹھ جاتی تھی۔ حق کوشی نے دل میں درد اور دماغ میں حقیقت پسندی کا وہ نور پیدا کر دیا تھا کہ جاہلی عصبیت کی فضا اس کے شفاف نور میں نہا گئی تھی۔ کسی نے ایک بار کہا "تم معاذؓ کے گھر جا کر قرآن پڑھتے ہو —— وہ تو ایک خزرجی ہے اور تم ...."

"کیا کہہ رہے ہو!" سہیلؓ کے سینے میں جاہل عصبیت کے بجائے اعترافِ حق میں بچھڑ جانے کی دیرینہ خلش جاگ اٹھی "کیا کہہ رہے ہو! —— اسی شوخیِ فکر نے ہماری یہ درگت بنائی کہ لوگ خدا شناسی میں ہم پر بازی لے گئے —— کاش —— ہم پہل کرنے والوں میں ہوتے! —— کاش!! —— مگر خدا کا شکر ہے کہ اسی نے ہمیں بچا لیا ورنہ اگر ہم کفر کی موت ہی مر جاتے تو ہمارا انجام کیا ہوتا! —— نہیں! میں معاذؓ کی خدمت میں جاتا رہوں گا۔ ضرور جاتا رہوں گا۔"

اور یہ کہتے کہتے ان کی آواز تھرتھرائی اور آنکھوں میں مقدس آنسو جھلملا گئے۔

سر سینے پر ڈھلک گیا اور سینہ میں دھڑکتا ہوا دل کسی نیم بسمل پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ یکایک نہ جانے ان کو کیا یاد آ گیا تھا۔ ! کونسی ظالم یاد تھی جسنے حال کو ماضی کی پہنائیوں میں دھکیل دیا تھا اور یاد کرنے والا اپنے وجود تک کو بھول گیا تھا۔ سوچ اور اضطراب میں سینے پر ڈھلکا ہوا سر پھر اٹھا۔۔۔ آنسوؤں سے گلنار پُر نور ایمانی آنکھیں مخاطب کے چہرے پر جم گئیں۔ چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں کا منظر کانپ گیا اور لرزتی ہوئی آواز ایکبار پھر خشک سے ہونٹوں پر کراہ اٹھی "اس وقت مجھے اس دن کی یاد آ رہی ہے جب میں خدا کا بندہ ہوتے ہوئے یہ بات نہ جانتا تھا کہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ جب ایک درخت کے سائے میں ایک خدا کے بنائے ہوئے دو طرح کے انسان ۔۔۔ کافر اور مومن یکجا ہوئے تھے اور حدیبیہ کی دستاویز صلح لکھی جا رہی تھی ۔۔۔ اس وقت بھی وہ بدنصیب انسان تھا جس نے پاگلوں کی طرح یہ چیخ ماری تھی کہ کاغذ پر "محمد رسول اللہ ؐ" کے الفاظ برداشت نہیں جا سکتے ۔۔۔ مٹاؤ ۔۔۔ ان کو مٹاؤ ! ۔۔۔ اور ۔۔۔ آج میں ان الفاظ پر خود کو مٹا دینے کی حسرت میں تڑپتا ہوں تو مجھے اپنی زندگی کا یہ تاریک واقعہ جاں کنی سے زیادہ روح فرسا محسوس ہوتا ہے ۔۔۔ اے ضرار ! میں خدا کے رسول ؐ کے سامنے جاتا ہوں تو مجھے اپنے وہی الفاظ تیر و نشتر بن کر روح میں گھستے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور مجھے حضور ؐ سے آنکھیں ملاتے ہوئے شرم آتی ہے !"

کیسے تھے وہ لوگ بھی جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان کی غیرتِ حق، غیرتِ

ایمانی آخر کیا چیز تھی جو اُن کے ایامِ کفر کی بداعمالیوں پر خون کے آنسو رلاتی تھی — جو نادانی کی خطاکاریوں پر اس طرح سرافگندہ و دلفگار تھے جیسے کسی نے جان بوجھ کر حق و صداقت کی عدالت میں کوئی سنگین جرم بقیدِ ہوش و حواس کیا ہو! لیکن ہم ٹھیک اسی سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں — ہم نے حق کی گود میں شعور کی پہلی آنکھ کھولی — ہم پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہمیں کفر کی ہوا تک نہیں لگی۔ مگر اس کے باوجود ہمارا احساسِ گناہ پتھر ہے — پتھر سے زیادہ سخت ہے — ہم ایامِ ایمان کی سیاہ کاریوں کی فردِ جرم اٹھائے ہوئے اپنے خدا کی "عدالتِ محشر" کی طرف یوں ہنستے کھیلتے جا رہے ہیں جیسے دوزخ کی آگ اور جنت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں کوئی فرق نہیں! جیسے خدا کی رحمت اور خدا کے قہر و جلال میں تمیز کرنے کی حس ہی ہمیشہ کیلئے ماری گئی ہو! اے وائے برحالِ ما! ہم کہ "مسلمان" ہیں! — کیا۔۔۔۔ کیا ہم مسلمان۔۔۔۔ ہیں؟!۔۔

— نہیں! — کیا ہم مسلمان ہیں؟ —

—————«« ۲ »»—————

عبداللہ بن اُمیہ کو "اسلام دشمنی" اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ نفرت و انتقام کا آتشیں لاوا ان کی رگ و پے میں خون بن کر گردش کر رہا تھا۔ یہ دشمنی ان کو اس المناک حد تک لے گئی تھی جہاں آدمی کا زاویۂ نظر یکسر اُلٹ کر رہ جاتا ہے — جہاں "جھوٹ" ایک مایۂ نازِ حقیقت اور خود سچائی ایک مضحکہ خیز جھوٹ نظر آنے لگتی ہے۔ جہاں انسان اپنے ضمیر کی موت پر رو پڑنے کے بجائے سچائی کو دیکھ کر نفرت سے ہنستا ہے — دیوانہ وار قہقہے

لگتا ہے۔

اس "ٹریجڈی" کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ نے قریشی زعما اور معزز سربراہوں کے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اس ماحول نے شروع سے ان کو یہ بات سمجھائی تھی کہ دنیا کی قدر و منزلت ہی وہ پیمانہ ہے جس سے کسی کی عظمت کو ناپا جا سکتا ہے ان کی نظر میں ان کے "باپ" ایک عظیم شخصیت تھے۔ کیونکہ مکے کی سوسائٹی ان کو سر اور آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔ قریش کے سربرآوردہ کافران کی نظر میں اونچے لوگ تھے اس لئے کہ ان کی سماجی قیادت اور معاشی خوشحالی کا وزن قدم قدم پر محسوس کیا جاتا تھا۔ بھلا وہ "اسلام" ان کے جذبات کو کیا اپیل کر سکتا تھا جو غلاموں اور غریبوں لاچاروں اور بیکسوں کے درمیان ظاہر ہوا۔ فاقوں کی آنچ میں تپتا ہوا "اسلام" زخموں اور رستے ہوئے آبلوں کی ٹیس سے چور چور اسلام — جو ایک ان دیکھے معبود کے قدموں کو چھونے کے لئے آنکھوں دیکھی تمام دنیا کی ٹھوکریں برداشت کر رہا تھا۔ ابھی عبداللہ انسانی زندگی کے اس انقلابی موڑ سے بہت دور تھے جہاں زندگی اپنے حقیقی خالق کا تعارف حاصل کرتی ہے تو تخلیق کی یہ پوری بیکراں کائنات ایک تنگ و تاریک زنداں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان کی آخری آرزو یہ اور صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی جان جاں آفریں کے قدموں پر جتنی جلد نثار کر دے اتنا ہی بہتر ہو۔ جنت ارضی کے سراب سے دور جہاں حقیقی جنت کی خوشبو سونگھ کر انسان شہادت کے لہو میں نہا جانے کے لئے تڑپ اٹھتا ہے — ابھی عبداللہ رض ایمان و یقین کے اس لطیف موڑ سے ناواقف تھے۔ کفر و شرک کی قہرمانیت کے مقابلہ میں ابھی حق پسندوں کے کمزور دعا پھر بھی ان کو دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے روشن اور تابناک سینے

اور فولادی ایمان و یقین نہیں — اس لئے پھٹے پرانے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی "کمزوری" کو گرجتی چمکتی "طاقت" کے منہ آتا ہوا دیکھ کر وہ سوائے اس کے اور کیا کرتے کہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے ہنس پڑیں اور حقارت و استہزاء کی شدت سے قہقہہ لگاتے چلے جائیں۔ ابھی وہ یہی کر رہے تھے۔ ان کے باپ کا قہر و غضب ایک شکل میں اسلام پر شعلہ باری کر رہا تھا تو عبداللہ کی اپنی سرد مہری اور حقیقت ناآشنا قہقہوں کی بوچھار دوسری شکل میں حقیقت کشی کی یہی مہم کئے کے طول و عرض میں چلا رہی تھی۔

"کیا۔ تم خدائے واحد کے فرستادہ ہو؟" عبداللہ نے بے رحمانہ و گستاخانہ شرارت سے خدا کے رسولؐ کو سرِ راہ چھیڑتے ہوئے کہا۔ "جی! کیا آپ ہی خدا کے رسول ہیں؟"

سوال کرنے والا جس انداز سے سوال کر رہا تھا وہ کس قدر جارحانہ ہو گا اس ہستیؐ کے لئے جس کے احساسات پر نزاکتِ احساس کی انتہائیں ختم ہوتی تھیں۔ گستاخی اور خوں آشام درندگی کے موڈ نے سوال کرنے والے انسان کو ایک ایسے جانور کی شکل میں ڈھال دیا تھا جس کو حیوانیت بھی دیکھ لے تو شرم سے سر جھکا لے۔ لیکن آج درندگی کی زد میں وہ انسان کامل تھا جو دشمنوں کو پیار کرتا تھا۔ جو جانوروں کو بہترین انسان بنانے کے لئے ریگستان کے آتشیں ذروں کی پیاس اپنے خونِ دل و جگر کے قطروں تک سے بجھانے کے لئے تیار تھا صرف اس توقع اور حسرت میں کہ آدمی اس آگ میں کوئلہ بن جانے سے بچ جائے جس کا ایندھن پتھر اور پتھر دل انسانوں کی ہڈیاں بننے والی ہیں بے حسی اور جراحت کاری کے اس سوال پر اس نے نفرت سے منہ نہیں موڑا۔ قلب

روح کی دردمندانہ ٹیس کے ساتھ گوش بر آواز ہو گیا اور فرطِ درد سے پکار اٹھا۔ ہاں! اے پاگل انسان! خود پر ستم توڑنے والے انسان! تیرے سامنے اس وقت تیرے خدا کا آخری رسول ہی کھڑا ہوا ہے۔ جس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تجھے تیرے خدا کا آخری پیغام پہنچا دے اور بس۔"

عبداللہ نے یہ الفاظ سُنے اور تھوڑی دیر کو سناٹے میں آ گئے! یہ کون شخص ہے جوان سے اس طرح باتیں کر رہا ہے جیسے کوئی اپنا دل چیر کر دکھلا رہا ہو! نفرت و حقارت کے جواب میں یہ شدتِ دردمندی! — مضحکہ اور استہزاء کے جواب میں یہ اتاہ سنجیدگی کا وقار! — انکار و تردید کی ہٹ دھرمیوں کی ٹھیک ضد میں سچائی کے لامتناہی یقین کا اٹل ثبوت! — لیکن جب دل اور نگاہ کے درمیان زنگ آلود فطرت کا "حجابِ مستور" پڑا ہوا ہو تو آدمی سب کچھ دیکھتا ہے اور کچھ نہیں دیکھ پاتا! — سب کچھ سنکر بھی یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ عبداللہ ابھی اسی المناک منزل میں تھے۔ وہ کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ سچائی اپنے حسن و جلال کے ساتھ سامنے موجود ہے۔ مگر آنکھیں دل کی گرہ نہ کھول سکیں تو عقیدت کی روشنی باطن کے زنگ خوردہ بند دروازوں سے ٹکرائی اور نفس کی اندھیر نگری میں گم ہو گئی۔ انسان حق کو پا رہا تھا مگر خود کو ابھی نہ پا سکا۔ روح نے اس نارسائی کے درد میں چیخ ماری لیکن ہونٹوں نے اس کو "وحشت زہرخند" میں اُلٹ دیا۔ فطرتِ انسانی اندر پڑی سسک رہی تھی مگر ہونٹوں سے قہقہے نکل رہے تھے اور رسالت کے خلوص کا جواب دے رہے تھے۔ انسانی خود فریبی کی اس احمقانہ دیوانگی پر پیغمبر کا دل بھر آیا۔ پرائے غم بھرتی ہوئی آنکھیں سوئے فلک اٹھیں اور وہ ہونٹ جنکو کبھی جھوٹ کی

آلودگی نے چھوا تک نہ تھا دعائیہ سرگوشی میں جنبش کرنے لگے " اے خدائے واحد! تو نہ خفا ہو جانا! — یہ بدنصیب تجھے جانتے نہیں۔ تیرے رسول کو پہچان نہیں رہے۔ ورنہ ایسا نہ کرتے! — رحم کر۔ اے ارحم الراحمین! رحم فرما!" اور " بدنصیب انسان" نے اس " درد " کی جو پذیرائی کی وہ یہ تھی کہ صداقت کی پیمائش کے لئے شدیدوں کا پیمانہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا " میں تمہیں رسول مان لوں گا۔ مگر پہلے زمین سے پانی کا اچانک ایک چشمہ نکال کر دکھاؤ۔ یا صرف اتنا کر دکہ پلک جھپکتے تمہارے لئے ایک قصر زرنگار تعمیر ہو جائے "۔

زمین سے اچانک پانی نکال دینا اور چشم زدن میں سونے کا محل تیار کر دینا جتنا ناممکن تھا اس سے کہیں زیادہ ناممکن یہ تھا کہ یہی بے تکے مطالبے پیش کرنے والا کسی دن خود بخود اٹھے اور حق کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے — اسلام کی تیر بہدف سچائی نے یہ ناممکن ممکن کر دکھایا۔

مکہ سے خدا کا نام لینے والے ایک ایک کر کے نکال دئے گئے تھے بدر واحزاب کے میدانوں میں اسلام کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش خود موت کے گھاٹ اتر چکی تھی۔ کہ ایک دن نہ جانے کیا سوچ کر عبداللہ مکہ سے چل پڑے — وہ " اسلام " کی طرف جا رہے تھے۔ مگر اسکو مٹانے کے لئے نہیں اس کی ادائے حق پہ مٹ جانے کے ذوق وطلب میں! — شاید یہ انقلاب اس دن شروع ہوا تھا جب مکے سے محمد عربیؐ اور ان کے غلاموں کے جانے سے عبداللہ کے نزدیک ایک بھیانک خلا پیدا ہوا تھا۔ جب ان کو ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا انسان نہ ملتا تھا جو ظلم کے جواب میں ترس کھاتا ہو۔ جو بے حسی کے خون آشام قہقہوں سے گھائل ہو کر بھی

جوابی حملہ نہ کرے۔ جو نفرت و حقارت کی ٹھوکروں پر بھی دعائے خلوص کے پھول برسائے وہ اس سوز کو کیسے بھول جاتے جو بدترین سرد مہریوں کے جواب میں بھی سرد نہ ہوتا تھا۔ وہ اس درد بھری سنجیدگی کی یاد کو دل سے کس طرح نکال دیتے جو بدترین استہزاء کی زد میں بھی انسان دوستی کی شمع جلائے رکھتی۔ انھوں نے مکّے میں مسلمانوں کو زخم کھاتے بھی دیکھا تھا اور بدر و اُحد کے میدانوں میں تلوار اُٹھاتے بھی۔ مگر وہ جہاں بھی نظر آئے ان کے چہروں سے وہی حقیقت کی معصومیت ٹپکتی تھی۔ وہی سوز، وہی درد و گداز۔ وہی بے لوث سچائی کا سوز ان کی سیرت اور صورت سے چمکتا دکھائی دیتا جس کو انھوں نے محمد عربیؐ کی ذات گرامی میں ہمیشہ نقطۂ عروج پر دیکھا تھا۔ کردار کی یہ طاقت اور اخلاق کی یہ فاتحانہ تاثیر ہی تھی جو عبداللہ کے وجود میں ہر غلط فہمی کی بنیادیں ہلا رہی تھی — اور آج وہ دھوکے کے ہر اندھیارے سے نکل آنے کے لئے بیتاب تھے۔ جو اسلام ان کی دل کی دنیا میں ہنگامہ اٹھائے ہوئے تھا اس کو زبان پر لانے کی تڑپ انھیں حضورؐ کی تلاش میں کھینچے لئے جا رہی تھی۔ ماضی کے جرائم کا احساس رہ رہ کر ان کے ذوق و شوق کی پیش قدمی روک دینا چاہتا، مگر مستقبل بنانے کی بے کلی پھر آگے کو دھکیلتی لے جاتی۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کی پشیمان صورت اس قابل نہیں کہ وہ براہ راست باریابی کی جرأت کی جا سکے۔ انھوں نے اپنی قریبی عزیزہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کا سہارا لیکر حضورؐ سے ملاقات کی اجازت طلب کی۔ ہنس ہنس کر سینے پر زخم لگانے والے کو دروازے پر حاضر پا کر آپ کو مکہ کا وہ ستم یاد آ گیا۔ عبداللہ کی وہ ساری کہانی نظروں میں پھر گئی جس میں نفرت کے دلخراش قہقہے تھے۔ حقیقت کا خوں آشام مذاق تھا۔ دار و رسن کی مسلسل مشق تھی

اور وہ سب کچھ تھا جو دلوں کو جوڑنے کا ہر نفسیاتی امکان ہمیشہ کے لئے ختم کر دے
لیکن اس ظالم دشمن کی آہ و زاری سنکر جوابی انتقام کے جوش میں پڑنے کے بجائے آپ نے ظالم کو حرفِ ستم یاد دلائے اور جراحتوں کی ٹیس سے مدھم آواز میں فرمایا" کیے ہیں انھوں نے میرے لئے کونسی کسر اٹھا رکھی تھی جسکو پورا کرنے کے ارادے سے اب یہاں آئے ہیں۔

یہ تھی وہ لطیف سزا جو عمر بھر کے قہر و ستم کے جواب میں ایک گردن زدنی دشمن کو اپنے مکمل اختیار میں پا کر دی گئی۔ لیکن نہیں! ۔ یہ "سزا" نہیں "انعام" تھا۔ یہ سختی نہیں ہمدردی کی تھی۔ مشیت چاہتی تھی کہ حق کی طرف جذباتی ذوق میں بڑھنے والا انسان مخالف جذبات کا دھکا برداشت کرے۔ اور سچائی کی نئی پاکیزگی کو پانے سے پہلے ہر پرانی کثافت کو اذیت کی آگ میں تپا کر کندن بنا لے۔ عبداللہ نے اس لطیف سزا کا یہ فائدہ اٹھایا۔ ناکامی اور آخری زیاں کے تصور سے وہ بھی بے آب ہو گئے۔ مایوسی کی آخری اذیت نے تلافیِ مافات کے درد کو ناقابلِ برداشت حدود تک پہنچا دیا۔ اور عبداللہ ان بلندیوں کو چھونے لگے جہاں حقیقت پسندی کے سیلِ رواں میں انسان زندگی کی محبت تک کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے

"محمد کے در سے ٹھکرایا ہوا انسان جینے کے قابل نہیں۔" عبداللہ نے آخری جذباتی پیغام دیا" اگر میرے جرائم معاف نہ ہوئے تو عبداللہ خود کو موت کی سزا دیگا۔ میں دشت و صحرا میں تڑپ تڑپ کر جان دیدوں گا۔ مگر اب اس دنیا میں واپس نہ جاؤں گا جس کی فضا میں کفر و شرک کا زہر ہے۔

رحمت اللعالمین نے یہ پکار سنی تو عبداللہ کے اقدام کی پختگی نے ماضی کی پرزائی

تلخی یکسر شعلا دی۔ خدا کی طرف چلنے والے پر عفو و درگذر کا سینہ کھول دیا گیا اور عبداللہ نے محسوس کیا کہ ٹھیک اس سینے میں جس پر ان کے اپنے ہاتھوں نے سالہا سال زخم لگائے تھے رحمت و رافت کا پوری قوت سے دھک دھک کر رہا ہے۔ محمد عربیؐ کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل سے مس ہو کر عبداللہ کی للہیت میں تلاطم بپا ہو گیا۔ سچائی پر قہقہے لگانے والا انسان اب فکرِ آخرت کی تصویر بن کر رہ گیا۔ زبان سے حق کی گواہی تسکین دینے کے لئے کافی نہ تھی۔ اب تو ہر رگ و پے سے یہ شہادتِ حق خون کا فوارہ بن کر پھوٹ نکلنے کو بیتاب تھی۔ مستقبل کو روشن بنا لینے کا یقین ہی اس وقت تک مکمل نہ ہوتا تھا جب تک ماضی کی سیہ کاریوں کو آنسوؤں اور خون کے قطروں سے دھو ڈالا نہ جائے۔ تلافیٔ مافات کے اس اضطراب نے عبداللہ کے پورے وجود میں گرم گرم سیماب کوٹ دیا تھا۔ وہ جہاد کے انتظار میں ایک ایک گھڑی گن گن کر گذار رہے تھے اور جب فتح مکہ، جنگ حُنین میں جان دینے کی یہ حسرت نہ نکلی تو طائف کی مہم میں پروانہ وار شریک ہوئے اور اسلام پر پروانہ دار نثار ہو گئے۔

یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے تاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ اسلام کتنی بڑی، کتنی قیمتی سچائی ہے۔ کھوکھلے عقیدوں متزلزل قدموں کے لئے جس کی گرد تک پانا ممکن نہیں۔ اسلام جو لفظوں سے نہیں خونِ دل و جگر دے کر خریدا جا سکتا ہے۔ جس کی قیمت چکانے والہانہ تڑپ روح و جسم کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آتی ہے۔ اور دل کی تمام دھڑکنیں شہادتِ حق کے الفاظ بن کر ہونٹوں پر گونجتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے فضائے کائنات میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں۔

کیا ہماری زندگی میں بھی اسلام کی عظمت کا یہ عالم ایک دن۔ ایک ساعت کیلئے

کبھی گذرا ہے؟ - اگر نہیں تو ان فاصلوں کا تصور کیجئے جو پیدائشی مسلمان ہونے کے باوجود ابھی ہماری زندگی اور حقیقی اسلام کے درمیان حائل ہیں! - اسلام پر پیدا ہونا ایک چیز ہے اور اسلام پر مرنا دوسری چیز - کاش ہم سمجھ سکیں کہ اسلام پر پیدا ہونے سے مطمئن ہونے کی بجائے ہم یہ فکر کریں کہ جس زندگی کی رگ و پے میں دنیا پرستی رچی ہوئی ہو کیا اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بستر جانکنی پر اس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے آخری الفاظ " لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ " کی شہادت دے رہے ہوں گے!

عکرمہ کی اسلام دشمنی کا اندازہ کرنے کے لئے یہی بات کافی تھی کہ ان کی رگوں میں اسلام کے بدترین باغی ابوجہل کا خون گردش کر رہا تھا - کون سوچ بھی سکتا تھا کہ یہ خون اپنی سیاہ فطرت بدل کر ایمان کے شفاف نور میں ڈھل جائے گا۔

ابوجہل کا کفر - کفر کی وہ آخری شکل تھی جہاں انسانی وجود جیتے جی پتھر کی لاش بن کر رہ جاتا ہے - جہاں مسخ شدہ ضمیر سے نفس و شیطنت کا مکروہ کوڑھ ٹپکتا ہے۔ تو آبادیاں گل سڑ جاتی ہیں۔ جہاں سچائی کی ہلکی سی آہٹ پر انسانی درندگی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ جہاں خلوص و محبت کی مقدس دلربائیاں اثر کرتی ہیں اور حیوانی جبلت ہر اس شے پر ڈنک مارتی ہے جو اس کو پیار کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائے!

کوہ صفا سے جس دن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو بندگی کی بھولی ہوئی حقیقت یاد دلائی تو اس عظیم احسان کے جواب میں سب سے پہلے ابوجہل کے سربراہ ابولہب نے رسالت کے سینے پر قاتلانہ وار کیا اور اس طرح ظلم و تشدد کی وہ خوفناک

طاقتیں حرکت میں آگئیں جن کے ہاتھوں اللہ والوں کے خون سے زمین گلنار ہو کر رہ گئی۔ تاریخ کو اس تاریخی موڑ کا وہ مکالمہ بھلائے نہیں بھولتا جب ایک طرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں سے وحی کے پھول جھڑ رہے تھے تو دوسری طرف ابوجہل کی زبان شعلہ باریاں کرتی نہ تھکتی تھی۔

"لوگو" رسولِ کریمؐ نے فرمایا تھا "بتاؤ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟" دامنِ کوہ میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانی سمندر ایک بلند بانگ نعرے میں تبدیل ہو گیا:۔

"امین اور صادق!۔ تیری زندگی کے چالیس سال ہمارے لئے کھلی کتاب ہیں تو نے کبھی جھوٹ نہیں بولا کبھی کسی کی امانت میں خیانت نہیں کی۔ ہم تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں ہم تجھے پیار کرتے ہیں"

"اچھا اگر میں یہ کہوں" حضورؐ کی آواز میں لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی ہوئی سنجیدگی صاف بتا رہی تھی کہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت عرش سے فرش پر اترتی آرہی ہے" کہ اس پہاڑی کے عقب سے ایک غنیم تم سب پر یلغار کرتا آرہا ہے تو کیا تم میرا اعتبار کرو گے؟"

ظاہر ہے یہ خطرے کی محض ایک تمثیل تھی خطرہ نہیں!۔ مگر سننے والے اسطرح چونک اُٹھے جیسے سچ مچ خطرہ کا دھماکہ ٹھیک سر پر آگیا ہو! دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ چہروں نے رنگ بدل دیا سیکڑوں آنکھیں اس ایک معصوم چہرے پر اس طرح جم کر رہ گئیں، جیسے اس آئینے میں انسانی قسمت کی تحریر پڑھی جا سکتی ہو۔

"اے محمد!" ہزاروں آوازیں ایک آواز بن گئیں" جلد کہہ! ربِ کعبہ کی قسم! ہم سب تیرے ایک اشارے کے منتظر ہیں"

جھوٹ اور سچائی کی تاریخ میں یہ ایک محو کیا ڈرامائی وقفہ تھا ایک انسانی وجود کے مقناطیسی سنگم پر وہ طوفانی دھارے سمٹ کر ایک ہو گئے تھے جن کو آئندہ تمام عمر ایک دوسرے سے ٹکراتے رہنا تھا۔ لیکن یہ دھارے اس سے بے خبر تھے کہ ابھی ابھی حقیقت کی وہ آواز زندگی کی گہرائیوں میں گونج اٹھنے والی ہے جس کو سُنکر انسان کے اندر چھپا ہوا شیطان اور فرشتہ باہر نکلتا ہے اور پھر ایک فیصلہ کن جنگ ہی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ ان دونوں میں حقیقی انسان کون تھا؟

پتھروں کے پجاریوں کے غول بیابانی میں دردمندی سے بیکل جان نے تن تنہا خدائے واحد کا نعرہ لگایا۔

"ہوشیار!۔ تم سب ایک ایسے جوالامکھی کے دہانے پر کھڑے ہو جس کے اندر دوزخ کی بھوکی آگ ہے۔ شیطان تمہارا جانی دشمن ہے جو تم پر حملہ آور ہے۔ خدائے واحد کے سوا کہیں پناہ نہیں۔ محمدؐ کی پکار پر اپنے خدا کی پناہ میں آجاؤ!۔ میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتا۔ اور کچھ نہیں چاہتا۔"

ایک ساعت کے لئے ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

یہ خدا کا پیغام تھا۔

یہ محمدؐ کی آواز تھی۔

یہ مکّہ کے مانے ہوئے امین و صادق کی پکار تھی۔ کوئی کیا کہہ سکتا تھا؟۔ کس میں جھٹلانے کا یارا تھا! کون یہ بدگمانی کرتا کہ انسان کے معاملہ میں چالیس سال سے سچ بولنے والا خدا کے بارے میں جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن نہیں!۔ یہاں ایک انسان بھی موجود تھا جسکو انسانیت ہی سے چڑھ تھی۔ وہ ابولہب جس کی انسانی نفرت

پتھروں کو پوجتے پوجتے پتھر کی طرح بے حس ہو چکی تھی۔ اس پتھر پر سچائی کا یہ اعلان بجلی بنکر گرا۔ اس کے پورے وجود میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ زخم خوردہ ناگ کی طرح بل کھاتا ہوا اور غیظ و غضب کی دیوانگی میں منھ سے کف اڑاتا ہوا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا کہے؟ نفرت کے پاگل پن میں درندوں کی طرح دانت پیستا ہوا وہ آگے بڑھا اور محسن انسان کو جھٹلانے کی تاب اس میں نہ تھی اس کو کوستا کاٹتا دیوانہ وار چنگھاڑا۔

"تو..... تو کیا تو نے ہمیں اسی لئے یہاں اکٹھا کیا تھا.....؟

یہ قہر و ستم کی خونین آندھیاں اٹھاتی ہوئی چنگھاڑ تھی جو حیوانیت کو جگا کر انسانیت کو موت کی نیند سلا دینا چاہتی تھی۔ "مکے" کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی یہی چنگھاڑ اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ عکرمہ کے وجود میں جذب ہو گئی۔ ابوجہل اور عکرمہ۔ باپ اور بیٹے دوش بدوش نکلے اور "مکے" کی فضاؤں میں اسلام دشمنی کی آگ سے نفرت کے جلتے تنور میں بدل دیا۔ لیکن اس تنور میں جلتے ہوئے مظلوم انسان اپنی ہڈیوں کی آگ سے اسلام کا چراغ روشن کرتے چلے گئے۔ یہ چراغ کسی طرح گل نہ ہوتا تھا۔ ایمان کی یہ حرارت کسی طرح سرد نہ پڑتی تھی۔ ہزاروں ظالموں کی نفرت بھری سفاکیاں ایک طرف تھیں اور ایک خدا پر اٹل ایمان دوسری طرف! مسلمان جان دے کر بھی اس ایمان کو زندہ رکھنے کی قسم کھا رہے تھے۔ دوزخ کی ہولناک آگ کر بچنے کے لئے انسان دنیا کی بھٹیوں میں جل مرنے پر ہنسی خوشی تیار تھا۔ آخر اس "جنون" کو ختم کرنے کے لئے جب "بدر" کے میدان کارزار میں نفرت اور طاقت کی دو دھاری تلوار نکالی گئی تو عکرمہ یہاں بھی اسلام دشمنی کے محاذ پر صف اول میں

دکھائی دیتے گویا اس نفرت پر آج انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ جیسے وہ عہد کر چکے تھے کہ یا میں نہیں یا اسلام نہیں۔

لیکن اچانک نفرت کے اس جنون کے سر پر دھماکہ ہوا۔ سچائی کی ایک زلزلہ انگیز دھمک سے نفرت اور طاقت کی آہنی بنیادیں ہل گئیں۔ کفر کی صفوں میں تہلکہ ڈالتی ہوئی ابو جہل کی کرب ناک چیخ بلند ہو رہی تھی۔ عکرمہ نے تڑپ کر دیکھا تو اسلامی سپاہ کے دو بچے کفر کا آہنی پہاڑ ڈھاتے ہوئے نظر آئے۔ مسعودؓ اور معاذؓ ــــ دو معصوم و مقدس بچے جو محمدؐ عربی کے پسینے پر خون بہانے آئے تھے جن کی غیرتِ حق کی تازہ دم معصومیت خدا کے سب سے بڑے دشمن کی تاک میں نکلی تھی۔ جو کفر کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور ابو جہل کے سر پر قضا بن کر ٹوٹ پڑے تھے۔

عکرمہ کو اس منظر نے شعلۂ جوالہ میں تبدیل کر دیا۔ اپنے باپ کو ذلیل ترین موت سے بچانے کے لئے ان کا خون جوش میں آیا ــــ وہ بجلی کی طرح لپکے لیکن معصوم مجاہدوں کی تلواریں موت کی برق رفتاریاں سمٹ آئیں تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ابو جہل درد و کرب بھری چنگھاڑ کے ساتھ خاک و خون میں لت پت ہو گیا۔

خدا کے سب سے بڑے دشمن کی لاش کو خدا کے چاہنے والے دو بچوں کے قدموں میں جگہ ملی تھی! لیکن عکرمہ ابھی خدا کی قدرت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ابھی ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ابو جہل کے بیٹے ہیں۔ انتقام کے جنوں میں تڑپتی ہوئی تلوار عکرمہ کے ہاتھوں میں چمکی اور معاذؓ کا معصوم بازو کاٹتی ہوئی نکل گئی۔

لیکن یہ بازو اپنا کام کر چکا تھا! انتقام کے خونیں حملے کے جواب میں معصوم بچے کے ہونٹوں پر ادائے فرض کا جاں نواز تبسم بکھر گیا۔ خون میں نہائے ہوئے

اس انسانی فرشتے کا لہو چاٹ کر بھی "کافر" کی تلوار کی پیاس نہ بجھ سکی - زمین کی تلوار ابو جہل کو ہمیشہ کے لئے ختم کر چکی تھی۔

عکرمہ اپنے باپ ابو جہل کو کھو کر مکے کی طرف پلٹے تو ان کی رگوں میں انتقام کی آگ بدستور بھڑک رہی تھی - اب یہ انتقام اسلام کی دشمنی میں ایک بے پناہ جنوں کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اب وہ دن رات اس فکر میں تھے کہ مسلمانوں سے ایک دوسری فیصلہ کن جنگ ہو جس میں خود اسلام کو خون میں نہایا ہوا دیکھ سکیں

"کیا ابو جہل کا خون خشک ہونے دیا جائیگا؟" عکرمہ نے قریشی سردار ابو سفیان سے کہا - ان کی آواز جراحت اور جوش سے کانپ رہی تھی "کیا ابو جہل کی موت کے بعد بھی اسلام کو زندہ رہنے دیا جا سکتا ہے؟"

ابو سفیان نے چونک کر عکرمہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کسی کرب ناک سوچ میں سر جھکا لیا - بدر کے محاذ پر اسلام نے کفر کو ایسی شکست فاش دی تھی جس کا زخم مندمل کرنے کے لئے کوئی تسلی بخش توجیہہ تک نہ کی جا سکے - بھری فوج میں دو بچوں کا ابو جہل کی لاش گرا دینا کفر کی غیرت کے لئے ایک آخری درجہ کا شرمناک واقعہ تھا - عکرمہ کا جوش و خروش دیکھ کر ابو سفیان کی ذہنی کشمکش پورے وجود کو پیسے ڈالتی تھی - لیکن آخر کار قریش کی سربراہی کا بھرم رکھنے کے لئے ایک کمزور آواز میں جواب دیا گیا -

"ابو جہل کے بیٹے! ہم چین سے بیٹھنے والے نہیں - لیکن یہ مسلمان کوئی ایسا لقمہ تر نہیں کہ جب جی چاہے ان کو نگلنے کے لئے منہ کھول دیا جائے - دوسری جنگ تیاری چاہتی ہے — تم اس کے لئے کچھ کر سکتے ہو؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟" عکرمہ کی رگ و پے میں اسلام کی نفرت ایک آتشیں لپٹ بن کر لپکی اور ہونٹوں پر ایک جھلسا دینے والا طنز بن گئی "میں پوچھتا ہوں میں کیا نہیں کر سکتا؟ میری دولت میرے ہتھیار۔ میری زندگی کے خون کا آخری قطرہ تک اپنے باپ کا انتقام لینے کے لئے تیار ہے۔ بے قرار ہے۔

اور واقعی اُحد کے اگلے معرکے میں عکرمہ نے اسلام کے خلاف یہ سب کچھ کر دکھایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے باوجود وہ صرف مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگ سکے اسلام کے نہیں! اسلام کی سینے پر گہرا گھاؤ لگا کر بھی وہ اسلام کے وجود کو مٹا نہ سکے۔ اسلام اس جنگ میں بھی فاتح ہی رہا۔ ہاں کچھ مسلمان اپنے ہی قدموں کی ایک خوفناک لغزش سے اس غار میں جا گرے جسے کفر نے اسلام کی موت کے لئے تیار کیا تھا۔ لیکن عکرمہ کے نزدیک ابھی اسلام اور مسلمان۔ سچائی اور انسانی جسم کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ وہ تکمیل انتقام کی وحشیانہ سرمستی کے عالم میں مکّے کی طرف لوٹ کر آئے۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ابو سفیان کی بے چینی بدستور قائم تھی۔ ابو سفیان کو جیسے خوب احساس تھا کہ اسلام خون میں نہا جانے کے باوجود دلوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پوری قوت سے زندہ ہے۔ اسلام جس کے چمن میں شہیدوں کے خون ہی سے بہار آتی ہے جس کی رعنائیاں زخم پر زخم کھا کر کچھ اور نکھر جاتی ہیں۔ جس کی صداقت کے نقوش اشک دخوں سے اُجاگر ہوتے ہیں۔ جہاں جنتِ گم شدہ کی بازیابی کا یقین آتا ہے اُس وقت ہے جب بندہ اپنے خدا کے پاس اس طرح لٹ لٹا کر پہنچے کہ خدا کے سوا اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ ہو۔ لیکن عکرمہ ابھی اس رازِ نہاں سے

ناواقف تھے۔ اسلئے ابو سفیان کی معنی خیز خاموشی ان کو محض ایک مہمل بزدلی ہی نظر آئی۔ جس پر انھوں نے نفرت و حقارت کا قہقہہ لگادیا اور بس۔

لیکن اس خاموشی کے حقیقی معنی ان کی سمجھ میں اس وقت آئے جب کچھ ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں کی فوجیں مکے پر فاتحانہ پیش قدمی کرتی نظر آئیں۔ عکرمہ کی اسلام دشمنی نے اب بھی اسلام کی غیبی طاقت کو سمجھنے کا موقعہ نہ دیا۔ گہری، اٹل اور آخری نفرت جس نے بغاوت اور ٹکراؤ کی زمین تنگ ہوتے دیکھی تو راہ فرار اختیار کی مگر سر جھکانا منظور نہ کیا۔ مسلمانوں نے اسلام کی محبت میں وطن چھوڑا تھا۔ عکرمہ اسلام کی نفرت میں وطن چھوڑ رہے تھے۔ مگر ٹھیک اس وقت جب حقیقت کی تاب نہ لاکر وہ اسلام سے دُور ساحل سمندر کی طرف بھاگ رہے تھے ان کی بیوی ان کی نصف زندگی اسلام کے قدموں پر عقیدت و اطاعت کی پیشانی ٹیک رہی تھی۔ سچائی کے نور سے قلب و نظر میں چراغاں لئے ہوئے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کر رہی تھیں۔

"کیا اسلام کی ایک حقیر خادمہ کی آواز سُنی جائیگی؟ کیا آپ کا اخلاق گرامی اپنے بدترین دشمن کو معاف کرسکتا ہے۔ کیا میرے شوہر عکرمہ کی جان بخشی کر کے ان کو اپنے خیالات پر نظر ثانی کا موقعہ دیا جا سکتا ہے؟"

التجا کرتے کرتے محترم صحابیہؓ کچھ سوچکر چونک اٹھیں۔ کانپ گئیں — وہ کس کے لئے کس سے کیا کہہ رہی ہیں۔ جس کے قلب پر عکرمہ کے ہاتھوں نے اپنی پوری بے رحمی سے زخم لگائے تھے۔ جس کے چہرے کو احد کے میدان میں اس کے پاک لہو سے سُرخ کر دیا گیا تھا۔ جسکو مکے سے اس جرم پر نکالا گیا ہو کہ وہ

ایک بہترین انسان کیوں ہے؟ کیا اتنے بڑے مظلوم سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے زخموں کی ٹیس کو بھول جائے اور ظالم کو پیار کرے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ محمدؐ عربی کی فراخ دلی نے جن وسعتوں کا ثبوت دیا اس کا تصور تک وہ لوگ نہیں کرسکتے تھے جن کے لئے انتقام ایک لذیذ ترین مشغلے سے کم نہ تھا۔

"ڈرو نہیں!" اخلاق کریمانہ سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والے انسان کاملؐ نے کہا" عکرمہ کو امان دی گئی۔ محمدؐ نے عکرمہ کو معاف کر دیا ہے۔"

کتنا بلند تھا وہ انسانؐ جس کے اخلاق کا جاں نواز تبسم دوست اور دشمن دونوں کے لئے عام تھا! جس کے سینے میں نفرت کرنے والوں کے لئے بے لوث محبت کی رقت تھی۔ جو مجرموں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا ہوا دیکھ کر اپنے دل کے دروازے کھول دیتا تھا۔ محترم صحابیہؓ پر پیغمبرؐ کے اس اسوۂ حسنہ کے آگے فرطِ عقیدت سے کپکپی طاری ہو گئی، آنکھوں میں شکریے کے الفاظ آنسو بن کر ابھر آئے۔ اسلام کی عظمت کی گہری چھاپ قلب و روح پر لئے ہوئے اب وہ اپنے "کافر" شوہر کی تلاش میں نکلیں تاکہ بھٹکے ہوئے شریک حیات کو گمراہی کی دردناک موت مرنے سے بچا سکیں۔

یہ دیکھ کر محترم صحابیہؓ کی حیرت و مسرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ان کے شوہر عکرمہ مکّے کی طرف واپس آرہے ہیں!۔

"آپ آگئے!" بیوی نے بچوں کی طرح بیتاب ہو کر کہا" میں خدائے واحد پر ایمان لے آئی ہوں اور خدا کے رسولؐ نے آپ کو امان دیدی ہے۔ کاش آپ اس احسانؐ کی قیمت چکا سکیں۔ کاش......!!

"مجھے محمدؐ نے معاف کر دیا ہے۔؟ — مجھے!!" عکرمہ کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیلیں اور تحیّر آمیز عقیدت سے اس طرح بند ہو گئیں جیسے وہ جاگتے میں کوئی حسین خواب دیکھ رہے ہوں۔ خود فراموشی کے والہانہ عالم میں بے ربط سے الفاظ ان کے مُنہ سے نکل رہے تھے "یہ..... کیسے ہو سکتا ہے..... کیسے..... ہو سکتا..... ہے!۔ اُف کتنی بڑی سزا ہے یہ — کہ ایک گردن زدنی مجرم..... کو پستیوں سے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا جائے — مگر..... نہیں!..... بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے..... ؟"

"آپ کیوں لوٹ آئے جاتے جاتے؟" بیوی نے عکرمہ کو خود فراموشی سے جگاتے ہوئے کہا" اور اب کہاں جانا چاہتے تھے؟"

"میں؟" عکرمہ جیسے خواب سے چونک گئے" میں وہاں جا رہا تھا جہاں سے تم آ رہی ہو!"

"رسولؐ خدا کے پاس؟ — کیوں؟ — کیا..... ؟"

محترم صحابیہؓ ایک حسین توقع کو قریب آتا ہوا محسوس کر کے خوشی سے بے قابو ہو گئیں — "کیا آپ بھی اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں؟"

عکرمہ کچھ دیر سر جھکائے رہے پھر اپنی بیوی کے پُرشوق چہرے پر نظریں جمائے ہوئے ایک ایسی بیچارگی سے دیکھنے لگے جیسے جذبات کے نئے انقلاب کو سلجھانے کے لئے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں آخر ہونٹوں کو خفیف سی حرکت ہوئی اور ایک گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"میں جس وقت کشتی میں سوار ہو کر اسلام سے دُور — بہت دُور۔

بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا اسلام تیزی سے میری سمت بڑھ رہا تھا کشتی میں قدم رکھتے ہی میرے لبوں پر لات و عزیٰ کا نام آیا۔ تو کسی نے کہا "یہاں لات و عزیٰ کا کام نہیں۔ یہ سمندر کی طوفانی دنیا ہے جہاں خدائے واحد کو پکارنے سے کام چلتا ہے۔" میں نے یہ آواز سنی اور میرے دل کے بند دروازے کھل گئے۔ میں نے سوچا کہ اگر سمندر میں لات و عزیٰ بے بس ہیں تو کیوں نہ اُس خدائے واحد کے آگے سر جھکا دوں جو ڈوبتے بیڑوں کو پار لگانے کی طاقت رکھتا ہے۔ کیوں نہ خشکی پر بھی اسی خدا کا نام لوں جس کا اشارہ پا کر طوفان سانس روک لیتے ہیں۔"

"الحمد للہ!" صحابیہؓ کی زبان پر دل کی دھڑکنیں حرف شکر بن کر تڑپ گئیں۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ نے سچائی کا راستہ پالیا ہے۔ آئیے اب ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کسی کے انتظار میں کھڑی نہیں رہتی۔"

عکرمہ کچھ دیر ایک نامعلوم سوچ میں ڈوبے کھڑے رہے جیسے دل میں کوئی پھانس ابھی تک کھٹک رہی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ایک فیصلہ کن انداز میں انھوں نے بیوی کا ہاتھ پکڑا اور محمد عربی کی طرف کشاں کشاں چل پڑے۔

"کچھ میں نہیں آتا مجھے وہ شخص کس طرح معاف کر سکتا ہے جس پر میں نے کبھی ترس نہیں کھایا ...... لیکن یہ معافی کا اعلان ہوتا یا نہ ہوتا۔" ——————

—————— میں اب وہاں ضرور جاؤں گا جہاں کوئی نامعلوم شے مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے۔"

"آپ نے ابھی خدا کو سمجھا ہے خدا کے رسولؐ کو نہیں۔"

صحابیہؓ نے دلربائی کے ساتھ دھیرے دھیرے کہا۔ "محمدؐ اسی طرح معاف

کرتے ہیں کہ دنیا اس کا تصور تک نہیں کرسکتی۔"

حسن اتفاق سے محمدؐ عربی اس وقت مکّے ہی میں تھے جب اسلام کی نادیدہ کشش میں جکڑے ہوئے عکرمہ نے بارگاہِ رسالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلنے سے پہلے ان کا پورا وجود امید و بیم کے طوفانی تھپیڑے کھا رہا تھا۔ چہرہ رہ رہ کر رنگ بدل رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں جذبات کے مدوجزر میں ہچکولے کھا رہی تھیں۔ لیکن دروازہ کھلا تو آنحضرتؐ عکرمہ کو حاضر پاکر بہت مسرور ہوئے اور انتہائی دلنوازی کے ساتھ آپؐ نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا۔ "خوش آمدید۔ خوش آمدید اے پردیسی سوار!"

اخلاقِ کریمانہ کی عظمتوں کے آگے عکرمہ کچھ دیر کے لئے ہیبت و رعب سے سکتے میں رہ گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جس انسان پر میں نے عرصۂ حیات تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کیا یہ وہی انسان ہے جو میرے لئے — اپنے عمر بھر کے دشمنِ جانی کے لئے خلوص و دلنوازی سے فرشِ راہ ہوا جا رہا ہے! کتنا بڑا ہے یہ انسان کہ اس کا بدترین دشمن بھی اس کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ تو شکوک و خطرات کی غلیظ تاریکی اس کے ایک فیاضانہ تبسم سے چھٹ جاتی ہے! اور .... یہ پردیسی سوار کے الفاظ کیا یہ شخص میرے فرار کے اس خفیہ مرحلے سے باخبر ہے جس کی خبر میرے سوا کسی کو نہیں۔ یقیناً میں ایک ایسے انسانی وجود کے سامنے ہوں جس کے قلب و روح کا تعلق خدائے عالم الغیب سے ہے — اچانک یہ سوچتے سوچتے عکرمہ کو اپنے وہ سیاہ جرائم یاد آ گئے جنکو

معاف کرنے کے لئے خود ان کا اپنا ضمیر بھی تیار نہ تھا- لیکن جن کے متعلق حضورؐ کی معافی کی خوشخبری ان کی مومنہ بیوی نے سنائی تھی- اس خبر کی تصدیق اس ملاقات کا سب سے اہم عنوان بن کر ان کے لبوں پر آ گئی-

"اس سے معلوم ہوا ہے" عکرمہ نے بار انفعال سے سر جھکائے ہوئے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" کہ ...... آپ نے ..... عکرمہ ..... کو امان دیدی ہے؟"

امید و بیم، کشمکش و تذبذب کے بوجھ میں لپٹا ہوا ایک پل اس وقت ظالم اور مظلوم کے درمیان حائل تھا- ایک پل جسکو امید اور خوف کی حشرناکیوں نے قیامت کی طرح طویل بنا دیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے عکرمہ کی روح پر محمد عربیؐ کی سکینت ریز اور دلنواز میٹھی آواز سے وجد کی کیفیت طاری ہو گئی- ایک آواز جس میں شہد کے مٹھاس اور پھولوں کی نرمی سے بھی زیادہ لطیف تر کوئی شے تھی -- دل سے نکلتی ہوئی اور دل کو چھوتی ہوئی ایک عظیم ترین انسان کی آواز!-

"ہاں عکرمہ! میں نے تمہیں امان دی ہے- میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا- کوئی تمہیں کچھ نہ کہے گا!"

کیا یہ محض ایک آواز تھی یا ایک حسین ترین روح کا سوز و گداز اور ایک پاکیزہ ترین دل کی مقدس دھڑکنیں الفاظ کے روپ میں ڈھل گئیں تھیں- عکرمہ کے لئے یہ معافی کی تصدیق محض چند جملے نہیں تھی - ان میں تو جیسے وہ ساری محبت سمٹ آئی تھی جو تخلیق کائنات سے لیکر آج تک مختلف صورتوں میں دو انسان ایک دوسرے کے ساتھ کرتے آئے ہیں- ایک اتھاہ، بیکراں محبت کی تڑپ جس کے

آگے ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت ہیچ نظر آئے۔ عکرمہ نے محسوس کیا کہ جس کے باپ کے خونی تعلق پر وہ محمد عربیؐ سے نفرت کرتے آئے تھے، محمد عربیؐ کی ایک نگاہِ لطف پر ایسے ہزاروں ماں باپ نثار کئے جا سکتے ہیں یہی وہ انسان ہے جس کی انسان دوستی پر "فداہ امّی وابی" کا نعرۂ مستانہ دل اور زبان کے درمیان گونجتا ہوا اٹھتا ہے عکرمہ نے محسوس کیا کہ پیغمبرؐ کا پیار حاصل کئے بغیر اب تک انھوں نے جتنی عمر بسر کی تھی وہ زندگی نہیں موت تھی۔ زندہ تو وہ آج پہلی بار ہوئے تھے جب خدا کے آخری رسولؐ نے ان کی طرف محبت بھری نظر سے دیکھا تھا۔ جب ان کی نظر میں رسالتؐ کا حسن سمٹ آیا تھا۔ اور دل میں خدائے کائنات کے عقیدے نے پورے وجود میں ابدی زندگی کی روح پھونک دی تھی۔

اخلاقِ نبوی کی بارگاہ میں عکرمہ احساس گناہ کا ارتعاش بنے کھڑے تھے۔ ندامت کے قیمتی آنسو ان آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے جن میں کبھی اسلام کو دیکھ کر خون اتر آتا تھا۔ عقیدت کی آنچ میں نفرت کی پتھریلی عمر پگھل پگھل کر آنسو بن رہی تھی۔ آنسو جو جذباتِ انسانی کا دردناک ترین نچوڑ ہیں۔ جہاں الفاظ کی دنیا گم ہو جاتی ہے اور جذبات کا رقت انگیز حسن و جمال بے حجاب ہو کر سامنے آجاتا ہے

"میں شہادت دیتا ہوں" آخر آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان سے ایک نئے مؤمن عکرمہؓ کی آواز سنائی دی۔

"میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا ایک ہی ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔۔۔ آپؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں۔ ہاں۔ آپ سب سے زیادہ نیک دل۔۔۔ سب سے زیادہ سچے اور سب سے زیادہ عہد کو وفا کرنے والے ہیں"

حضورؐ کے ہونٹوں پر ایک ایسا تبسم تھا جیسے کسی ماں کا لخت جگر موت کے جبڑوں سے زندہ نکل آیا ہو- اور عکرمہؓ کی آنکھوں میں آنسو تھے جیسے عمر بھر کے گناہوں کی یاد دل کی ایک ایک دھڑکن پر چوٹ لگا رہی ہو اور پیغمبرؐ کے پیار کی تھپکی ہر چوٹ اور ہر زخم پر میٹھا میٹھا، ٹھنڈا ٹھنڈا مرہم رکھتی چلی جا رہی ہو-

"اے خدا کے رسولؐ!" عکرمہؓ نے گلوگیر آواز میں کہا- "میں نے تمام عمر آپ سے دشمنی کی ہے- مسلمانوں سے جنگ کی ہے- میری ساری زندگی خدا سے بغاوت میں کٹی ہے- آہ میرے گناہوں کا بوجھ میری روح کو پیسے ڈال رہا ہے- اب آپ ہی خدا سے درخواست فرمائیے کہ اپنے خطا کار عکرمہ کو دامن عفو میں چھپا لے"- اور فی الفور محمد عربیؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے اور اخلاق گرامی کے نیم بسمل نخچیر کے لئے رحمت و مغفرت کی دعائیں کیں- "اے اللہ میں عکرمہ کو معاف کرتا ہوں- تو بھی معاف فرما دے!" دعا کے بعد عکرمہؓ نے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہوا محسوس کیا اور حضورؐ سے اسلام کی بنیادی باتیں سیکھ لیں- ایمان مکمل ہو چکا تھا لیکن "عمل صالح" کی روحانی بھوک شروع ہوئی تھی عمل جو ایمان کو تپا کر کندن بناتا ہے - عمل - جو عقیدہ و ایمان کا جسم ہے - عمل - جس کے بغیر ایمان کا نور سمٹتا ہے اور ساری زندگی کو ویران چھوڑ کر دل کے کسی نامعلوم گوشے میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے عمل کا یہی سیل بیکراں حضرت عکرمہؓ کے نوخیز ایمان کے سرچشمے سے پھوٹ نکلا تھا ایک طرف ماضی کے رستے ہوئے زخم تھے جن کو آنسوؤں سے دھونا ضروری تھا اور دوسری طرف آخری مستقبل کی تعمیر کی دھن تھی جس کا سنگ بنیاد وہ اپنے پورے وجود کی قربانی پر رکھنے کے لئے سراپا اضطراب بنے ہوئے تھے- اسی موڑ پر انھوں نے

اپنی نئی زندگی کا مقدس عہد کرتے ہوئے یہ الفاظ ادا کئے :-

"کفر کے لئے میں نے بہت کچھ کیا تھا اب اسلام کے لئے سب کچھ کرنا ہے۔ خدا کی دشمنی میں مَیں نے جان و مال کی جو قربانیاں دی ہیں خدا کی اطاعت میں اس سے کئی گنی قربانی دئے بغیر عکرمہ چین سے نہ بیٹھے گا۔"

لیکن تلافیِ مافات کی اس جاں نثارانہ مہم پر پہلا قدم اُٹھاتے ہی ان کو ایک ہوشربا نفسیاتی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ خدا کے رسولؐ کی معافی سے سرفراز ہو کر جب انھوں نے فخرِ مسرت سے سر اُٹھا کر چلنا چاہا تو چاروں طرف سے ہمت شکن طنز ان کو نرغے میں لینے کے لئے آگے بڑھے۔ خدا اور اس کے رسول نے معاف کر دیا تھا مگر اصحابِ رسولؐ کی آنکھوں میں ان کی پچھلی حیاتِ مجرمانہ کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔

" یہ عکرمہ ہیں !— ابو جہل کے دست و بازو !— خدا کے دشمن کے بیٹے عکرمہ !!"

ایک کشتۂ انفعال کے لئے یہ طنزیہ آوازیں کس قدر صبر آزما ہو سکتی ہیں !— جس کے عہدِ وفا کی خلوص کیشوں کا ردِ عمل زمانے کے دل آزار شک و شبہ کی شکل میں برآمد ہوا اس کا پائے ثبات ڈگمگا جائے تو کوئی حیرت کی بات نہیں— لیکن عکرمہؓ نے ان سب آوازوں کو سنکر جو کچھ محسوس کیا وہ یہ تھا کہ میں واقعی "مجرم" ہوں۔ جن سنگین خطاؤں کو ہر لمحہ ان کا ضمیر سوچنا چاہتا تھا یہ دنیا ان ہی کو پوری قوت سے یاد دلا رہی تھی۔ خدا کے لئے اور خدا کے رسولؐ کے لئے ان کی اتاہ سپردگی کو اب

یہ سوچنے کا ہوش ہی کب تھا کہ یہ دنیا ان کو اپناتی ہے کہ نہیں؟ —— یہ طنزیہ فقرے جب ان کے انفعال کا درد حد سے سوا کر دیتے تو رات کی خاموش تنہائی ان کو نادید خدا کے آگے سر بسجود دیکھتی - جہاں سجدہ گاہ کو گرم گرم آنسوؤں سے تر کر دینے کے بعد ان کی پیشانی کو ایسا سکون محسوس ہوتا جیسے ان کے سارے روحانی زخموں پر تسکین بخش پھائے رکھ دیئے گئے ہوں - لیکن ماحول کی یہ صبر آزما گھاٹی بالآخر طے ہو گئی - خدا کے رسول کو جیسے ہی اس صورت حال کا پتہ چلا آپ غم و غصہ سے بیتاب ہو کر باہر نکلے اور یہ حقیقت افروز اعلان کیا :-

" ایک کافر کی وجہ سے ایک مومن کا دل نہ دکھاؤ —— جاہلیت میں جو شخص معزز تھا اسلام میں بھی معزز ہے "

کس قدر عظیم الشان تھا یہ ایمان جس پر خدا کا رسول برسرِ عام گواہی دینے کے لئے بیتابانہ باہر نکل آئے ۔ طنزیہ جملے آناً فاناً نابود ہو گئے - اب عکرمہؓ کو ابو جہل سے نہیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت تھی - خدا سے تعلق تھا خون کا رشتہ روحانی تعلق کے آگے ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا اور عکرمہؓ کی شکل میں اُبھرنے والی نئی نویلی صبح زندگی اسلام کے اُفق پر ماہ تمام کی سی جاذبیت کے ساتھ قلب و نظر کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھی - لیکن اس " چاند " کے سینے میں اپنے ماضی کی تلخ یادوں کا سیاہ داغ اپنی جگہ موجود تھا - یہ ضمیر کی ٹیس کا نشان تھا - یہ فطرت صالحہ کی اس تڑپ کا مظہر تھا کہ کس طرح کردار و عمل کی نئی روشنی سے حال و مستقبل کے ساتھ ساتھ ماضی کی سیاہیوں تک کو جگمگا دیا جائے - عکرمہؓ نے خدا کو کھو کر پایا تھا - خدا کا نام لیتے ہی اب ان کا پور پور اور ڈھانچہ جذبات کی شدت سے مرتعش ہو جاتا تھا - یہ نام انکی

دل کی دھڑکنوں میں عقیدت، پرستش اور خداکاری کی برقی لہر دوڑا دیتا اور اس نام پر مر مٹنے کے لئے ان کی روح نیم بسمل ہو کر رہ جاتی۔

لیکن فتح مکہ کے بعد کوئی بہت بڑا موقع ہاتھ نہ آسکا جہاں وہ آخری قربانی پیش کرنے کی حسرت نکال سکتے۔ شہادت کی جب کبھی کوئی راہ نظر آئی لوگوں نے عکرمہؓ کو پروانہ وار موت کی آرزو میں وجد کرتے ہوئے دیکھا لیکن یہ آرزو کسی طرح پوری نہ ہوتی تھی۔ جس سر میں خود پرستی نہیں خدا پرستی کا مقدس جنون تھا وہ سر ان کے لئے جسم پر بار دوش تھا۔ مگر سبکدوشی کی امید نظر نہ آتی اور نظروں سے اوجھل ہو جاتی میدانِ جنگ میں زخم کھا کر جب خون سے سرخ چہرہ آسمان کی طرف اٹھتا اور شہادت کی تکمیل کے لئے دعا کو ہاتھ اٹھ جاتے تو ایمان کے حسن وجلال کی یہ تصویر سیکڑوں دلوں کو رشک و عقیدت میں گم کر کے رکھ دیتی۔

عکرمہؓ اپنے دور کفر پر خدا کے آگے اس طرح شرمسار اور اشکبار رہتے جیسے اس غم میں جان ہی دیدیں گے۔ زندگی کی کوئی نعمت ایسی نہ تھی جس سے انسان پیار کرتا ہو اور عکرمہؓ نے اس پیاری چیز کو تلافی مافات کے داؤ پر ہنسی خوشی نہ لگا دیا ہو ___ راتوں کی میٹھی نیندیں۔ دولت کے سنہرے ڈھیر۔ خون کے گہرے تعلقات۔ دن کی جدوجہد کے مواقع اور اپنی جان عزیز۔ ہر شے آج ان کے لئے صرف اسلئے تھی کہ اس کو لٹا کر اپنے مولا کو راضی کر لے جائیں۔

راتوں کی خاموش تنہائی میں جب نرم گداز بستر تھکن سے ہلکان بدن کے لئے پر شوق بازو پھیلاتا، ستاروں کی کھلی آنکھیں ان کو جائے نماز پر جبیں سائی کرتے ہوئے دیکھتیں۔ تلافی مافات کے جنون میں گذشتہ گناہوں کے احساس

کا داغ سینے سے ہٹ کر داغ سجود میں ڈھلتا جا رہا تھا غفلت کے جو پردے کبھی
بصیرت پر لٹکے ہوئے تھے انفعال و ندامت کی آندھیاں انھیں علام کی لامحدود
فضاؤں میں اُڑا لے جانے کے لئے بیتاب تھیں۔ قرآن پاک ان کے بیقرار دل کا
سہارا تھا جسکو وہ کبھی سینے سے لگاتے اور کبھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر
روتے ہوئے آنکھوں سے لگا لیتے۔

"کتابُ ربی۔ کتابُ ربی!" کی آواز۔ گلوگیر آواز اس دَورِ جاہلیت کا
ماتم کرنے لگیں، جب وہ اپنے رب کی اس مقدس کتاب کے قدر ناشناسوں میں
تھے۔ درد بھری آواز اب اس کتاب کی تلاوت کرتے کرتے در و دیوار پر گریہ
طاری کرتی محسوس ہوتی۔ اور ہر طرف ہُو کا عالم چھا جاتا۔

سر میں بندگی کا جو سودا۔ قیمتی سودا سمایا تھا وہ کبھی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی
سجدہ گاہ پر تڑپتا تو کبھی فرط عقیدت سے تلواروں کی چھاؤں میں رقص کرتا نظر آتا۔
جیسے اس سر کو تن سے جدا کئے بغیر وہ اپنے مالک کے روبرو پیش ہونے کیلئے
تیار ہی نہ ہوں۔ جیسے جان دئیے بغیر ان کی بیکل جان کو قرار ہی نہ آسکے گا۔ آخر
قسمت نے ان کو سرفروشی کے عظیم مواقع دئیے۔ جن کے لئے نجانے کب سے وہ
دامنِ شوق اور دستِ دعا پھیلائے ہوئے پہاڑ سی گھڑیاں کاٹ رہے تھے آنحضرت
کے بعد جب ارتداد کا خطرہ اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ اسلام کی بنیادیں ہلانے کیلئے
اُٹھا تو عکرمہؓ دوسری طرف سے دیوانہ وار اُٹھ کھڑے ہوئے اور شہادت کی سرمستیوں
میں اپنے پورے جسم کو خوں چکاں زخموں سے چور کر کے رکھ دیا۔ ان کو یہی تو دُکھ
تھا کہ ان کی زندگی اس وقت اسلام کے خلاف صف آرا رہی تھی جب وہ موت اور زندگی

کے مرحلوں سے دوچار تھا۔ ٹھیک ایسا ہی موقع تلافی مافات کے لئے خدا نے ان کو دیا کہ جب ایک بار پھر اسلام مرگ و زیست کی کشاکش میں الجھا ہوا تھا تو یہی عکرمہؓ کی زندگی اسلام کے گیسو سنوارنے کے لئے زندگی کی راہ پر اپنا لہو ٹپکاتی چلی گئی۔ اس وقت کبھی کا یہ اسلام دشمن کافر آج کا بہت بڑا اسلام دوست اور اسلام کا سچا معتمد تھا۔ اسلام کی فوجیں اس کے اشاروں پر حرکت کرنے کے لئے اس کی کمان میں دیدی گئیں تھیں اور انھوں نے جس بے جگری سے اس اعتماد کا حقدار خود کو ثابت کیا وہ قبیلۂ ازد، عمان کے قبائل اور بنی مہرہ کے علاقوں میں ارتداد کی بھرپور سرکوبی کی روشن تاریخ سے آج تک مینارۂ نور کی شکل میں وادیوں کے بیکراں فاصلوں سے جھلکتا نظر آرہا ہے۔ خاص طور پر یمن کے مرتدوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ان کی سرفروشانہ شجاعت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ اسلام کی تاریخ کا ایک زریں باب کہلائے جاتے ہیں۔ یمن۔ جہاں ارتداد کی آندھی نے مسلم پولس ایکشن کی پہلی کوشش کو ناکام کر کے خطرناک صورت حال پیدا کردی تھی وہاں جب تلافی مافات میں سربکف پھرنے والا مینڈۂ مومن عکرمہؓ پہنچا تو جنگ کی بساط الٹ کر رکھدی اور خدا کی امامت سے سرتابی کرنے والوں کے مغرور سر گھوڑے کی ٹاپوں سے روند ڈالے۔

شام کی تاریخی فوج کشی میں وہ اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے گھر سے نکلے تھے امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ جب جنگی اجتماع کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تو ایک خیمہ ایسا بھی دیکھا جس کے چاروں طرف عربی گھوڑوں کی تندرست قطاریں اور آلات حرب کے انبار جمع تھے۔ امیر المومنین یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ مسلمانوں نے کس قدر جاں نثاری اور فداکاری سے اس خیمہ کو اسلام کے لئے آراستہ کیا ہے

مگر جب خیمہ کے اندر انھوں نے جھانک کر دیکھا تو اس کے اندر اس خیمہ کا اکیلا منفرم عکرمہؓ بندگی اور سرافگندگی کے جوش میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا دکھائی دیا!۔ جیسے اس شخص کو نہ دولت کی فکر تھی نہ وقت اور زندگی کی پروا۔ جیسے اس کا سارا وجود آخرت کی دُھن کے عظیم محور پر دیوانہ وار گردش کئے جارہا تھا۔ جیسے زندگی کا مسافر موت کی ٹرین کا منتظر ہو جو اسکو اس کے خدا تک پہنچا دے۔

"اے عکرمہؓ تم کو خدا سلامت رکھے؟ امیرالمومنینؓ نے خیمے میں مشتاقانہ داخل ہو کر کہا تو عکرمہؓ محویت سے چونک اُٹھے۔" اے عکرمہ! تم نے کتنا کچھ خرچ کر ڈالا ہے۔ بیت المال سے کچھ امداد تمہارے لئے بخوشی دی جائیگی"

"جی نہیں" عکرمہؓ پر جیسے غیرتِ بندگی کا جنوں طاری ہو گیا ہو۔" مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنے خدا کی ضرورت ہے للہ! مجھے کچھ نہ دیجئے۔ میں ..... میں تو یہ سب کچھ خرچ کرنے کے بعد صرف اپنے مولا کو پا لینا چاہتا ہوں۔ ابھی ..... ویسے بھی میرا حوصلہ نہیں نکلا۔ ابھی یہ دو ہزار دینار چنگاریوں کی طرح میرے ہاتھوں میں تکلیف دہ ثابت ہو رہے ہیں"

اسلام کی دیوانہ وار لگن میں وہ کس بے جگری سے زخم پر زخم کھاتے تھے اور ان کو یوں گھائل ہو کر کتنا سکون ملتا تھا اس کا اندازہ دنیا کو اس وقت ہوا جب تحل کے معرکۂ کارزار میں وہ خون میں نہا نہا گئے مگر ان کے قدم کسی طرح نہ رُکتے تھے زخم پر زخم کھا کر وہ ہر بار ایک اس سے بھی کاری زخم کی دُھن میں دُشمنوں کی صفوں کے اندر گھستے چلے جاتے تھے۔ دیکھنے والوں سے دیکھا نہ گیا اور لوگوں نے بڑھ بڑھ کر منت سماجت کی کہ" اس طرح اپنی جان کے درپے نہ ہو جئے!۔ مگر عکرمہؓ اس ہمدردانہ

مشورے پر اس طرح چراغ پا ہو گئے جیسے ان کی عزیز ترین آرزو کی توہین کردی گئی ہو۔ لہو میں نہایا ہوا گلنار و پُر نور چہرہ مڑا اور آگے بڑھنے سے پہلے یہ نعرۂ مستانہ اپنے پیچھے گونجتا ہوا چھوڑ گیا۔

"میں لات و عزّیٰ کے لئے تو جان پر کھیلا کرتا تھا اور آج خدا اور رسولؐ کے لئے جان بچا کر رکھوں! تُف ہے مجھ پر اگر ایسا خیال بھی آنے دوں۔ قسم ہے ہلاے واحد کی! عکرمہ اپنے خدا پر مر مٹنا چاہتا ہے۔"

کوئی نہیں جانتا کہ شہادت کا یہ پروانہ کس میدان فداکاری میں خاک و خون کی زینت بنا۔ عکرمہؓ شہید ہوئے، مگر کہاں! فحل کے میدان میں! یرموک کی وادی میں! کوئی یقین سے نہیں جانتا۔ دنیا مگر اتنا جانتی ہے کہ خدا پر جان دینے کے دھنی نے آخر جان جاں آفریں پر لٹا ہی دی۔ رضی اللہ عنہ۔ رضی اللہ عنہ۔ رضی اللہ عنہ!!

کیا یہ کوئی کہانی ہے یا تاریخ کا ٹھوس واقعہ؟ کون ہے جو آج اسلام کی منکر اس دنیا کو یہ بات سمجھائے؟ ستر کروڑ مسلمان مل کر بھی اس جاں نثار صداقت — اس سرفروش بندگی کا اظہار نہیں کر سکتے جس کی مثال ایک اکیلے عکرمہؓ نے اس طرح قائم کی کہ فانی انسان کا کردار نقشِ دوام بن کر رہ گیا۔ عکرمہؓ مسلمان ہی تو تھے۔ انسان ہی تو تھے — فرشتہ نہیں! — کیا ہم بھی مسلمان ہیں؟ — بولو — کیا ہم بھی انسان ہیں؟ —

عفو و درگذر

مسجد نبوی کے ستون سے جکڑا ہوا گرفتاری وحشتناک اضطراب کے عالم میں سینے پر اپنا سر ڈھلکائے زندگی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ اپنے ہی دل کی دھڑکنیں اسے موت کے قدموں کی وحشت ناک آہٹ میں تبدیل ہوتی محسوس ہو رہی تھیں یہ ثمامہ تھے۔ جن کو یمامہ کے جنگی معرکوں میں مسلمانوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ وہ نہ صرف سرکشی کے مرتکب تھے بلکہ مسلمانوں کے خلاف مسلح بغاوت کے بھی مجرم تھے اور رسولؐ خدا کے شہر مقدس میں پا بجولاں لائے گئے تھے۔

ثمامہ اسلام کے کوئی معمولی دشمن نہ تھے وہ مسلمانوں کی شہ رگیں کاٹنے کے لئے میدان جنگ میں سر بکف نکلے تھے۔ ان کے دل و دماغ میں اسلام کے خلاف نفرت و بے رحمی کی زہرناکیاں بھری ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین تھے۔ ان کا وجود انتقام کی مکروہ خشونت میں ڈھلا ہوا تھا۔ لیکن اب جبکہ ان کی طاقت سلب ہو چکی تھی وہ محسوس کر رہے تھے۔ کہ جن لوگوں نے انھیں قید کیا ہے ان کی نظر میں ان کا وجود سینۂ گیتی پر ایک سیاہ داغ ہے جسکو مٹانے کے لئے ایک اشارے پر سیکڑوں ہاتھ حرکت میں آسکتے ہیں۔ لیکن ان کو بچانے کے لئے کسی دل میں کوئی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ مسلمانوں پر انھوں نے کبھی ترس نہیں کھایا تھا۔ پھر مسلمان اتنی کاری زخم خوردگی کے بعد ان پر کیوں ترس کھانے لگے! یہ سوچ کر مضبوط بندشوں میں جکڑا ہوا بے دست و پا "کافر" اسلام کی جنگی عدالت میں ہر لمحہ اپنی جان کی خیر منا رہا تھا۔

خوف — کشمکش — عجز و بیچارگی اور جاں گدازبایوسی کے عالم میں انھوں نے انسانی قدموں کی آہٹ سنی۔ اور گھبرا کر نظر اٹھائی۔ رسولؐ خدا اپنے دشمنِ جاں کی طرف تشریف لارہے تھے۔ ثمامہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگے۔ ان کو یقین تھا کہ یہ آہٹ ان کی موت کی آہٹ ہے۔ زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ تیزی سے ختم ہوا چاہتا ہے۔ موت کے فولادی ہاتھ کو اپنی گردن کی طرف بڑھتا ہوا محسوس کر کے انھوں نے فرطِ خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ دل کی دھڑکن دھک دھک کرتی ہوئی حلق میں پھنستی محسوس ہوئی۔ لیکن اسی لمحے انھیں کچھ ایسا احساس بھی ہوا جیسے آنے والے کی آہٹ میں انتقام کی دھمک کے بجائے نرم رو جذبات کا پُرسکون آہنگ ہے۔ جب یہ آہٹ ان کے نزدیک آکر رک گئی تو ان کے سراسیمہ کانوں نے ایک ایسی انسانی آواز سُنی جس میں پھولوں کی سی نرمی اور شہد کا سا مٹھاس گھُلا ہوا تھا۔ جس میں حلاوت اور درد کا بہترین امتزاج تھا۔

" ثمامہ! کہو کیا ہوا۔ ؟" اللہ کے رسولؐ نے استفسار فرمایا۔

موت کے خوف سے لرزہ براندام قیدی نے اس آواز میں دلسوزی کا رچاؤ اور ایک شفیق درد کی کسک محسوس کر کے حیرت سے آنکھیں کھول دیں۔ محمدؐ عربی کی مقدس شکل میں اسلام اپنے مکمل حسن و جمال کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا۔ انتقام کی بھرپور ٹھوکر کی توقع کرنے والے نے دیکھا کہ دو آنکھیں — اخلاق کے نور اور انسانیت کی لطافت سے لبریز دو آنکھیں ان کے چہرے پر درد و گداز کے ساتھ مرکوز ہیں! نفرت کی جوابی دھتکار کے منتظر نے سنا کہ ایک

انسان اس کو درد بھری آواز میں پکار رہا ہے! دشمن جانی پر ترس کھانیکا یہ جاں نواز انداز! انتقام کی خشونت کے جواب میں یہ خندہ پیشانی! — خون آشامی سزا کے بجائے یہ دلریشی کی روحانی چوٹ!" ثمامہ! کہو کیا ہوا؟" کے درد بھرے الفاظ ثمامہ کے پورے وجود کی وسعتوں میں گونجتے چلے گئے۔ جیسے ان الفاظ کے پردے میں مامتا سے بھی زیادہ حسین تر کوئی جذبہ کارفرما ہو! — جیسے کوئی چھپا ہنسنے والی روح ثمامہ کو ان تمام خود فریبیوں اور حماقتوں کی عبرتناک یاد دلا رہی ہو جن میں اسلام کی دشمنی اور طاقت کی سرمستی نے ان کو عرصہ تک مبتلا رکھا تھا۔ جیسے کوئی انتہائی عدل گستر ضمیر مجرم کو خود ہی اپنی سزا طے کرنے کی آزادی دیکر پوچھ رہا ہو کہ کہو کیا ایسے مجرم کو کسی حال میں معاف کیا جا سکتا ہے؟

ثمامہ آخر انسان تھے۔ اس غیر متوقع صورت حال نے ان کی پتھریلی اسلام دشمنی کو موم کی طرح پگھلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ انتقام کے جنون سے چونک اٹھے خوف، مایوسی، نفرت اور بیگانگی کے سارے جذبات تھرتھرائے اور حیرت و عقیدت کے قدموں پر ڈھیر ہو گئے۔ فرطِ خوف سے ٹھٹھرے ہوئے ہونٹوں نے ایک نئی اُمید کی حرارت پا کر حرکت کی اور ایک ہکلاتی ہوئی آواز میں ثمامہ نے جواب دیا:۔

"اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا۔ اگر..... تم مجھے قتل ..... کرو گے تو ..... ایک جاندار کو ..... قتل ..... کرو گے — اور اگر احسان کر کے چھوڑ دو گے تو ..... ایک احسان شناس پر احسان ہو گا....."

رسولؐ خدا نے یہ جواب سنا اور ثمامہ کو جوں کا توں زندہ چھوڑ کر خاموشی سے واپس تشریف لے گئے۔ وہ قیدی جو ہر لمحہ موت کو سر پر منڈلاتا ہوا محسوس کر رہا تھا

یہ دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گیا کہ کم سے کم زندگی کا ایک دن بھیک میں مل گیا ہے لیکن ان کو خوف تھا کہ اگلا دن ان کی موت و ہلاکت کا یقینی دن ہو گا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ جس شخص کو انھوں نے ناکردہ گناہی پر ستایا ہو وہ ان کی خطا کاریوں کو ہمیشہ کے لئے کس طرح بھول سکتا ہے! خون کے پیاسے دشمن پر اس سے زیادہ احسان کیسے کیا جا سکتا ہے آخر؟۔

دوسرے دن کا سورج نکلا تو ثمامہ اسی امید و بیم کی اُدھیڑ بن میں گم تھے آج پھر خدا کے رسولؐ اپنے جانی دشمن کے پاس تشریف لائے۔ ثمامہ نے دیکھا کہ محمد عربیؐ کی آنکھوں میں درد انسانیت کی جو ہوک کل نظر آئی تھی آج بھی اپنی اسی شان سے موجود تھی۔ آج پھر آپ نے مجرم سے وہی سوال کیا اور پھر وہی جواب پا کر اسی خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ ثمامہ پھر زندہ چھوڑ دیئے گئے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر اطمینان و سکون کا گہرا سانس لیا۔ لیکن جسم پر کسی ہوئی بندشوں پر حسرتناک نظر ڈال کر سوچا کہ غالباً یہ احسان ـــ آخری احسان ہے ـــ گردن زدنی مجرم کو زندگی کے دو دن بھیک میں دیئے جا چکے تھے ایک مظلوم اپنے "ظالم" قیدی پر اس سے زیادہ رحم کر کے اپنے آپ کو خطرے میں کیوں ڈالنے لگا آخر؟

"لیکن یہ رحم کیوں کیا جا رہا ہے۔ کیسے کیا جا رہا ہے ـــ کیسے کیا جا سکتا ہے؟" ثمامہ سوچتے رہ گئے "میرے وجود میں اسلام دشمنی کی مکروہ ظلمت کے سوا اور ہے کیا وہ کونسی کشش ہے جو محمدؐ عربی کو سراپا درد بنا کر بار بار میری طرف کھینچ رہی ہے؟ میرے جرائم کی سزا کا فیصلہ میرے خون سے لکھ دینا

کتنا آسان تھا اس کے لئے، لیکن وہ تو خود اپنے خون جگر اور اشک آلود دلسوزیوں سے میرے قلب و روح پر بجانے کونسی درد بھری حقیقت تحریر کرتا چلا جارہا ہے!

آخر کیوں ؟ — آخر کیسے ہو رہا ہے یہ سب کچھ ؟" اس احسان عظیم پر عقیدت کے جذبات دل کی گہرائیوں سے اُمنڈتے اور جرائم کے احساس اور خوف سزا کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر دل کی گہرائیوں میں پلٹ جاتے: "کل کیا ہوگا ؟" وہ انتہائی کرب کے عالم میں یہ فیصلہ کن بات سوچ رہے تھے ان کو رہ رہ کر اپنی بے رحمانہ زیادتیوں کا خیال آتا اور مایوسی کے منوں بوجھ تلے وہ حسین اُمید پستی چلی جاتی جس کی جاں نواز جھلک ان کو زندگی میں پہلی بار محمد عربی کی روشن آنکھوں میں نظر آئی تھی۔

آخر اس آس اور یاس کے ہنگامہ در آغوش مرحلہ کا تیسرا دن آیا — آج ثمامہ کا ذہنی اضطراب اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ ان کے خیال میں آج کا دن ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ کن دن تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر قیدی کے پاس تشریف لائے تو ثمامہ نے جھجھکتی نظر کے ساتھ آپ کی طرف ایسی نظر سے دیکھا۔ جس میں التجا، انفعال اور عقیدت کا تلاطم برپا تھا۔ حضورؐ کے روئے مبارک پر گہری سنجیدگی تھی۔ جسکو ایک پرسوز مسکراہٹ کی لطیف چاشنی نے دلکشی کی انتہاؤں تک پہنچا دیا تھا۔ آپؐ نے ثمامہ سے وہی سوال پھر کیا۔ ڈرتے ڈرتے ثمامہ نے اُنہی الفاظ میں جواب دیا۔ ایک ساعت کے لئے دونوں انسان خاموش ہو گئے۔ ایک طرف وہ "ظالم" تھا جس کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ دوسری طرف ایک "مظلوم" تھا جسکو خدا نے یہ موقعہ دیا تھا کہ ظالم کی اس کے ایک ایک ستم کا بھرپور انتقام لے سکے۔ اسلئے "کافر" کے دل میں

اس خاموشی نے اُمید اور خوف کے جذبات کی ہلچل بپا کر دی۔ لیکن پیغمبرؐ کی خاموشی سے اچانک انتقام کی فطری خواہش کی جگہ ایک ایسی عظیم جذباتی قربانی کا نور پھوٹ نکلا جسکو صرف وہی شخص پیش کر سکتا ہے جس نے اپنا تمام تر وجود خدا کی خوشی اور نوع انسانی کی خیر اندیشی میں گم کر کے رکھدیا ہو۔ ٹھیک اس وقت جب "مجرم" یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا سر تن سے جدا کیا جانے ہی والا ہے خدا کے رسولؐ کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور ثمامہ کی بندشوں کو کھولتے ہوئے اعلان کیا۔

"جاؤ ثمامہ! تم آزاد ہو!"

یہ چند الفاظ "مجرم" کے وجود میں زلزلہ بن کر پیوست ہو گئے معاف کرو اور بھول جاؤ کی اس عظیم مثال نے دشمن کو حیرت و عقیدت سے گنگ کر کے رکھدیا۔ جرائم سے چشم پوشی کے اس اسوۂ حسنہ کو دیکھکر خطاکار کا ضمیر جاگ اُٹھا اور احساس گناہ کی بے پناہ تڑپ اس کے ہر رگ وریشہ سے اٹھی اور اس کے پتھر جیسے دل کو آناً فاناً پانی پانی کر گئی۔ نفرت سنگدلی اور وحشت وبربریت کی حیوانی زندگی نے اس احسانِ عظیم کے قدموں پر سر رکھ کر دم توڑ دیا۔ لیکن اس وقت جبکہ ثمامہ کا پورا وجود ایک جذبۂ شکر میں ڈھل گیا تھا ان کی زبان یکسر خاموش تھی۔ الفاظ جذبات کے آگے بے ہوش پڑے تھے۔ ثمامہ اسی کیفیت میں اُٹھے اور مسجد نبویؐ سے باہر نکل گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد "مجرم" خود اپنی خوشی سے پلٹا تو اس کا جسم آزاد تھا مگر قلب وروح اسیر ہو چکے تھے۔ لوہے کی زنجیروں نے صرف جسم کو قابو میں کیا تھا، لیکن عفو و درگذر اور احسان و اخلاق نے روح کو پابجولاں کر دیا تھا۔ ایک دل کو خرید لیا تھا۔ ایک زندگی کو مسخر کر لیا تھا۔ کشاں کشاں ثمامہ

بارگاہِ رسالت میں پہنچے اور سپردگی کے بے پناہ جنوں میں یہ غلغلہ انگیز اعلان کیا:۔

"خدا کی قسم! آج سے پہلے آپؐ کی ذات، آپ کے مذہب اور آپ کے شہر سے زیادہ مجھے کسی شے سے نفرت نہ تھی۔ لیکن اب آپؐ کی ذات، آپ کے دین اور آپ کے دیار سے زیادہ محبوب کوئی شے نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ بالکل سچے ہیں اور آپؐ کا پیغام ایک آخری سچائی ہے۔ کل تک میں آپ کا دشمن تھا لیکن آج سے آپ کا غلام ہوں۔"

یہ عہدِ وفا کر کے ثمامہ اپنے وطن یمامہ لوٹ گئے اور جس اسلام کو مٹانے کی کوشش میں ان کی عمر گذری تھی اس کی تبلیغ و اشاعت میں پروانہ وار منہمک ہو گئے دنیا حیران تھی کہ وہ آخر کس طرح اس حد تک بدلے کہ ان کو پہچاننا دشوار ہو گیا! وہی انسان جس کی عمر اسلام کو مٹانے کی دھن میں گذری تھی اچانک اسلام کا ایسا شیدائی ہو گیا کہ اس کی تبلیغ و اشاعت ہی اس کا واحد مقصدِ حیات بن کر رہ گئی۔ ان کی زندگی کا یہ حیرت ناک انقلاب اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر دکھائی دیا تھا جب یمن کے افق سے مسیلمہ کذاب کا ہولناک فتنہ اٹھا اور یمامہ کے طول و عرض میں ارتداد کی زہریلی آندھیاں چل پڑیں۔

"نبوت کا یہ مدعی جھوٹا ہے" اس طوفانِ بلا میں ثمامہ کی آواز گونج رہی تھی "لوگو! مجھ سے پوچھو کہ سچے پیغمبرؐ کا کردار کیسا ہوتا ہے۔ بچو اس جھوٹی روشنی سے جس میں سیاہی کے سوا کچھ نہیں" اسلام کی حفاظت کی دھن میں جو کبھی جنگ لڑنے والا سپاہی جب یہ دیکھ کر مایوس ہو گیا کہ اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے تو اس نے وطن عزیز کو چھوڑ دیا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں سانس لینے کے

لئے تیار نہ تھا۔ جس کی فضاؤں میں اسلام دشمن فتنہ کا زہر سمایا ہوا ہو۔ وطن کی عزیز دنیا کو چھوڑ کر وہ مسلمانوں کے ان جنگی دستوں سے جا ملا جو اس فتنے کا مقابلہ کرتے پھر رہے تھے، اسلام کی راہ میں اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا اور آخر مسیلمہ کذّاب کے ایک حمایتی کے ہاتھوں شہادت حق کا کاری زخم کھا کر یہ وطن چھوڑنے والی روح نے اپنے خدا کے لئے ساری دنیا چھوڑ دی۔

کیسے تھے وہ لوگ جو احسان شناس تھے!۔ جن کی جان کو اس وقت تک قرار نہ آتا تھا جب تک رسول اللہؐ کے احسانات کے جواب میں جان ہی قربان کر کے نہ دکھا دیں۔ لیکن کیسے ناشکرے ہیں ہم لوگ جو اپنے اس محسن اعظم کو بھول گئے جس نے ہمارے درد میں زندگی کے ۶۳ سال کی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ جس ہستی نے ہماری ابدی نجات و فلاح کے غم میں اپنی پوری زندگی گھُلا دی کیا اس کے لئے ہمارے وجود میں خونِ حیات کا ایک قطرہ اور اشکِ انفعال کی ایک حقیر بوند بھی نہیں؟ پھر کتنی آنکھیں ہیں جو اپنی اس تہی دامانی اور بے حسی پر آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں۔۔ کتنے دل ہیں جو سینے کی گہرائیوں میں اس صورتِ حال پر تڑپ اُٹھتے ہیں۔۔۔ کتنے ہاتھ ہیں جو خدا کے آگے اس دعا کی ہوک میں دراز ہوتے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس روحانی موت سے نجات عطا فرما۔ ہمیں توفیق دے کہ اسلام کی قیمت ادا کرنے کے لئے ہمارا ناکارہ وجود ایک جذبۂ بیتاب میں ڈھل جائے" جہاں بے حسی کے ساتھ یہ احساس بے حسی بھی نہ ہو وہاں "ہم مسلمان ہیں" کا دعویٰ آخر کیا معنی رکھتا ہے؟....

جی ہاں ہم مسلمان ہیں تسلیم و انقیاد کی ہر ادا سے عاری اور پھر بھی مسلمان!

خدا ہی سب کچھ ہے :-

حضر موت کی سرزمین پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دَور خلافت میں ارتداد کا دردناک فتنہ سر اُٹھا رہا تھا۔ "روحانی خودکشی" کی اس خونچکاں تحریک کا لیڈر اور قبیلہ کندہ کا سربراہ اشعث بھیڑوں کی پوری قوت سے چیخ رہا تھا کہ "عرب اپنے آبائی عقیدوں کی طرف لوٹ رہا ہے" ایمان و یقین کے وہ چراغ جن میں دل و جگر کا خون پوری طرح شامل نہ ہو سکا تھا۔ شیطان اور منافقوں کی زہریلی پھونک سے گُل ہوتے جا رہے تھے۔ کیسی خوفناک تھی وہ تاریکی جو در و دیوار کے بجائے آدمی کے دل و دماغ پر چھائی جا رہی تھی کیسی مہیب تھی وہ ویرانی جس میں روحوں کی بنی بنائی دنیائیں اُجڑ رہی تھیں۔

لیکن ٹھیک اسی خوفناک تاریکی میں وہ ایماندار انسان چاند ستاروں کی طرح طلوع ہو رہے تھے جنکو خدا نے اپنے آخری رسولؐ کے نورِ یقین سے تراشا تھا۔ خدا جو کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ان انسانوں کے ایمان و عمل کا جیتا جاگتا پیکر اسی خدا کا آئینہ دار تھا۔ خدا کی وفا کیش مخلوق احساسِ شکر اور احسان شناسی کے جذبۂ بیتاب میں ڈھل گئی تھی۔ اپنے محسن عظیم --- اپنے نادیدہ خدا سے تعلق کا سوزِ بیکراں ان لوگوں کے رگ و ریشہ سے پھوٹ پڑتا تھا۔ آخرت کی روشنی میں تمام دنیا کے ٹھوس تعلقات دھندلا رہے تھے، ماند ہو رہے تھے۔ گم ہوتے جا رہے تھے۔

حضرت امرء القیسؓ ایک ایسے ہی خدا شناس بزرگ تھے جو اپنے قبیلہ کندہ کے ارتداد کا سر کچلنے کے لئے ہمہ تن جہاد، سراپا اضطراب بنے ہوئے تھے۔

اسلام کو خطرہ میں دیکھ کر ان کو اپنی کسی ذاتی بربادی کا خوف ہی نہ رہا تھا۔ خاندانی تعلقات، کاروباری مفادات اور جانیں عزیز ہر شے وہ اسلام کے دفاع پر نچھاور کئے دیتے تھے۔ ان کے آتش ریز اشعار سربھرے قبیلے کی بھرپور قوت کے سر پر صور اسرافیل کی سی گرج پیدا کر رہے تھے۔ سورج ان کو تمام دن حق پرستی کی دُھن میں دوڑتا ہوا پاتا اور چاند ستارے ان کو اسلام کی تڑپ میں سجدہ گاہ پر نیم بسمل حالت میں پھڑ پھڑاتا ہوا دیکھتے۔ اسلام کے درد سے معمور دل کبھی خدا کے سامنے خون کے آنسو رو تا تھا تو کبھی انسان کے سامنے ذوقِ شہادتِ حق اور اعلائے کلمۃ الحق کے نشے سے جھومتا ہوا مردِ مومن تلواروں کی چھاؤں میں وجد کرتا تھا۔

آخر اس اکیلے انسان کی انتھک جدوجہد پورے ماحول پر غالب آئی — حق جب سچ مچ سامنے آتا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ باطل ٹھہر سکے۔ ارتداد کے سیلاب کا منہ پھیر دینے والے مجاہد نے ولولہ انگیز اشعار میں یہ فاتحانہ پیغام خلیفۂ وقت کی خدمت میں روانہ کیا کہ:-

"میں اب چین سے بیٹھا ہوں جب میرے پڑوس میں کوئی ایک گھر بھی ایسا نہ رہا جہاں ہمارے نبیؐ کی شانِ صداقت میں کوئی گستاخی کرنے والی زبان موجود ہو۔ ایسی ہر زبان قلم کر دی گئی۔ ایسی ہر آواز ہمیشہ کے لئے خاموش کی جا چکی ہے۔"

بغاوت کا فتنہ فرو ہو چکا تو خدا کے باغیوں کو مقتل میں پابجولاں لایا گیا۔ یہاں بھی امراء القیسؓ کی شمشیر بے نیام عبودیت کے نشے میں وجد کر رہی تھی۔ اس تلوار کے لئے امرء القیسؓ اس کے تھے جو ان

کے خدا کا تھا جو ان کے خدا کا نہ ہو اس سے امرء القیسؓ کا کیا تعلق؟ ہر تعلق اس عظیم ترین واحد تعلق کے ذیل میں آتا ہے جس کا نام خالق و مخلوق، عبد و معبود اور بندے اور خدا کا مقدس ترین تعلق ہے۔

ٹھیک اس وقت جب امراء القیسؓ کی تلوار اسی جذبۂ بندگی میں خدا کے باغیوں پر "بزن" بول رہی تھی ان کی تلوار کے نیچے ان کے اپنے چچا کا سر آ گیا ان کی آنکھوں نے یہ دردناک منظر دیکھا۔ ان کے کانوں نے اپنے مرتد چچا کے یہ جانگداز چیخ سُنی — "میرے بھتیجے! — کیا تمہاری تلوار اپنے چچا کو بھی کاٹ ڈالے گی ہائے!"

کیسا نازک مقام تھا! — کتنا زہرہ گداز موڑ! — امراء القیسؓ کے ہاتھوں کی رگوں میں گردش کرتا ہوا جو خون تلوار کو حرکت دے رہا تھا وہی خون باہر "کھڑا ہوا" ان کے مجازی باپ — ان کے حقیقی چچا کا روپ دھار کر سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

لیکن وہ انسان جو اس وقت نہ کسی کا بیٹا اور بھتیجا تھا۔ نہ کوئی اس کا باپ اور چچا — جو محض خدا کا بندہ تھا فرطِ بندگی سے بیتاب ہو کر آگے بڑھا۔ جسم و جاں، خون و ایمان کی اس لرزہ خیز کشمکش میں ان کی فاتحانہ آواز گونج اٹھی۔

"ہاں بے شک آپ میرے چچا ہیں۔ لیکن خداوند ذوالجلال میرا رب ہے — وہ میرا مالک ہے، وہی سب کچھ ہے!"

زبان سے یہ زلزلہ خیز اعلان حق ہوا — دل کی مجاہدانہ دھڑکنوں نے اس کی تائید کی اور — مومن بھتیجے کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی ننگی تلوار نے مرتد چچا کی گردن اڑاتے ہوئے عزیمتِ مومنانہ کا منھ بولتا ثبوت پیش کیا۔ عبودیت کے

پیکر بیتاب نے ایمان کے ایک اشارے پر خون کی شہ رگ کاٹ کر دکھادی تھی۔ ثابت کردیا تھا کہ اللہ پر ایمان کا جذبہ کامل رگوں میں دوڑتے ہوئے خون سے بھی بڑی حقیقت ہے۔ جل جلالہٗ و عمّ نوالہٗ۔

―――― ((۲)) ――――

ضعف پیری سے کانپتے ہوئے حسیلؓ بن جابر جہاد سے معذوروں کے ساتھ مدینہ میں چھوڑ دیئے گئے تھے اور خدا کے نام پر جان و دل کی بازی لگانے والے مجاہد محاذِ احد پر جا چکے تھے ان مجاہدوں میں حسیلؓ کے لختِ جگر حضرت حذیفہؓ بھی شامل تھے، لیکن عمر میں بوڑھے اور ناتوان اور ایمان میں جوانمرد و توانا حسیلؓ کی تسکین کے لئے یہ بات کافی نہ تھی کہ انھوں نے حق و صداقت کی قربان گاہ پر اپنے پیارے بیٹے کو بھینٹ چڑھ جانے کے لئے ہنسی خوشی بھیجدیا ہے جب شہادت کا بازار گرم ہو رہا ہو سر دھڑ کی بازی لگانے والوں پر رحمت کے لامتناہی خزانے لٹتے ہوئے دیکھکر خدا کے بندے تیرہ و تلوار کی ایمان و عزیمت کا مظاہرہ کر رہے ہوں تو بھلا حسیلؓ جیسے انسان کو مدینہ کی بستی اور گھر کے گوشۂ عافیت میں کس طرح قرار آسکتا تھا۔ جھرّیوں میں لپٹا ہوا ضعیف و ناتواں چہرہ حسرت بھرے آنسوؤں سے تر ہو ہو جاتا تھا۔ رہ رہ کر کانپتے ہوئے ہاتھ دعائے شہادت کے لئے پھیل جاتے اور دھندلائی ہوئی بوڑھی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھتیں تو روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ آخر کس قدر دلکش ہے وہ موت جو خدا کی راہ میں آئے کہ خدا کے بندے اس کے عشق میں اس طرح تڑپتے تھے۔

جیسے وہ بے طرح پیاسے ہوں اور خدا کی راہ میں موت ہی ان کی پیاس کا واحد علاج ہو۔

اس حال میں مدینہ میں یہ خبرِ بد پہنچی کہ جنگِ اُحد کی بساط اچانک اسلام کے خلاف اُلٹ گئی ہے۔ اسلام جان و دل سے زیادہ پیارا اسلام موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہوا خدا کے بندوں کو پکار رہا ہے۔ رسولؐ خدا کی شہادت کی جھوٹی خبر نے رہے سہے اوسان خطا کر دیئے۔ بڑے بڑے بہادروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور دنیا تاریک ہوگئی۔ وہ پاؤں اُکھڑ گئے جن میں پہاڑوں کی صلابت نظر آتی تھی۔ یہ نقشہ دیکھکر مدینہ سے معذوروں کا وہ قافلہ راہِ مولا میں سرکٹانے نکل کھڑا ہوا جسکو جہاد کی تکلیف سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ ان سرفروشوں اور جاں نثاروں کی بیتاب بھیڑ میں بوڑھے حسیلؓ بھی شامل تھے۔

میدانِ جنگ پر نظر ڈالی تو قیامت کا منظر سامنے تھا بدحواسی اور خوف کی تاریکی میں اپنے اور بیگانے کی تمیز اُٹھ گئی تھی۔ اندھی تلواریں اور بہرے نیزے فضا میں کوندرہے تھے اور کسی کو یہ ہوش نہ تھا کہ کس کی تلوار سے کون کٹ کٹ کر گررہا ہے۔ لیکن حسیلؓ کو اس منظر نے ذرا بھی خوفزدہ نہ کیا۔ شہادت کی والہانہ تڑپ ان کو آگے کھینچے لئے جارہی تھی۔ آخر اس بھنور میں جا پھنسے جہاں مسلمانوں کی تلواریں بے خبری کے عالم میں مسلمانوں ہی پر گر کر زمین کو لالہ زار بنارہی تھیں۔ ان کے بیٹے حذیفہؓ نے بوڑھے باپ کو شہادت کے لئے بیتابانہ دوڑتا ہوا دیکھا۔ پھر وہ مسلمانوں کی تلواروں کے نرغے میں دکھائی دیئے۔ حذیفہؓ چیخ اٹھے "مسلمانو!۔ میرے باپ!۔ ارے میرے باپ!!" لیکن یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اس سے پہلے کہ مسلمان سوچ سمجھ سکتے، حسیلؓ مسلمانوں کے

ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ شہادت کے بوڑھے متوالے کو مومنوں کے ہاتھوں جامِ شہادت ملا تھا۔ کتنا بلند تھا وہ شہید جسکو کافر کی تلوار چھو بھی نہ سکی!

اب دیکھنا یہ تھا کہ حسیلؓ کے صاحبزادے حذیفہؓ بن یمان کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟ مسلمانوں کی تڑپ میں اور خدا و رسولؐ کے عشق میں جو پیرِ فانی ذوقِ شہادت سے جھومتا ہوا نکلا تھا۔ اس کو خود مسلمانوں کی تلوار نے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ یہ دردناک غلطی جتنی لرزہ خیز تھی یہ حادثہ اتنا ہی جانگداز حادثہ تھا۔ تمام مسلمان اس حادثے سے بے حد متاثر تھے اور خود اللہ کے رسولؐ کو شدید صدمہ تھا لیکن حذیفہؓ ٹھیک، اس وقت انتقام و عصبیت سے آگ بگولہ ہونے کے بجائے خدا کے آگے اس طرح گڑگڑا رہے تھے "میرے مولا! میں نے ان غلطی کرنے والوں کو معاف کیا۔ تو بھی ان کو معاف کر دے۔ تیری رحمت، تیرے عفو درگذر کی کوئی حد نہیں!۔"

یہ تھے وہ لوگ جن کے مصفا قلوب کو اللہ کی محبت نے سمندر جیسی وسعت عطا کر دی تھی اور یہ تھے وہ نفوسِ مقدسہ جن کی جاں نثاریوں اور سرفروشیوں کی سینچی ہوئی کھیتی کو ہم آج تک کاٹ رہے ہیں۔ رضوان اللہ علیھم اجمعین۔

عدل و انصاف کے پیکر اور درد و غمگساری کے عظیم ترین مظہر حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ حذیفہؓ کو مسلمانوں کی طرف سے "دیت" ادا کر دیں۔ لیکن ان کی غیرتِ ایمانی نے اس خون کی قیمت لینا گوارا نہ کیا جو خدا کی راہ میں نثار ہوا تھا۔

"نہیں اے اللہ کے رسولؐ" حذیفہؓ نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز

میں کہا" مسلمانوں کی بھول قابل رحم ہے، لائق سزا نہیں۔ پھر خدا کا بندہ خدا کی راہ میں شہید ہوا ہے دیت اور قصاص کچھ نہیں۔ میں تو خوش ہوں کہ میرے باپ کی بوڑھی ہڈیاں خون شہادت میں نہا کر وہاں پہنچ گئیں جہاں جوانمرد شہیدوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

(۳)

حضرت سعید بن العاصؓ مومن تھے ان کے باپ عاص کافر۔ وہ کفر پر ہی زندہ رہے اور کفر پر ہی ہلاک ہوئے۔ حضرت سعیدؓ نے غزوۂ بدر میں ان کی لاش کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھا جن کو حضرت علیؓ کی تلوار نے کاٹ ڈالا تھا لیکن سعیدؓ نے یہ سنسنی خیز منظر کمال ضبط و سکون کے ساتھ دیکھا۔ ان کے ہونٹوں سے نہ کوئی درد بھری کراہ نکلی نہ رگوں میں عصبیت و انتقام کے شعلے بھڑکے ان کی نظر میں ان کے باپ اسی وقت مر چکے تھے جب انہوں نے اسلام و ایمان کی پکار سے منہ موڑا اور خدا سے بغاوت و انکار ہی کی کافرانہ زندگی پسند کی تھی۔ اسلئے وہ خود اپنے قاتل تھے۔ خود ہی ظالم تھے اور خود ہی مظلوم بھی! حضرت علیؓ کی تلوار نے ایک زندہ انسان نہیں، ایک انسان کی زندہ لاش کے ٹکڑے کئے تھے۔ اس لئے سعیدؓ کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے باپ کا ماتم کریں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص کو قتل کیا تھا ایکبار کسی مجلس میں حضرت عمرؓ اور حضرت سعیدؓ دونوں بزرگ یکجا ہوئے اور بدر کے ان مشرک مقتولین کا ذکر چھڑ گیا جن کو ان کے مومن عزیزوں نے موت کی سزا دی تھی۔

حضرت عمرؓ نے حضرت سعیدؓ کی طرف رُخ کیا اور ایک ممکن غلط فہمی رفع کرنے کی غرض سے کہا "میں بھی ایک عاص کا قاتل ہوں۔ مگر وہ میرے ماموں تھے آپ کے باپ نہیں!"

وہی سعیدؓ جنھوں نے صبر و رضا کی عظیم کیفیت میں اپنے کافر باپ کی ہلاکت دیکھی تھی ــــ جو اس وقت بھی مشرک مقتولوں کی کہانی میں اپنے باپ کا تصور کر کے ذرا بھی آزردہ نظر نہیں آتے تھے۔ یکایک حضرت عمرؓ کی اس گفتگو پر چونک پڑے!۔ اس غلط فہمی کی صفائی کے معنی انھوں نے یہی نکالے کہ لوگوں کو میری اسلام دوستی میں شک ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ میں اپنے باپ کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھکر یہ حقیقت بھول گیا تھا کہ یہ میرے باپ کا نہیں خدا کے ایک باغی کا نجس خون تھا!۔

یہ سوچتے سوچتے حضرت سعیدؓ نے غیرتِ ایمانی سے تمتمایا ہوا گلرنگ چہرہ اوپر اُٹھایا اور خلوص کی ڈوبی بھری آواز میں جواب دیا۔ "اے عمرؓ! اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ نے کون سے کافر کو مارا۔ خدا کی قسم آپ حق پر تھے اور ــــ میرے باپ باطل پر! کیا بُرا تھا اگر وہ آپ کے ہاتھوں قتل ہوئے ہوتے؟"

یہ نوائے حق سُنکر تمام مجلس پر گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہ اسی بنی اُمیہ کے خاندان کا ایک فرد نسلی عصبیت پر ایمان کی ضرب کاری لگا رہا تھا جس کے متعلق خاندانی، خونی اور نسلی تعصب کے شبہات ہوا کرتے تھے۔ کچھ لوگ سر جھکائے ہوئے اس "آواز" پر غور کر رہے تھے اور کچھ لوگ خود حضرت سعیدؓ کو

نزدا عقیدت سے تکتے رہ گئے! سب لوگ اس حسین چہرے میں ان کے دل کی یہ تحریر پڑھ رہے تھے کہ "میں مومن ہوں — اور مومن کی جان خون میں نہیں ایمان میں ہوتی ہے۔"

کیا اس تحریر کا کوئی دھندلا سا نقش بھی ہمارے وجود کے کسی بھی گوشے میں کسی کو نظر آرہا ہے؟ کیا زندگی کے کسی بھی موڑ پر ہم نے اس حقیقت کا ثبوت دیا کہ ہم مومن ہیں اور مومن کی جان خون میں نہیں "ایمان" میں ہوتی ہے — سوچو — نفاق بے کرداری، دنیا پرستی اور خدا فراموشی کی غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے مسلمانو! اگر یبان غیرت کی اگر کوئی دھجی باقی ہے تو اس میں منہ ڈال کر سوچو کہ تم کہاں ہو — اور تمہارے وہ اسلاف کہاں تھے جنھوں نے حق کے قدموں میں اپنے کلیجے، اپنے دلوں کے ٹکڑے، اپنی پوری کائنات اس طرح نچھاور کردی تھی جیسے یہ سب کچھ انھیں لٹانے اور قربان کردینے ہی کے لئے ملا تھا — العظمۃ للہ۔ العظمۃ للہ۔

سورج ڈھونڈتا پھر رہا ہے، چاند تلاش میں سرگرداں ہے، آسمان کھوج لگا رہا ہے کہ مسلمان کہاں گئے — وہ امت کہاں گئی جو حق کی تڑپ میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی تھی — جس کے قدموں کی دھمک سے پہاڑوں پر رعشہ طاری ہوتا تھا اور جس کی نظر میں یہ دنیا — یہ گریز پا، حقیر، کم قیمت دنیا متاع کاسد سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی — لیکن ہم فخر سے سر اٹھا کر کہہ رہے ہیں۔

ہم ساٹھ کروڑ ہیں — ہم ساٹھ کروڑ ہیں!

عشقِ رسولؐ

خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دَور کے ایماندارلوں نے جس طرح والہانہ پیار کیا تھا وہ تاریخ انسانیت کا ایک حسین ترین باب ہے۔

دنیا کی مختلف قوموں کی روایات میں عشق و محبت کی مختلف کہانیاں ملتی ہیں جن میں کسی خیالی ہیروئن کے ساتھ کسی تخیلاتی ہیرو کی بے پناہ محبت کی داستان سنائی جاتی ہے لیکن اسلام کی تاریخ میں "عشق رسولؐ" کا ایک ایسا ٹھوس تاریخی واقعہ اور ایسی تحیّر انگیز سچی کہانی ملتی ہے جہاں ایک مرد کی عظیم ترین شخصیت مردوں عورتوں اور بچوں تک کے سینے میں ایک انتہائی مقدس عشق کا سیماب کوٹ دیتی ہے۔ جہاں جنسی کشش اور خدو خال کی جوانی اپیل کی بجائے سیرت و کردار، حقیقت شناسی اور حق کوشی کا حسن و جمال ایک مرد کے وجود سے مقناطیسی سوتے کی طرح ابل پڑتا ہے اور ریگستان کے اُجڈ وحشیوں کو مسحور کر کے حقائق پر پروانہ وار نثار ہو جانے کے لئے بیتاب کر دیتا ہے۔

خدا پرستی کے نور میں نہائی ہوئی یہ شخصیت روح و دل کے ان اندھوں کو بھی دکھائی دیتی ہے جن کو ان کا خدا نظر نہیں آتا۔ پتھروں کے بے حس پجاری بھی اس دلکش کردار پر نظر ڈالتے ہیں تو فرط عقیدت سے سر دھننے لگتے ہیں اور کامل چالیس سال تک اس کو "امین و صادق" کہتے کہتے ان کی زبانیں سوکھنے لگتی ہیں۔ پھر جب انسان تک اپنا آخری پیغام پہنچانے کے لئے خدائے عزوجل اس

انسان کامل کو رسالت کے خلعت فاخرہ سے مشرف فرما دیتا ہے اور اس وقت کے کفار و مشرکین کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اسکو اس بلندی پر پہنچانے سے عاجز ہوکر قہر و انتقام کی آگ اگلنے لگتی ہیں — تو رشن ضمیر روحوں کے قافلے آگے بڑھتے ہیں "ہم تجھ پر نثار۔ ہمارے ماں باپ تجھ پر قربان!" کے والہانہ نعروں سے حرم کی فضائیں گونج اٹھتی ہیں۔

یہ نعرے کھوکھلے الفاظ نہ تھے بلکہ دلوں کی دھڑکنوں اور روحوں کی بیتاب چیخیں ان میں سمٹ آئی تھیں۔ یہ سپردگی و جاں نثاری کے نعرے آج بھی تاریخ کے سینے پر خونِ دل و جگر سے سرخ و تازہ نظر آتے ہیں:-

عرب کے بیداکشی غلاموں اور کچلے ہوئے پامال غریبوں کا ناتواں طبقہ جسکو دنیا نے اس کی تمام انسانی صلاحیتوں سے یکسر مایوس ہوکر جانوروں کی ذلیل سطح پر لا پٹکا تھا — وہی طبقہ اس انسانؐ کے "فیض نظر سے" سرفراز ہوتا ہے تو تہذیب و انسانیت کے جوہر لطیف اور معاشرہ کے مکھن میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ وہ ایک نئی زندگی، نئے ایمان، نئے مقصد حیات اور نئی لگن کے ساتھ اس جاں نواز ہستیؐ کی طرف بڑھتا ہے تو ایک بار پھر ماحول کی تہر مانیت آڑے آنا چاہتی ہے اور اس کی راہ میں ظلم و استبداد کی آتشیں دیوار کھڑی کر دیتی ہے۔ لیکن جو کارواں بڑھ نکلا تھا وہ کسی طرح نہیں رکتا آگ کی بھٹیاں آتی ہیں لیکن خون، پسینے اور آبلوں کے پانی سے بجھ کر رہ جاتی ہیں — سنگ و خشت کی بوچھاڑ ہوتی ہے مگر صبر و تحمل کی فولادی دیواروں سے ٹکرا کر اینٹ اور پتھر پھول بن جاتے ہیں۔ خونچکاں شکنجے کسے جاتے ہیں لیکن حق کی آواز کا گلا گھونٹنے سے پہلے

خود پارہ پارہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ کاروانِ شوق خون، آگ اور پتھراؤ کے درمیان سے کشاں کشاں گذرتا ہوا اس نادر و نایاب انسانی شخصیت کے گرد عقیدت و حلقہ بگوشی کا اٹوٹ ہالہ بنا دیتا ہے۔

سماجی اعزاز اور دولت و ثروت کی بلندیوں پر متمکن حقیقت شناس لوگ فداکاری و جاں نثاری کا یہ حیرتناک منظر دیکھتے ہیں اور سنسنی خیز فضا میں اسی انسان کامل کی شخصیت سے مسحور ہو کر اپنی تمام مادی سربلندیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اس کے قدموں پر آ گرتے ہیں۔ اس طرح کمزور اور طاقتور کے امتیازات چشم زدن میں محو ہو جاتے ہیں اور انسانیت کے آستانے پر غلام اور آقا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔

کتنا بیش بہا اور کتنا دل نواز ہو گا وہ انسانؐ جو گلیم پوشانہ سادگی میں بھی اتنا بلند و پُر جلال نظر آتا تھا کہ تخت و تاج پر ایک نگاہِ غلط انداز سے زلزلے طاری کر دے سیم و زر کے جگمگاتے ہوئے ستارے اپنے قدموں کی خاک سے کجلا کر ماند کر دے اور انسانی رگوں میں دوڑتے ہوئے خونِ حیات کو اپنے نقوشِ پا سے اُجاگر کرنے کے لئے رگ و پے سے ٹپک پڑنے پر بیتاب کر ڈالے! ــــ ہاں ــــ اس نے یہ سب کچھ کیا ــــ یہ شاعری نہیں ــــ تاریخ ہے! وہ کونسی شے ہو سکتی ہے جسکو انسان دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو اور وہی شے اس انسان کامل کے قدموں پر فرطِ شوق میں لٹا نہ دی گئی ہو؟ اس کی ایک نگاہِ کرم کی بھیک حاصل کرنے کے لئے لوگوں نے راہِ مولا میں گھر بار لٹا دیئے ــــ کفر و اسلام کے درمیان حق اور باطل کا خطِ امتیاز کھینچنے کے لئے شہ رگوں کا لہو نچوڑ دیا گیا۔ اولاد اپنے

ماں باپ سے کٹ کر نکل گئی۔ ماں باپ نے چہیتی اولاد کی ساری چاہت خدا اور اس کے رسولؐ کی چاہ پر بھینٹ چڑھادی تمام دنیائے رنگ و بو سے دامن چھڑا کر گوشت پوست کے انسان روح و تلب کی پکار پر دوڑ پڑے اور اس کےؐ پیوند در پیوند دامن سے اس طرح جا لپٹے جس طرح ایک معصوم بچہ تڑپ کر ماں کی چھاتی سے چمٹ گیا ہو۔ دولت کے لبالب خزانوں کو خالی کر کے لوگوں نے اس بات میں عظیم مسرت اور فخر محسوس کیا کہ اس کے در کے بھکاری کہلائے جائیں۔ وطن کی فطری محبت مغلوب ہو گئی — لوگوں نے ان فضاؤں میں سانس لینا گوارہ نہ کیا جہاں اس انسان کاملؐ کے خلاف نفرت و انتقام کا زہر سرایت کر گیا تھا، اپنے کاروبار — عزیز واقربا — دوست واحباب اور تمام تر دلچسپیوں کی "جنت" کو ٹھکرا کر ان محمدؐ کے دیوانوں نے خانہ ویرانی اور خانہ بدوشی کے خارزاروں کو لبیک کہا، دشت وصحرا کی خاک چھانی اور دیس دیس کی ٹھوکریں کھائیں — اور یہ سب کچھ صرف اسلئے کہ محمد عربیؐ کی حسین نگاہ نے ان کے سینوں میں حق و صداقت کی جو چنگاری روشن کردی تھی وہ کجلانے نہ پائے۔

پھر یہ سب کچھ لٹا دینے کے بعد امتحان شوق کی وہ آخری گھاٹی آئی جہاں خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو قربان کر دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو عقیدت و شوق کے ان بیتاب پیکروں نے آبدار خنجروں پر گردنیں رکھدیں۔ اپنے خون میں نہا نہا کر وہ یہی کہتے رہے "اے خدا کے رسول! ہم تجھپر نثار — ہمارے ماں باپ تجھپر نثار!" زخموں سے چور اور جراحتوں سے چھلنی اجسام ایک اس سے بھی کاری گھاؤ کھانے کے لئے سپردگی کی لذت میں جھومتے ہوئے

بڑھتے تھے ستر ستر زخموں کا "تاریخی اسکور" بنانے کے بعد بھی شہادت حق کا خوں چکاں کھیل کھیلنے والے اپنے ذوق جانبازی میں کمی نہ پاتے تھے۔ جو آنکھ ترچھے تیوروں سے محمد عربیؐ کی طرف اُٹھی وہ فولادی ڈھالوں کے پیچھے بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ جو ہتھیار اس کے خلاف اٹھے جان دینے والوں نے ان کے آگے جسمانی گوشت کی دیواریں کھڑی کردیں جن پر سیکڑوں زہرناک ترکش خالی کئے گئے مگر اس دیوار میں جنبش نہ ہوئی۔ کفر کی طرف سے تیروں کی باڑ چلتی تھی تو ادھر عقیدت کے متوالے برہنہ سینے کھولے ہوئے سامنے آتے تھے۔ ادھر سے مرگ و ہلاکت کی آندھیاں اٹھتی تھیں تو ادھر سے حق و صداقت کے نشے میں وجد کرتے ہوئے سر اُبھرتے تھے۔

کتنا طاقتور — کتنا جلال آمیز — کتنا مستحکم تھا یہ "عشق رسولؐ" کہ زمانے بھر کی نفرت بھری طاقتیں مل کر بھی اس کو زیر نہ کرسکیں۔ آخر آخر یہ عشق — یہ "جنوں" ہی فاتح رہا۔ محمد عربیؐ کی سچائی کا حسن و جمال جزیرہ نمائے عرب پر چھاتا چلا گیا۔ ماحول کا نقشہ بدل گیا انسانیت کی کایا پلٹ گئی اور جو انسان کاملؐ انسانیت سوز دنیا میں خدا اور انسان کا نام لیتا ہوا تنہا اٹھا تھا اس نے ۲۳ سال کے بعد بستر وفات سے اس دنیا پر نگاہ واپسیں ڈالیں تو ایک لاکھ سے زیادہ انسانی سر خدائے واحد کے آگے سجدے میں پڑے ہوئے تھے کیا دنیا نے کبھی بھی کسی انسان سے اتنا والہانہ پیار کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں — تو پھر یہ ماننا ہی پڑے گا کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے محمد عربیؐ نے اپنی آخری رسالت کا جو دعویٰ کیا تھا وہ ایک زبردست حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا ایک

علیم النظیر واقعہ بھی تھا، ایسا واقعہ جو ان گنت صدیوں اور قرنوں پر پھیلی ہوئی اس دنیا میں صرف ایک ہی بار پیش آنا تھا ـــــ صرف ایک بار!ـــــ

دنیائے کفر ـــــ دنیائے شرک اور دنیائے دہریت کے سامنے یہ تاریخی للکار بلند کرتے ہی ایک دوسرا سوال فوراً ہی پیدا ہوتا ہے ـــــ آج سے چودہ سو سال پرانے انسان نے حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں حسن حق و صداقت کو چشم سر سے دیکھا تھا اس کو آج کا انسان کہاں اور کس طرح دیکھے؟ ـــــ تاریخ ایک واقعہ کی یاد دلا سکتی ہے ـــــ ایک احساس ـــــ ایک تصور ہی دے سکتی ہے، مشاہدہ نہیں!" ـــــ

دنیا کو ماضی کے اس تصور کا مشاہدہ کرانے والے ہم تھے ـــــ ہم، کہ خود کو مسلمان کہتے ہیں! لیکن یہ آئینہ آئینہ ہوتے ہوئے بھی شقاوتِ قلب، بےحسی اور آخرت فراموشی کی زنگ آلود تہوں میں دبا پڑا ہے جس میں ہمیں خود اپنی بگڑی ہوئی شکل بھی نظر نہیں آتی! کیا دنیا اس آئینہ میں رسالتِ محمدیؐ پر کسی زندہ گواہی کو آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے؟ کیا ہم مسلمان ہیں؟ ـ

سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

عکاظ کے تاریخی بازار میں "انسانیت" نیلام ہو رہی تھی!

انسان ہی سوداگر تھے ـ انسان ہی خریدار تھے ـ اور انسان ہی کا سودا ہو رہا تھا ـــــ ایک معصوم و بے گناہ ننھے سے انسانی جسم کا سودا، جس کا نام زید تھا ـ

زید یمن کے ایک شاندار قبیلے بنی قضاعہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے باپ حارثہ اور ان کی ماں سُعدیٰ کے پیار نے ان کو دنیا کے سرد و گرم کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ زید نے انسان کی بے لوث چاہت ہی دیکھی تھی جانوروں کی سی خوں آشامی نہیں ــــ وہ محبت ہی سے واقف تھے۔ نفرت کے معنی انھیں معلوم نہ تھے۔

لیکن حالات نے ہولناک پلٹا کھایا۔ اور انسانیت کی خود غرضی و نفرت کا تاریک پہلو پوری ہولناکیوں کے ساتھ ان کے سامنے آگیا۔

بنی قین کے خونخوار ڈاکوؤں نے بنی قضاعہ کے اوپر تاخت کی اور لوٹ کے بے جان ساز و سامان کے ساتھ جاندار بچے کو بھی ماں کے سینے اور باپ کے شفیق سائے سے دور گھسیٹ لائے۔ بچہ گوشت پوست کے مرکز سے کٹتا ہوا بچہ شدتِ درد سے بلبلا اُٹھا۔ اس کا ننھا سا دل شق ہونے لگا۔ کلیجہ پھٹنے لگا لیکن پہلی بار اس نے دیکھا کہ دردناک پکار کا جواب بے رحمانہ ٹھوکر سے دیا جا رہا ہے۔ ان کی فریاد سن کر ڈاکو ان کی طرف دوڑے اور ایک بھرپور تھپڑ سے کومل رخساروں کو تمتما دیا۔ نفرت کی یہ چوٹ کھا کر معصوم آواز سہم گئی۔ گناہوں کی خشونت سے مسخ بشروں، دلوں کی سیاہی سے لتھڑے ہوئے چہروں، آتشیں آنکھوں اور پتھریلے دلوں کے زمرے میں زید کو "انسان" کا پہلا تجربہ ہو رہا تھا۔ کیسا تند و تیز! ــــ کڑا ــــ زہریلا اور اُبکا دینے والا تجربہ!۔

پھر عکاظ کے بازار میں انسانوں کی دوسری ٹولی دکھائی دی۔ ان سب کی شکل آدمیوں کی سی تھی مگر یہ لوگ آدمیوں اور اس کے درد کو نہ پہچانتے تھے۔ ان کی ان گنت آنکھیں زید ہی کو گھور رہی تھیں۔ زید کے گوشت پوست، تن و توش اعضا

کی ساخت اور طاقت و توانائی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا اور ناپا جا رہا تھا تاکہ جسم میں انسانی غلامی کا بوجھ ڈھونے کی جیسی صلاحیت پائیں ویسے ہی دام لگائیں۔ لیکن کیسی تھیں یہ آنکھیں جو زید کے پورے وجود میں گھسی جاتی تھیں مگر ان کا خونچکاں مجروح سینہ ان کو کسی طرح دکھائی نہ دیتا تھا۔ ڈاکوؤں کی بولی پر سب ہی گوش بر آواز تھے لیکن مظلوم بچے کی خاموش فریاد کسی نے نہ سنی!۔

"تم کون لوگ ہو آخر؟"

زید کی روح اجنبیت و وحشت کے بوجھ تلے ہانپتی ہوئی چیخ اٹھی "تم کون ہو! — تم آنکھوں والے ہو کر بھی میرے لئے اندھے ہو — کانوں کے باوجود میری تڑپ کے لئے بہرے ہو — تم سب میرے باپ کی ہمشکل ہو لیکن تمہیں ایک لٹے ہوئے کمزور بچے پر ذرا پیار نہیں آتا۔ تم ڈاکوؤں کے ساتھی ہو — تم ظالموں کے ساتھی ہو لیکن مظلوم پر تمہیں ترس کیوں نہیں آتا۔ — تمہیں ظالموں سے نفرت کیوں نہیں ہوتی؟"

مگر روح کی یہ درد بھری پکار کون سنتا! جن کانوں میں خدا کی آواز نہ آئی ہو وہ انسان کی آواز کہاں سن سکتے ہیں لٹیروں کے بعد آدمی کے خریدار کی بھیڑ میں "انسان" کے متعلق یہ زید کا دوسرا تجربہ تھا ویسا ہی ہمت شکن اور امید سوز جیسا پہلا! — نہیں بلکہ پوری انسانیت سے مایوس کر دینے والا یاس آفریں تجربہ!!۔

آخر نیلام کی آخری بولی حکیم بن حزام نامی خریدار پر ختم ہوئی اور انسان فروشی کا یہ صبر آزما مرحلہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ حکیم بن حزام زید کو لئے ہوئے مکے کی

شریف ترین۔ متمول خاتون اپنی پھوپی حضرت خدیجہ کے گھر پہنچے اور غلام کو ان کے حوالے کر دیا۔ اس طرح تقدیر الہٰی نے زید کو اس حسین راہ پر لگا دیا جہاں سے اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس پناہ میں پہنچنا تھا۔

حضرت خدیجہ کے سائے میں آکر زید نے اطمینان کا پہلا سانس لیا۔ لیکن ماضی کی دکھ بھری یاد نے یہاں بھی ان کی روح کو چین نہ لینے دیا۔ حضرت خدیجہ کی نظری شرافت نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا تھا کہ ان کے "درد" کو پہچان لیا تھا مگر اس درد کے درماں کی کھوج ابھی تک باقی تھی۔ نفرت و گناہ کی ٹھوکروں میں گھائل ہونے کے بعد اب شرافت و اخلاق کی اس نئی دنیا میں زید کی روح کو آرام تو مل گیا تھا مگر سکون نہیں۔ گمشدہ ماں باپ کا خلا کسی طرح پُر نہ ہوتا تھا۔ اندر ہی اندر سلگتی ہوئی روح ایک ایسے مرہم کے لئے تڑپ رہی تھی جو دل وجگر کے زخموں کو مندمل کر سکے۔

خود حضرت خدیجہ کا یہ حال تھا کہ وہ بیوگی کے دن گزار رہی تھیں۔ لیکن نکاح کے بڑے سے بڑے پیغام کو بھی قبول نہ کرتی تھیں مالداران سے شادی کے متمنی تھے۔ قبیلوں کے سردار ان کو اپنی شریک زندگی بنانے کا خواب دیکھتے تھے مگر خدیجہ کو نہ اس سرداری سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ دولت کی جھنکار میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ تو جوہر انسانیت کی جویا تھیں۔ وہ ایک ایسے عظیم انسان کی منتظر تھیں جو دولتِ دل کا بادشاہ اور اخلاق وانسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلوں کا سربراہ ثابت ہو سکے۔ اس طرح مالکہ اور غلام — خدیجہ اور زید دونوں ہی "انسانیت" کو ڈھونڈ رہے تھے۔

آخر یہ "انسان" محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ وہی خاتون مکہ جو بڑے بڑے لکھ پتی سرداروں کو خاطر میں نہ لاتی تھیں انسانیت کے اس جوہر لطیف کے آگے خود ہی جھک گئیں اور خود ہی ہمہ تن سوال بن کر آگے بڑھیں۔ حضورؐ سے شادی کے بعد خدیجہؓ اب اس گھر میں داخل ہوئیں جسکو بہت جلد حرم نبویؐ کے روحانی قصر میں تبدیل ہو جانا تھا ان کے ساتھ زید بھی اس انسان کامل کی غلامی میں پہنچے جس کی غلامی کے سامنے ہفت اقلیم کی کجلاہی ہیچ ہو جانے والی تھی۔

حضورؐ کی قربت میں آتے ہی زید بن حارثہ کی غمناک روح جیسے غشی سے چونک اٹھی تھا۔

انھیں محسوس ہوا کہ وہ بالکل نئی ـــــ بالکل مختلف ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیئے گئے ہیں جہاں صرف ایک ہی "انسان" بستا ہے جسکو مکہ والے فرط عقیدت میں اس کا نام لینے کے بجائے کبھی "امین" کبھی "صادق" کہکر پکارتے ہیں۔ــ "کیسا عجیب وغریب ہے یہ انسان!" زید نے سوچنا شروع کیا "جو اپنے خدمتگار کی خدمت کے لئے بے چین رہتا ہے ا۔ جو کمزوروں پر خدائی کرنے کے بجائے ان کو خدائے حقیقی کی قیمتی امانت سمجھتا ہے۔ جب نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی محبت اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی ہے۔ جب بولتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی دل وجگر پر معطر شبنم ٹپکا رہا ہو جب مسکراتا ہے تو دل ہر غم کو بھول جاتا ہے اور زندگی ایک نامعلوم لذت سے سرشار ہو کر جھوم اٹھتی ہے ـــ جو اس طرح بات سنتا ہے

جیسے دل کی دھڑکنیں شمار کر رہا ہو! اس کے سینے میں میرے باپ کا درد بھرا دل بھی ہے اور میری ماں کی ممتا بھی! نہیں! وہ تو اس سے بھی زیادہ کوئی شے ہے! اس کو دیکھکر تو دل پکار اُٹھتا ہے "میرے والدین نثار ہوں تجھ پر"

یہی وہ انقلاب کا نیا موڑ تھا جہاں زید نے محسوس کیا کہ کوئی چپکے چپکے ان کا دل خرید رہا ہے! ان کو عکاظ کے بازار میں اپنے جسم کے خریدار یاد آئے اور خوف و دہشت سے جھرجھری آگئی —— انھوں نے اپنے روح و دل کے خریدار —— نئے آقا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو ان کے بندۂ بے دام ہو جانے کا احساس سپردگی اور کیف کا نشہ بن کر ان کے پورے وجود پر چھا گیا —— دونوں نیلام کتنے مختلف تھے۔ اب تک انھوں نے جن انسانوں کو دیکھا اور برتا تھا یہ نیا انسان ان سے کس قدر الگ - کتنا اونچا اور کیسا دل کش تھا۔

آخر اس انسانی جاذبیت کا راز سربستہ حل ہونے کا وقت آگیا۔

غارِ حرا کی تنہائی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خدا کے فرشتے جبرئیلؑ نے ملاقات کی اور خیر و شر کے آخری فیصلہ کن معرکے کی ذمہ داریاں آپ کے شانوں پر آگئیں —— ایمان کی روشنی میں زیدؓ نے پہلی بار اس عرفانِ حقیقت کے ساتھ دیکھا کہ محمدؐ عربی کی شخصیت میں ماں باپ کے خالق خدا کا لافانی پیار عکس فگن تھا، دل کی نامعلوم کشش عرفانِ حق کے وجد انگیز سرور میں ڈھل گئی۔ سپردگی نے یقین و جاں نثاری کا روپ دھار لیا اور زید پروانہ وار شمع رسالت کا طواف کرنے لگے۔

دور —— یمن کی فضاؤں میں زیدؓ کے والدین اپنے گمشدہ لال کے لئے سالہا سال سے تڑپ رہے تھے کہ یکایک مکے سے آنے والے ایک یمنی نے

ان کو یہ خوشخبری سنائی کہ تمہارا زیدؓ محمدؐ عربی کے پاس زندہ و سلامت موجود ہے۔ یہ خبر سنکر ماں باپ خوشی کی شدت سے رو پڑے اور فوراً ہی حارثہ اپنے بھائی کعب کو لئے ہوئے حضورؐ سے زید کی بھیک حاصل کرنے کے لئے کشاں کشاں مکے میں داخل ہوئے۔

"لوگو! ہم محمدؐ سے ملنا چاہتے ہیں" انھوں نے بیتابانہ سوال کیا۔

"محمدؐ اس وقت مسجد میں ہیں" جواب ملا۔ حارثہ اور کعب مسجد میں پہنچے اور خدا کے رسول سے التجا کی:۔

"اے عبداللہ کے بیٹے! ـــــ اے عبدالمطلب کے پوتے!! اے اپنی قوم کے سردار کے بیٹے!!! آپؐ حرم کے رہنے والے اور اس کے پڑوسی ہیں آپؐ بیکسوں کی مدد کرتے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم آپؐ کے پاس اسلئے آئے ہیں کہ آپؐ ہمارے بیٹے کو آزاد کر کے احسان کیجئے۔ اگر آپ کوئی معاوضہ چاہیں تو بڑی سے بڑی رقم پیش کی جائے۔"

یہ کس کی "رہائی" اور "آزادی" کی التجا ہو رہی ہے؟ ـــ کیا اسی زیدؓ کی جسکو نبیؐ آخرالزماں کی غلامی کی برکت سے غیر اللہ کی ہر غلامی سے نجات مل چکی تھی! جس زیدؓ کو رسولؐ خدا نے بے لوث خلوص اور آخری سچائیوں کے ذریعہ خرید لیا تھا کیا یہ لوگ اسی کو سونے اور چاندی کے مادی ٹھیکروں سے خرید لینے کی نادان حسرت میں مبتلا تھے ـــ ہاں ـــ واقعہ اسی طرح پیش آرہا تھا۔ اس لئے اللہ کے رسولؐ نے سوال کیا کہ وہ کس غلام کی رہائی چاہتے ہیں؟۔

"تمہارا بیٹا کون ہے"؟ آپؐ نے دریافت فرمایا۔

دلی تڑپ اور بیتاب التجاؤں سے لبریز جواب ملا..... "زید......."

نو واردوں کو اندیشہ تھا کہ دیکھئے اس بار کیا جواب ملے؟........ دو اجنبی انسانوں کی پکار پر ایک غلام کی بھیک ملنا کوئی معمولی بات تو ہو نہیں سکتی پھر یہاں تو ایک اس سے بھی زیادہ نازک سوال تھا۔ کیا ایک مومن زیدؓ کو ایمان سے محروم حارثہ کے حوالے کیا جانا اسلام کے مفاد میں ہو گا؟ لیکن وہ ذات گرامیؐ جو اپنے پرائے کا غم کھانا خوب جانتی تھی۔ نو وارد وں کے خوف و اندیشے اور درد و کرب سے بیتاب ہو چکی تھی۔ آپؐ نے کمال درد کے ساتھ سوال کیا۔

"کیا کوئی اور بھی کام ایسا ہے جو ہم تمہارے لئے انجام دے سکیں؟"۔

یہ سوال گواہ ہے کہ مانگنے والوں نے جس شدتِ درد سے مانگا تھا دینے والا اس سے کہیں شدید درد کے ساتھ اور سوال سے کہیں زیادہ دینے کے لئے بیتاب ہو چکا تھا۔

"نہیں!—— اے عظیم محسن!—— اور کچھ نہیں!!" ممنونیت کی گڑگڑاتی ہوئی آواز میں حارثہ نے جواب دیا "ہم سے پوچھئے کہ آپ کا یہی احسان ہمارے لئے کیا کچھ ہو گا!"

ایک ساعت کے لئے حضورؐ نے کچھ سوچا، ایک طرف زید کے ساتھ آپ کی وہ دلی محبت تھی جس نے زید کو محبوب رسولؐ بنا چھوڑا تھا دوسری طرف ایک باپ کی مجبورانہ فغاں تھی۔ جو اسی قیمتی شے کے لئے مچل اٹھی تھی۔ اپنے درد پر آپؐ نے پرائے درد کو ترجیح دی اور ایک دل گرفتہ آواز میں ارشاد ہوا:—

"اچھا—— زیدؓ کو بلایا جائے وہ میری طرف سے آزاد ہے۔ تم اپنے

بیٹے کو لیجا سکتے ہو بشرطیکہ وہ خوشی سے جانا چاہے۔"

"بشرطیکہ وہ خوشی سے جانا چاہے" کے فقرے نے حارثہ اور کعب کو...... چونکا دیا۔ بھلا یہ کیسے سوچا بھی جا سکتا ہے کہ باپ اور ماں سے بچھڑا ہوا ایک "بیٹا" اپنے پیارے ماں باپ کو سالہا سال کے بعد پا کر دوبارہ اپنی خوشی سے کھو دینے کے لئے تیار ہو جائے؟ ——— لیکن "تم اپنے بیٹے کو لیجا سکتے ہو" کا فیاضانہ اعلان اس قدر نشاط انگیز تھا کہ حارث و کعب کو خوشی کے عالم میں پہلی بات پر حیران ہونے کی بھی فرصت نہ ملی۔

اس کیفیت میں زیدؓ بن حارثہ حاضر ہوئے۔

وہ اس وقت ایک نازک ترین جذباتی دوراہے پر کھڑے تھے ایک طرف وہ انسان تھا جس کے خون سے وہ پیدا ہوئے تھے۔ جو ایک چاہنے والے "باپ" کے بیتاب بازو پھیلائے ہوئے اس بات کا منتظر تھا کہ اس کا "بیٹا" اس کے سینے سے پیوست ہو کر خوشی کی شدت سے روئے اور رُلادے۔ دوسری طرف وہ انسانؐ تھا جو خاندانی اور نسلی اعتبار سے زید کا کوئی نہیں تھا۔ ——— لیکن "باپ" کی ترسی ہوئی بیٹے کی نگاہیں اس بار بھی سب سے پہلے اسی انسان کی طرف اٹھیں جسکو وہ اپنے خدا کا رسولؐ مان چکا تھا۔ خاموش نگاہوں نے اس طرح ادب و احترام کے ساتھ فرمانبرداری کا اعلان کیا اور ادب و عقیدت کے ساتھ نظریں فرش خاک پر جھک گئیں ——— یہ ادائے سپردگی قلب رسالتؐ نے کتنی شدت سے محسوس کی؟ کوئی نہیں جانتا ——— کوئی نہیں جان سکتا۔ انتھاہ جذبات کی آواز زبان وحی ترجمان سے سنائی دی تو باپ اور بیٹے کے ملاپ

کی عظیم انسانی خوشی کے ساتھ جس میں ایک متاعِ عزیز کے بچھڑ جانے کی کسک بھی شامل تھی۔

"زید! ــــ تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟ ــــ ہمیشہ خلیق مسکراہٹ کے ساتھ مسکرانے والے مگر کبھی نہ قہقہہ لگانے والے انسانِ کامل نے سوال کیا۔

"جی ہاں" ــــ زیدؓ بولے "خوب اچھی طرح پہچان رہا ہوں...... یہ میرے باپ ہیں اور وہ میرے چچا کعب"

خدا کے بندے اور رسولؐ کے چاہنے والے نے صرف اتنا ہی کہا اور کچھ نہیں ــــ اس کے بعد زبان خاموش ہو گئی...... سر جھک گیا اور نگاہیں ان مقدس قدموں پر جم گئیں جو خدا کے سامنے عبادت کی حالت میں کھڑے بار ہا سوج جاتے تھے۔ زیدؓ ــــ روح کے بندھنوں اور ایمان و یقین میں جکڑے ہوئے زیدؓ کو ابھی اتنی فرصت کہاں تھی کہ گوشت پوست کے رشتوں کو نظر بھر کر دیکھ سکے۔ حارثہ نے یہ صورت دیکھی اور حیرت سے گنگ ہو گئے۔ کعب نے یہ منظر دیکھا اور کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ خدا کے رسولؐ کی جاں نواز آواز نے ان کو اس کیفیت سے چونکا دیا ــــ آپؐ زید سے فرما رہے تھے :۔

"میں کون ہوں؟ ــــ تم خوب جانتے ہو اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ تمہارے ساتھ میرا سلوک کیا رہا ہے۔ اب ــ تمہارے لئے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ چاہو تو میرے ساتھ رہو اور چاہو تو اپنے باپ کے ساتھ اپنے عزیزوں کی طرف لوٹ جاؤ۔"

پھر ایک بار خاموشی چھا گئی! ــــ حارثہ پر امید و بیم کی آخری کیفیت طاری

تھی۔ کعب زید کو تک رہے تھے رسولِ خدا متانت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ اور زیدؓ — زید نہ جانے اس وقت کہاں تھے! خود فراموشی اور محویت میں ڈوبے ہوئے وہ سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ بہت جلد یہ سر اٹھا — لوگوں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں مسکراہٹ نہیں آنسو تھے۔ ایک بے پناہ چاہ اور بیقرار سپردگی تھی۔ خون اور ایمان — جسم اور جان کی اس جذباتی جنگ میں ایمان ہی فاتح رہا۔ اور روح کی کانپتی ہوئی آواز نے زیدؓ کے اس فیصلہ کا اعلان کیا جس کا گمان بھی انسانی نفسیات اس فضا میں نہ کر سکتی تھی: "اے خدا کے رسول میں وہ نہیں جو آپؐ کے مقابلہ میں دوسرے کو پسند کر سکے!۔ میرے لئے تو آپؐ ماں باپ سے بھی بڑھ کر ہیں"

حضورؐ اس آواز کو سنکر مسکرائے۔ حارثہ اور کعب نے یہ فیصلہ سنا اور حیرت سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ یہ کیا سُن رہے ہیں؟ — کیا دیکھ رہے ہیں؟ — وہ کونسا تعلق تھا جس نے باپ اور بیٹے کے تعلق کو شکستِ فاش دیدی تھی؟۔

"زید! — کیا تم ہوش میں ہو؟" حارثہ چیخے، حیف ہے تم پر! — تم غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے ہو۔ باپ کے مقابلہ میں اجنبی انسان کو پسند کرتے ہو!۔ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟"۔

پہلی بار زید نے باپ کو نظر بھر کر دیکھا ان کی آنکھوں سے کسی بلند ترین حقیقت کا نور جھلک رہا تھا۔ روح تڑپ کر سامنے آگئی تھی اور جسم چھپ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بالکل مختلف "زید" ہیں۔ حارثہ کے خون سے نہیں ایمان کے

نور سے ڈھالے ہوئے۔

"ہاں ___ میں ہوش و حواس کے ساتھ یہ فیصلہ کر رہا ہوں" عرفان و سنجیدگی میں ڈوبی ہوئی آواز میں زید نے جواب دیا" میں نے اس ذاتِ گرامی میں ایسی خوبیاں دیکھی ہیں جو کسی بھی دوسرے میں نہیں ہیں۔ آپ لوگ مجھے بھول جائیے۔ میں اب کسی کا نہیں، صرف خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوں"

یہ الفاظ زمین اور آسمان کے درمیان گونج اُٹھے۔ حضورؐ بیتابانہ اور زید کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے مقام حجر کے پاس آکر پکار اٹھے۔

" لوگو! ___ گواہ رہنا ___ زیدؓ آج سے میرا بیٹا ہے"

کیسا بکھرا تھا یہ تعلق یہ باہمی تعلق جو ایمان اور صداقت کی بنیاد پر دو انسانوں میں قائم ہوا تھا!۔

زید بہر حال ایک زر خرید غلام کی حیثیت سے حضورؐ کی زندگی میں داخل ہوئے تھے۔ چپٹی ناک، گندمی رنگ اور پست قد کے اس "غلام" کو بھولے سے بھی یہ گمان نہ ہوا ہوگا کہ مکہ کی انسانیت سوز اور انسانیت فروش آبادی میں کوئی انسان اسکو سینے سے لگالیگا ___ ان کی آواز سنتے ہی بے اختیار گھر سے نکل آیا کریگا اور ان کی پیشانی کو، غلامی سے داغدار پیشانی کو اپنے پاک ہونٹوں سے چوم لیا کریگا اور اس طرح ان کو یقین دلادیگا کہ "غلام" اور "آقا" دونوں خدا کے غلام اور بندے ہیں ___

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی زید باہر سے آتے اور دروازے

حضورؐ کو پکارتے تو آپؐ خواہ کسی حال میں ہوں فوراً اس پکار پر دوڑتے تھے اور زیدؓ کی پیشانی کو فرطِ شفقت سے بوسے دیکران کی عافیت معلوم فرماتے تھے۔ ایک "غلام" میں جوہر انسانیت کی آب و تاب دیکھکر حضورؐ نے جس ذرہ نوازی خلد افزائی اور دردمندی کا مظاہرہ فرمایا تھا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ زیدؓ حضورؐ پر دل وجان سے نثار ہو گئے تھے۔

ایک طرف زیدؓ تھے جنھوں نے توحید و رسالت کی گرویدگی پر گھربار، ماں باپ اور وطن کی پوری دنیا قربان کردی تھی، تو دوسری طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جنھوں نے ایک زر خرید "غلام" کو اپنی حقیقی پھوپی زاد بہن حضرت زینبؓ سے بیاہ کر عرب کی نسل پرستی کے بت پاش پاش کردیئے تھے ایک طرف زیدؓ تھے جو طائف کی نازک گھاٹی میں اس وقت حضورؐ کے آگے سینہ سپر تھے جب کفر کی بے رحم طاقتیں حق و صداقت کے نور پر بدترین پتھراؤ کررہی تھیں تو دوسری طرف حضورؐ تھے جنھوں نے جس فوجی مہم پر زیدؓ کو روانہ کیا اس کو سپہ سالاری کا تاج زرنگار اپنے اسی غلام کے سر پر رکھا۔ آخری معرکہ غزوۂ موتہ میں بھی جہاں حضرت زیدؓ خدا کی راہ میں شہید ہوئے۔ تین ہزار جاں بازوں کی کمان ان کے ہاتھوں میں دی جارہی تھی تو حضرت جعفرؓ نے حضورؐ سے کہا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ اس دستے میں مجھے دیکھکر اس کی باگ ڈور آپ مجھے دیں گے زیدؓ کو نہیں ......"

"چپ رہو!" زید کی عظمت کو شک سے دیکھنے والے کو خدا کے رسولؐ نے تنبیہ کی تھی۔ "تم نہیں جانتے کہ خدا کے نزدیک کون زیادہ بہتر ہے۔"

پھر جب یہ "بہتر بندۂ خدا" شہید ہو گیا اور اس کی شہادت کی خبر حضورؐ تک پہنچی تو آپؐ بے اختیار اشکبار ہو گئے اور گلوگیر آواز میں یہ دعا آپؐ کے ہونٹوں پر جاری تھی: "اے خدا زید کو بخش دے!...... اے خدا زید کو بخش دے!!"

عشق رسولؐ کے سوز بیکراں نے زیدؓ کو کن بلندیوں پر پہنچا دیا تھا؟ انھوں نے حضورؐ کو اس طرح چاہا کہ خود حضورؐ آپ کو ایک محبوب سے ایک لختِ جگر۔ ایک بیٹے کی طرح چاہنے لگے؟ اور پھر دنیا کو یہ فرق کرنا مشکل ہو گیا کہ کون چاہنے والا ہے اور کس کو چاہا جا رہا ہے! محبت اور محبت نوازی کی یہ تاریخ ایک ایسی بے مثال تاریخ ہے جو توحید و رسالت کے سوا دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے

یہ تاریخ حضورؐ اور زیدؓ کی وفات کے بعد بھی حضورؐ کے ان چاہنے والے صحابہ نے پوری شان سے زندہ رکھی جو نہ صرف یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے "دیوانے" تھے بلکہ ہر اس انسان اور ہر اس شے کو بھی دل و جان سے پیار کرتے تھے جس پر حضورؐ کی محبت بھری نگاہ پڑ گئی ہو ۔۔۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس وقت معرکۂ شام کو جانے والی فوج کا سپہ سالار حضرت زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو بنانے کا اعلان کیا تو دنیا حیرت سے گنگ ہو گئی اب ۔۔۔ بڑے بڑے ہوشمندوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کمسن لڑکے کو یہ نازک ذمہ داریاں کیوں سونپی جا رہی ہیں۔ خلیفۂ وقت نے جب لوگوں کے اعتراض کا جواب دیا تو معلوم ہوا کہ عشقِ رسولؐ کا جذبۂ بیکراں اس فیصلہ کے پس منظر میں کام کر رہا تھا۔ ابوبکر صدیقؓ کی نظر میں اسامہؓ کی عظمت کے لئے یہ بات کافی تھی کہ اللہ کے پیارے رسولؐ نے ان کو محبت کی خاص نظر سے

دیکھا تھا۔ اور یہ کہ اسامہؓ اس انسان کے بیٹے تھے جس نے عشقِ رسولؐ کے آگے
حیاتِ دنیا کے حسین ترین تعلقات پر ٹھوکر مار دی تھی۔" جسکو رسول اللہؐ نے سردار
بنایا ہو، خلیفۂ وقت نے شدتِ جذبات میں اعلان کیا "تم مجھ سے یہ چاہتے ہو
کہ میں اس کی سرداری چھین لوں!"— رسالت کی انتہاء محبت سے دھڑکتے ہوئے
سینے اس نعرۂ شوق پر تیزی سے دھڑکنے لگے اور عشقِ رسولؐ کے مشترک جذبہ
نے اسامہؓ کی سرداری کا فیصلہ دل و جان سے تسلیم کر لیا۔

پھر جب اسامہؓ گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کے لئے روانہ ہوئے تو اقتدار
اور گھمنڈ کی ماری دنیا کی آنکھیں عشقِ رسولؐ کا ایک ایسا جذبہ دیکھ رہی تھیں جسکو
دیکھ کر رقت طاری ہو جائے۔ اسامہؓ کو رخصت کرنے کے لئے خلیفۂ وقت
ایک "غلام" کی طرح پیادہ پا چلا آ رہا تھا!— ایک "غلام" کا بیٹا سرداری کی شان
سے گھوڑے پر سوار تھا اور ایک مردِ آزاد— محمد عربیؐ کے بعد سب سے
بڑا مسلمان اس کو خراجِ عقیدت دینے کے لئے اپنے کپڑوں اور قدموں کو غبار
آلود کر رہا تھا— یہ منظر دیکھکر حضرت اسامہؓ کانپ گئے اور کہا:-

"اے رسولِ خداؐ کے جانشین! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ یا تو آپ سوار ہو جائیں
ورنہ اسامہ بھی فرشِ خاک پر اُتر آئے گا۔"

لیکن خلیفۂ وقت کو عشقِ رسولؐ کی محویت میں سرافرازی و سرافگندگی کے
مسائل پر غور کرنے کی فرصت کہاں تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اس وقت ماضی کی
وہ یادیں جلوہ فرما تھیں جب حضورؐ زندہ تھے۔ جب انھوں نے کبھی یہ دیکھا تھا کہ
حضورؐ کے ایک زانو پر حضرت حسنؓ ہیں اور دوسرے پر اسامہؓ بیٹھے ہیں—

لیتا اور آنحضرتؐ ان کو اسی طرح لوری دے رہے ہیں "اے خدا! میں ان سے پیار کرتا ہوں آپ بھی انھیں اپنی محبت کے سائے میں رکھئے گا ــــ

کبھی چھوٹے سے اسامہؓ اس حالت میں حضورؐ کے سامنے آتے ہیں کہ ان کی ناک بہہ رہی ہے تو خدا کا رسولؐ بہ نفس نفیس ان کی ناک صاف کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ حضرت عائشہؓ یہ صورت حال دیکھکر تڑپ جاتی ہیں ــــ "اے خدا کے رسولؐ! میرے ہوتے ہوئے آپؐ یہ تکلیف نہ فرمائیں ..." لیکن رسولِ خدا بلیٹ کردلی چراہت اور دلسوزی کے ساتھ جواب دیتے ہیں:۔ "اے عائشہؓ! میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ تم بھی ان سے محبت رکھو"

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اس محویت کو جب اسامہؓ کے اصرار نے توڑا تو آپ نے جواب دیا:۔

" نہیں اچھے اسامہؓ! ــــ تم اسی طرح بیٹھے رہو گے! میں اسی طرح اپنے قدموں کو غبار آلود کرنا چاہتا ہوں ــــ اے اسامہؓ! ــــ یہ تو خدا کی راہ کا گرد و غبار ہے ــــ یہ عشق رسولؐ کی گرد راہ ہے ــــ اس میں کیا حرج ہے اگر یہ گرد و غبار مجھے لت پت کر دے! ــــ اے اسامہؓ کیا یہ وہی حسین راہ نہیں جس پر ایک قدم اٹھانے کا انعام سات سو نیکیاں ہیں۔ مجھے اس راہ کی گرد سے اٹا ہوا دیکھکر تمھیں غمگین نہیں خوش ہونا چاہیے"

ہمیں دنیا نہیں "محمدؐ" چاہیے!

حجاز کا پایۂ تخت مکہ اسلامی اقتدار کے آگے جھک چکا تھا۔ سچائی اور طاقت

کو قدم ملائے ہوئے دیکھ کر وہ لوگ بھی ایمان لا رہے تھے جو کبھی تنہا سچائی کو اس کے سادہ لباس میں نہ پہچان سکے تھے سچائی جو کبھی ایک انسان کی آواز تھی اب ہزاروں آوازوں کی شاندار گرج میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جس آواز سے پورا ماحول گونج اٹھا تھا اب اس کی چوٹ تنگ و تاریک سینوں اور زنگ خوردہ دلوں تک جا پہنچی تھی۔

لیکن ابھی تک مکّے کے چند ہمسایہ علاقوں پر وہی اندھیارا چھایا ہوا تھا۔ وہاں وہی طاقت کا جنون اور انتقام کا بھوت سوار تھا۔ وہ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ دلوں کے بجائے تلواروں سے کرنا چاہتے تھے۔ وہاں کا انسان اب تک یہ بدترین احمقانہ خواب دیکھ رہا تھا کہ مسلح آدمی خدا سے لڑ سکتا ہے!۔

اس آخری بغاوت کی کوشش میں ہوازن اور ثقیف قبائل آگے آگے تھے۔ ان لوگوں نے مکّہ کا سقوط دیکھ کر جلدی جلدی آس پاس کے قبیلوں میں نفرت و انتقام کی آگ بھڑکانی شروع کی۔ ترکش پر ترکش بھرے گئے۔ تلواروں پر تلواریں سونتی گئیں۔ اور حُنین کے میدان کارزار میں شیطان کی آخری طاقت نے اللہ کی فوج کو للکارا۔

اگرچہ اسلامی صفوں میں بارہ ہزار نفوس تھے لیکن ان میں ایک بہت بڑی تعداد مکّے کے ان نئے نئے مسلمانوں کی تھی جنھوں نے سچائی کو اس کی بے سروسامانیوں کے زمانے میں نفرت سے ٹھکرا دیا اور عروج و سطوت کے دور میں سینے سے لگایا تھا کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں تک جم سکیں گے جب موت کا بھیانک خطرہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سوال کریگا کہ "کیا تم مسلمان ہو؟"

ادھر ہوازن کا قبیلہ تیر اندازی کی ہولناک مشق میں یگانۂ روزگار تھا

تیر اندازی کا یہ کمال اپنے آخری جوہر دکھانے کے لئے نکلا تو ایک ساتھ ہزاروں کمانیں دوہری ہو گئیں اور تیر — زہریلے نوکیلے تیر ایک زبردست باڑھ کی شکل میں پوری فضا میں سنسنا گئے۔ تیروں کی اس اندھادھند بوچھار میں پہلے ہی قدم پر ایسی بدحواسی چھائی کہ مجاہدوں کا لشکر پلٹ گیا اور لشکر کا بہت بڑا حصہ اس طوفان کے تھپیڑے کھاتا ہوا پیچھے کی طرف بہہ نکلا۔

لیکن ٹھیک اس وقت جب زمین و آسمان میں موت کی باڑھ سے کہیں پناہ نظر نہ آتی تھی — جب تیروں کی گھٹاٹوپ بوچھار میں ہزاروں شیر نر بے اختیار منھ پھیر بیٹھے تھے۔ جب مرگ و ہلاکت کے آدم خور عفریت اپنے جبڑے کھولے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ محمدؐ عربی کے قدم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے آپ نے ایک طرف اس خوفناک طوفان کو پھیلتا بڑھتا اور دوسری طرف اپنے دست و بازو مجاہدوں کو بدحواس ہو کر پیچھے ہٹتا ہوا دیکھا — مگر خدا کا پیغمبرؐ پھر بھی اپنی جگہ چٹان کی طرح سینہ سپر تھا۔ آپ کے چہرے سے خوف نہیں، دکھ نہیں، حیرت نہیں ایک زبردست جلال ٹپک رہا تھا — جیسے آپ کو دکھ نہ تھا کہ محمدؐ کو جان سے زیادہ پیار کرنے والے آج محمدؐ کو اکیلا چھوڑ کر پسپا کیوں ہو گئے! جیسے آپ کو حیرت نہ تھی کہ شہادت حق کی بہترین آرزو میں سربکف مجاہدوں کو یہ کیا ہو اہے؟ نہیں! — اس وقت آپ کے دل میں اس جذبۂ یقین کے سوا کوئی شے موجود نہ تھی کہ آپؐ خدا کے بالکل سچے رسول ہیں۔ رسالت کا یہی یقین اس وقت لمحہ بہ لمحہ ایک جلال کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یہ جلال ایک بہترین حسن تھا۔ یہ حسن ایک ناقابل شکست طاقت تھی! یہ طاقت ایک ایسے یقین و ایمان —

ایسے صبر و سکون۔ ایسے توکل اور طمانیت کا سرچشمہ تھی جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔

پسپائی خواہ کسی وجہ سے ہو۔ نوآموز مجاہدوں کی ناتجربہ کاری یہ رنگ لائی ہو یا خوف کی جبلّت نے بے ساختہ سر اٹھایا ہو۔ سوال یہ تھا کہ کیا طوفان کے ریلے میں بہہ جانے والے رسالت کے اس جلالِ یقین کے سہارے ایک بار پھر طوفان میں قدم جما سکیں گے؟۔ کیا ایک بار پھر محمدؐ کے جاں نثار محمدِ عربی۔ رسولِ عربی پر پروانہ وار قربان ہونے کے لئے پلٹ پڑیں گے؟۔ کیا ایک بار پھر اُحُد کا وہ منظر تاریخ دیکھ سکے گی جہاں رسالت کے اس حسین ترین وجود کو بچانے کے لئے محمدؐ کے دیوانوں" نے گرتی ہوئی ننگی تلواروں کو ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ اور سینوں کو ڈھال بنا کر ترکش کے ترکش اپنے سینوں پر خالی کرائے تھے۔

جہاں کمزور عورتوں نے ایمان کے جوش میں زخموں سے چور ہو ہو کر حملہ آور فوجوں پر جست کی تھی۔ جہاں پیغمبرؐ کے رخساروں کی آہنی کڑیاں نکالنے کے لئے فداکار مرد نے اپنے دانت ریزہ ریزہ کر ڈالے تھے۔ جہاں رسالت کی شمع پر سجدہ کرتے ہوئے پروانوں کو موت بالیقین موت ہزاروں تیروں اور تلواروں سے ڈرانے کی کوشش میں بری طرح ناکام ثابت ہوئی تھی۔ جہاں انسان کے لئے انسانوں کی ایک ایسی اتھاہ عقیدت دکھائی دی تھی جس کے لئے انسان کی جذباتی زبان میں کوئی بھی لفظ موجود نہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جلالِ ایمانی کی ایک بے پناہ قوت کے ساتھ پکارا۔

اے گروہ انصار!

دائیں طرف سے وہی بیقرار بازگشت سنائی دی "ہم حاضر ہیں۔ یا رسول اللہؐ!

ہم حاضر ہیں!"

آپ نے بائیں طرف رخ کیا اور پھر مسلمانوں کو آواز دی — اس بار اس سے بھی زیادہ بے تاب و پر شوق جواب ملا "ہم حاضر ہیں — اے خدا کے پیغمبر! ہم حاضر ہیں!"

آپؐ نے مٹھی بھر انسانوں کا یہ جواب سنا اور ایک زلزلہ انگیز جوش کے عالم میں اپنی سواری سے نیچے اتر پڑے۔ اور آپ کے یہ الفاظ میدان جنگ میں پوری قوت سے گونج اُٹھے:-

"میں ہوں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر! — میں عبد المطلب کا فرزند ہوں!!"

ادھر آپؐ نے یہ آواز بلند کی ادھر آپ کے بلند بانگ محترم چچا حضرت عباس نے پسپا ہوتی ہوئی فوج کو للکارا۔

"او انصار کے گروہ! — اور اے وہ لوگو! جنھوں نے اسلام پر جان دینے کا مقدس عہد کیا ہے! بڑھو! آگے بڑھو!"

یکایک اسلامی لشکر میں جذبات کی ایک نئی روح دوڑ گئی — وہ فوج جو پسپا ہو رہی تھی اسقدر جوش و خروش سے آگے بڑھی کہ اگر سواری نے اس جوش آمیز رفتار کا ساتھ نہ دیا تو سوار سواریوں سے کود پڑے اور بجلی کی طرح آگے بڑھے۔ شہادت کے متوالوں نے موت سے آنکھیں چار کرنے کے لئے دفاعی سامان کے بوجھ اور زرہیں اتار کر پھینک دیں۔ اور تیروں کی بارش میں اس طرح نعرۂ جہاد بلند کرتے ہوئے طوفانی رفتار سے پیش قدمی کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کفر کی صفیں زیر و زبر کر کے رکھدیں کمانوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے — کافروں کی لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کو کائی کی

طرح پچھاڑ دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہوازن اور ثقیف کے سورماؤں کو سر پر پاؤں رکھکر بھاگ نکلنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ جنگ کا دوسرا مورچہ طائف کا مضبوط قلعہ تھا۔

یہاں ہوازن قبیلہ کے بھاگے ہوئے سپاہی قبیلہ ثقیف کے ساتھ آملے تھے۔ وہ قبیلۂ ثقیف جو خود کو قریش کا ہمسر وہم پلہ سمجھتا تھا۔ جذبۂ جہاد کے متوالوں نے حنین کے میدان کارزار میں کافروں کے چھکے چھڑا دیئے تھے اسلئے غنیم کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ قلعہ کے اندر پناہ لیکر ادھر سے تیر اندازی کرے۔ وہی فوج جو حنین کے میدان میں تیروں کی پہلی باڑھ سے بکھرنے لگی تھی وہ آج تیروں کی بارش میں قلعہ پر پڑاؤ ڈالے ہوئے پڑی تھی۔ اور کئی دن تک مسلسل حملوں کے باوجود جب قلعہ نہ کھل سکا تو سہمے ہوئے دشمنوں کو قلعہ میں بند چھوڑ کر اسلامی لشکر نے جعرانہ کے مقام پر آکر پڑاؤ ڈالا۔

مسلمان قلعہ سے ہٹ گئے تھے مگر اللہ کا رسولؐ طائف کی ان فضاؤں میں دعاؤں کا سوز بکھیر آیا تھا، ٹھیک اس وقت جب خونخواری کی بدترین بے حسی اور بے رحمی کے ساتھ قلعہ کے در و دیوار تیر افگنی میں مشغول تھے۔ جب مجاہدوں نے خدا کے دشمنوں کی حق کشی اور سینہ زوری سے تنگ آکر حضورؐ سے بد دعا کرنے کی درخواست کی۔ تو آپؐ نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے اور بد دعا نہیں دعا کی۔ دعا کی ان سفاک انسانوں کے لئے جو خدا کی زمین کو بہترین انسانوں کے خون سے رنگین کرنے پر کمر بستہ تھے۔ دعا کی ان ظالموں کے لئے جن کے جذبات میں پتھروں کی سی بے حسی اور فولاد کی سختی تھی۔ دعا کی ان خونخواروں کے لئے جو پیغمبرِ

کے لہو سے نفرت و انتقام کی ہولی کھیلنا چاہتے تھے۔ انسانی ستم کاریوں پر عفو و درگذر سے مسکرانے والے نے دعا کی۔ جلنے والوں کے لئے خدا کے آگے رونے والے نے دعا کی۔ جو محمدؐ کے لئے زمین تنگ کرنے کی قسم کھا رہے تھے محمدؐ ان کے لئے خدا سے التجا کر رہا تھا کہ ان کو وہ جنت عطا کر جس کی وسعتوں میں آسمان و زمین کی پہنائیاں ذروں کی طرح گم ہو جائیں۔

آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے مجاہد جوش انتقام میں چیخ اٹھے تھے اور بددعا کی درخواستیں کر رہے تھے اور آپؐ ہاتھ پھیلائے دامن پسارے ہوئے خالق کائنات سے کہہ رہے تھے:۔

"اے خدا —— ثقیف کو سیدھا راستہ دکھا دے — اے خدا ان کو میرے نہیں اپنے دین کی چوکھٹ پر سجدہ ریز کر دے!"

جان دیدینا! کسی بڑے مقصد کے لئے جان دیدینا بہت مشکل اور بڑا حسین کام ہے لیکن جان لینے والوں کی بلائیں لینا اس سے بھی کہیں زیادہ دشوار اور دلکش ادا ہے —— کمانوں سے نکلے ہوئے زہریلے تیر اپنے بہترین تیراندازوں کو مایوس کر چکے تھے لیکن زبان دل سے چھوٹا ہوا یہ "ناوک دعا" خالی نہ جا سکا۔ ٹھیک ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور دو ہی سال کے بعد یہ دعا ایک شاندار حقیقت بنکر تاریخ کے سامنے آگئی۔

حنین کے محاذ پر خدا کا رسولؐ ایک ولولہ انگیز جلال بنکر نظر آیا تھا تو طائف میں یہ شخصیت پیکر جمال کے قالب میں ڈھل گئی۔ اور اب وہ جعرانہ کے تاریخی مقام پر تھا جہاں یہ جلال اور جمال کی مقدس ادائیں مل کر ایک حسین ترین منظر پیش کرنے

والی تھیں۔

جعرانہ کے مقام پر وافر ترین مال غنیمت کے ڈھیر تقسیم کئے جا رہے تھے۔ ان میں چھ ہزار قیدی تھے۔۔۔ چوبیس ہزار اونٹ تھے۔۔۔ چالیس ہزار بکریاں تھیں۔ اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ انسانیت کا بہترین درد شناس خدا کا پیارا رسولؐ ان دشمن قیدیوں کی طرف درد و گداز کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ آپؐ کا جی چاہتا تھا کہ یہ لوگ انسانی قید سے نکل کر اپنے مالک کی حلقہ بگوشی قبول کر سکیں۔ آپ ان کو آزاد کر کے اسلام کے سینے میں جوش مارتی ہوئی خدا کی رحمت دنیا کو دکھانے کے لئے بیتاب تھے۔ مال غنیمت کی تقسیم ملتوی کر دی گئی اور کئی دن تک یہ انتظار کیا گیا کہ ہوازن اور ثقیف کے سردار اپنے ان اسیروں کو چھڑانے کے لئے آئیں۔ لیکن حق سے ٹکرانے والے شکست کا زخم کھا کر ایسے گرے کہ اپنے قیدیوں کو چھڑانے کا فرض بھی بر وقت نہ ادا کر سکے۔ آخر یہ مال غنیمت اسلامی لشکر پر تقسیم کیا گیا۔

اس تقسیم کے وقت بھی انسانی جذبات کی پاسداری ملحوظ تھی۔ اس میں سے ان نومسلموں کو دل کھول کر کثیر حصہ دیا گیا جو ابھی نئے نئے آغوش اسلام میں آئے تھے، اور اس کی فیاضی اور دلجوئی کی شان سے ناواقف تھے۔ یہ جہاد ان کا پہلا جہاد تھا۔ اسلئے جاں نثاری کی یہ پہلی کوشش فطری طور پر دل جوئی اور ہمت افزائیوں کا نفسیاتی تقاضہ کر رہی تھی۔

ابھی بدترین شکست پر شکست کھانے والا شیطان تیزی سے حرکت میں آیا۔۔۔ منافقوں کو آلۂ کار بنا کر انصار کے کچھ نوجوانوں کے دماغ میں یہ فتنہ سامان

نوشتہ چھوڑ دیا کہ "مال غنیمت کی تقسیم میں رسولؐ خدا نے مکّے کے مقابلہ میں مدینے کو نظر انداز فرما دیا! — مکّے کے نومسلموں کو مدینے کے پرانے جاں نثاروں پر ترجیح دی!"

آخر کچھ انصار نوجوان بے قابو ہو کر کہہ اٹھے:—

"یہ وہی تو مکّے والے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کا خون بہایا اور یہ خون ابھی تک ان کی تلواروں سے ٹپک رہا ہے۔ لیکن پھر بھی انعام ان کے لئے اور مشکلات ہمارے لئے! — نفع اٹھانے کے وقت وہ ہیں اور مشقت اٹھانے کے لئے ہمیں یاد کیا جاتا ہے!"

یہ جذباتی آوازیں بھٹکتی ہوئی رسولؐ خدا کے کانوں تک پہنچیں — ایک انتہائی بے لوث محسن اپنے بہترین دوستوں کی طرف سے آخری درجہ کی دل آزاری کی زد میں تھا۔ لیکن آدمیوں کی کمزوریوں پر ترس کھانے والے انسان کاملؐ نے اپنے مجروح جذبات کا گلہ گھونٹ دیا — آپؐ خون جگر کے خونیں آنسو پی گئے۔ اور سکون و متانت کی ایک درد بھری آواز میں انصار کو آواز دی۔

"جانتے ہو آج میرے متعلق لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اے خدا کے رسولؐ! انصار کے بزرگ گڑگڑا اٹھے" یہ چند ناپختہ کار نوجوانوں کی جذباتی حرکت ہے جس کے ساتھ ہمارے بزرگوں اور سربراہوں میں سے کوئی نہیں!"

آپؐ یہ جواب سنکر خیمے سے باہر نکلے تو جلال و جمال کی ایک عجیب نیرنگی نے آپؐ کے سراپا میں عظمت و دلکشی کی انتہائیں سمیٹ دی تھیں۔

اور جب سب لوگ آپ کے چاروں طرف پروانہ وار جمع ہو گئے تو آپؐ نے الفاظ میں حقیقت اور جذبات کو اس طرح انڈیلنا شروع کیا۔

" کیا یہ سچ نہیں کہ تم بھٹکتے پھر رہے تھے تو خدا نے تمھیں میرے ذریعہ سیدھی راہ دکھائی؟

کیا تم سب کا شیرازہ بکھرا ہوا نہ تھا اور خدا نے تمہیں میرے ذریعہ محبت اور اخوۃ کی نعمت عطا کی؟

کیا تم لوگ نادار نہ تھے اور خدا نے تمہیں میرے ذریعہ دولتِ دنیا بھی عطا فرمائی۔؟

آپؐ درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے یہ فرمار ہے تھے اور ہر بار انصار کی طرف سے عجز و عقیدت سے سرشار یہ پکار بلند ہوتی رہی " بیشک خدا کا رسولؐ سچ کہتا ہے — ہمارے سر خدا کے رسولؐ کے احسانات سے جھکے ہوئے ہیں۔"

" نہیں" یکایک آپ کا حسین چہرہ مقدس جذبات سے تمتما گیا " نہیں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمدؐ! جب تجھکو لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری بات مانی — جب لوگوں نے تیرا ساتھ چھوڑا تو ہم تیرے دوش بدوش رہے۔ — تو خالی ہاتھ آیا تھا تو ہم نے تیری دستگیری کی۔"

یہ جذبات کا نقطۂ عروج تھا — حضورؐ کو اس طرح دل چیر کر دکھاتے ہوئے دیکھکر رسالت کے پروانے بیقرار ہو گئے؟ سیکڑوں دل کانپ رہے تھے۔ سیکڑوں سینے ضبط کی کوشش سے پھٹے جا رہے تھے۔ سیکڑوں آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں تھیں۔ جذبات کے طوفانی تھپیڑے کھاتی ہوئی اس چند لمحاتی خاموشی کے بعد آپؐ نے فرمایا اور اب آپکی آواز میں جوش

نہیں سوز تھا۔ تلاطم نہیں پر سکون ٹھیراؤ تھا۔

"تم لوگ یہ کہتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ ہاں تم سچ کہتے ہو!۔ لیکن۔ اے انصاریو! سچ بتاؤ کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ اور لوگ مال غنیمت کے اونٹ اور بکریاں لیکر جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھر جاؤ؟!"

محمدؐ عربی کے یہ آخری الفاظ تھے۔ ان آخری الفاظ کی ابھی گونج بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ اسلامی لشکر کی طرف سے ایک اور آواز آئی۔ یہ فرط غم سے سینے پھٹ جانے کی آواز تھی۔ یہ عقیدت و شوق کی شدت میں دلوں نے زبان پر آکر چیخ ماری تھی۔ بیدروحیں تڑپ گئیں تھیں۔ نوجوان آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اٹھائے ہوئے کھڑے تھرتھرا رہے تھے۔ بڑے بڑے سردار حضورؐ کے قدموں کو پیار کرنے کے لئے زمین پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ بوڑھے بچوں کی طرح ہوک مار کر رو رہے تھے۔ داڑھیاں سچ مچ آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ دل کی دھڑکنیں سچ مچ اتنی تیز ہوئیں کہ پورے جسم کپکپانے لگے۔

اور محمدؐ کے بہترین چاہنے والے یہ جاں باز، جاں نثار اشک آلود آنکھیں، کانپتے ہوئے ہاتھوں اور تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ محمدؐ کے جاں نواز بشرے پر وارفتگی سے نظر جمائے ہوئے پکار اٹھے۔

"ہمیں کچھ نہیں محمدؐ چاہئیے! محمدؐ! صرف محمدؐ!!"

اگلے دن جب ثقیف و ہوازن کا وفد قیدیوں کو چھڑانے کے لئے آیا تو آپؐ نے اپنے حصے کی قیدی آزاد کر دیئے اور محمدؐ صرف محمدؐ کے طالب چاہنے والوں نے اپنے ہزاروں قیدیوں کو آزاد کر کے مال غنیمت کا وہ حصہ بھی

اس شخصیت جمیل کے ایک اشارے پر لٹادیا جس میں کبھی اضافے کی مانگ کی جارہی تھی۔ کیسی دلکش کیسی کارگر، کتنی دلربا اور بے پناہ تھی یہ شخصیت جس کے اشارے پر ان انسانوں کے جذبات حرکت کرتے تھے جنھوں نے صدیوں تک بغاوت، وحشت اور لوٹ مار کی گود میں پرورش پائی تھی! — کون ہے جو اس تاریخ کو پڑھے اور بیتابانہ پکار نہ اٹھے "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ عربی خدا کے بہترین اور آخری فرستادہ تھے! — میں گواہی دیتا ہوں کہ اسلام زمین کی کوئی انقلابی تحریک نہیں آسمان کا خالص آسمانی پیغام ہے!۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ زندگی وہی زندگی ہے جو محمدؐ عربی کے نقشِ قدم اپنے خونِ دل و جگر سے اجاگر کرتی ہوئی چلے — چلتی رہے اور اسی حالت میں موت اسے اپنے آغوش میں لے لے۔

ہم یہی گواہی دینے کیلئے اس دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ ہم اسی بات کی عملی گواہی دے نہ سکنے کے سب سے بڑے مجرم ہیں۔

اور ہم — "مسلمان" ہیں؟ — خدارا ایک بار — صرف ایک بار تو سوچئے "کیا ہم مسلمان ہیں؟"

پہلا حصہ تمام شد

چند ایمان افروز کتابیں

وقت کا بہترین مصرف

اشرف الجواب — اس میں مولانا اشرف علی صاحبؒ نے اسلام پر کئے جانے والے گوناگوں اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ دو جلدوں میں ہیں -/۱۰

سیرۃ النعمان — امام ابو حنیفہؒ کی سیرت پر مولانا شبلیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب۔ تین روپے۔ (مجلّد چار روپے)

حسن یقین — ایک حجازی عالم کے ایمان افروز فرمودات کی تلخیص سلیس و شگفتہ اردو میں اسلامی اقدار و عقائد کی دلپذیر حکیمانہ تفہیم و تشریح۔ قیمت مجلد ۱/۷۵

خطبات مدراس — سیرت کے موضوع پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مشہور ترین خطبات جو اپنا جواب آپ ہیں
مجلد ۳/۵۰

بلاغ المبین — حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی ایک بیش بہا کتاب
-/۲

کیا ہم مسلمان ہیں؟

(حصّہ دوم)

شمس نوید عثمانی

ناشر
مکتبہ تجلّی دیوبند (یوپی)

نام کتاب ۔۔۔۔ کیا ہم مسلمان ہیں؟ (حصہ دوم)

مصنف ۔۔۔۔۔۔۔۔ شمس نوید عثمانی

ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مکتبہ تجلی دیوبند

پریس ۔۔۔۔۔۔۔ اسلامی پرنٹنگ پریس، دیوبند

صفحات ۔۔۔۔۔۔ ۲۵۶

قیمت پانچ روپے ۔۔۔۔۔ ~~۳/۷۵~~

تاریخ اشاعت ۔۔۔۔۔۔ ستمبر ۷۲ء

عرضِ ناشر

ماہنامہ تجلّی (دیوبند) میں شائع ہونے والا یہ مستقل سلسلہ مضامین اپنے سوز و اثر، اپنے گداز اور اپنی دلکشی کے اعتبار سے کیسا ہے اس کے بارے میں ہمیں خود کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ قارئینِ تجلّی کا وسیع حلقہ اسے بڑے جذب و شوق سے پڑھتا ہے اور جب اس سلسلہ کے منتخب حصّے کتابی شکل میں شائع کئے گئے تو اربابِ ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اسی لئے اب کتاب کی جلد ثانی پیش کی جا رہی ہے۔ جلد اوّل کی طرح اس میں بھی کچھ نہ کچھ حصّہ غیر مطبوعہ ہے۔ امید ہے اہلِ ذوق اس کا بھی خیر مقدم کریں گے۔

مصنّف اور ناشر دونوں ملتمس ہیں کہ قارئین انھیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

منیجر مکتبہ تجلّی۔ دیوبند

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا (قرآن)

اے ایمان والو! ایمان لانے کی طرح ایمان لاؤ

دو ایمان

ایک حقیقت ——— دو سراراسم

مدینہ جانِ مدینہ کے انتظار میں ہے اُسی نجات دہندہ کے انتظار میں ہے

وہ جس کو باپ کا سایہ نہ ماں کا پیار ملا حریف قوم ملی گرم ریگزار ملا
بجائے نوعِ بشر قلبِ بے قرار ملا

جیلے خواب حقیقت بنائے بچپن میں کھلائے پھول جوانی کے سنگ و آہن میں
لیا خراجِ صداقت عمل کے دامن میں

وہ جستجوئے مسلسل کا دورِ تنہائی گواہ جس پہ ہے غارِ حرا کی گہرائی
خوشا نصیب کہ وحی خدا اُتر آئی

ملا پیام کہ اے کشتۂ تلاشِ مدام تری تلاش پہ رحمت تری طلب کو سلام
تو ہی تو ہے مری دنیائے آب و گِل کا امام

نہ رو کہ تجھ کو چٹانوں پہ گُل کھلانے ہیں بسا دے خلد جہاں آگ کے مہانے ہیں
اب اُٹھ! کہ حرف ترے منتظر زمانے میں

اُٹھا وہ، کوہِ صفا سے جہاں کو دی آواز تمام رقت و رافت، تمام سوز و گداز

بلند پہلی اذاں کی زمیں پہ بہرِ نماز

وہ سوچتا تھا کہ چھوٹے ہوئے خدا کا سراغ ۔۔۔ مٹے نشاط سے بھر دے گا زندگی کا ایاغ
کریں گے جشنِ چراغاں دل و نظر کے چراغ

مگر پڑی جو "حقیقت" پہ آدمی کی نگاہ ۔۔۔ تو کانپ اُٹھی عزازیل کے لبوں پہ کراہ
غبار اُڑاتا اُٹھا کاروانِ جرم و گناہ

کہا کہ تیری امانت کو مانتے ہیں ہم ۔۔۔ ترے عمل کی صداقت کو جانتے ہیں ہم
"تمہارے خدا" سے مگر جنگ ٹھانتے ہیں ہم

نبیؐ نے کفر کی للکار کو قبول کیا ۔۔۔ خوشی سے شورشِ بیکار کو قبول کیا
خدا کے نام پہ ہر وار کو قبول کیا

خدا ملا تو خدائی کا غم بھی ساتھ ملا ۔۔۔ فلک کا نور زمین کا ستم بھی ساتھ ملا
عرب کی روح میں زہرِ عجم بھی ساتھ ملا

یہ زہر آگ بنا آگ میں اُبال آیا ۔۔۔ تو تہمات اُٹھے، نفس کو جلال آیا
زمیں کے چھوٹے خداؤں کو اشتعال آیا

زباں کے تیر چلے اور جگر کے پار ہوئے ۔۔۔ بتوں کے نام پہ انسانیت پہ وار ہوئے
رسولِؐ امن پہ پتھراؤ بار بار ہوئے

وہ مرد جس پہ غلط اشتباہ کوئی نہ تھا ۔۔۔ یہی گناہ تھا اس کا گناہ کوئی نہ تھا
اسی کا سارے زمانے میں آہ کوئی نہ تھا

جو اس کی سمت بڑھے بینوا غلام تھے وہ ۔۔۔ شکارِ ظلم و ستم تھے اسیرِ دام تھے وہ
نظامِ شرک کے کچلے ہوئے عوام تھے وہ

۷

وہ سب دہکتی ہوئی بھٹیوں میں ڈالے گئے
اندھیرے اُڑتے کے برسے بھر اُجالے گئے
وطن کی گود سے دھتکار کر نکالے گئے

وطن سے دور یہ طبقہ مدینے جاتا رہا
رسول مکہ و طائف میں چوٹ کھاتا رہا
دعائیں دیتا رہا اور مسکراتا رہا

گماں کا قہر جلال یقین نہ چھین سکا
بتوں کا آرٹ جمال یقین نہ چھین سکا
کمالِ ظلم کمالِ یقیں نہ چھین سکا

اب انتقام نئے پیچ و تاب کھانے لگا
سکوں کی زد میں جنوں کو پسینہ آنے لگا
برہنہ ظلم چھپی سازشیں چلانے لگا

برائے قتل نبی ظلمات میں غنیم آئے
سحر کے خوں کیلئے رات میں غنیم آئے
نقاب سازشِ ظلمات میں غنیم آئے

یہ آدمی تھے مگر آدمی کے دشمن تھے
بتوں کا دوست تھا سچائی کے دشمن تھے
یہ اک وجود نہیں زندگی کے دشمن تھے

عجیب رات تھی تاریخ میں زمانے کی
بشر کو دشمنی تھی [illegible] بنانے کی
عداوتوں کا مقدس لہو بہانے کی

خدائے بغض کی شیطاں کے احترام کی رات
خلوص و حق سے خفا غیض و انتقام کی رات
منات و لات کے نعرے ہبل کے نام کی رات

سیاہ شب میں گناہوں کی تیرگی ضم تھی
خروش بزم عناصر کی آنکھ پرنم تھی
"بشر کی لاش" پہ تاریخ محوِ ماتم تھی

یقیں کی لاش کے لائق تھا ظلمتوں کا کفن
نہ تھا بہار کے شایاں بہار سوز چمن!

ملا رسولؐ کو اس رات حکم ترکِ وطن

وطن حیات کے خوابوں کا پہلا گہوارا — وطن حیات کا اک لختِ دل، جگر پارا
مگر خدا سے زیادہ نہ تھا وطن پیارا

زمیں کے ذوق کا رخ سوئے عرش موڑ دیا — خدا کی سمت بڑھا وہ وطن کو چھوڑ دیا
ملا اشارۂ ساقی تو جام توڑ دیا

وہ جا رہا تھا جو دنیا بسانے آیا تھا — وہ جا رہا تھا جو سب کچھ لٹانے آیا تھا
وہ جا رہا تھا جو قسمت جگانے آیا تھا

خلوص جرم، محبت خطا ملی تھی جسے — وہ جا رہا تھا سزائے وفا ملی تھی جسے
خدا کے نام سے دنیا خفا ملی تھی جسے

گرجتے مکہ و طائف پہ خوں نثار کیا — وہ جا رہا تھا کہ جس نے ستم کو پیار کیا
دعائیں دے کے گیا جس نے اس پہ وار کیا

جو تاج و تخت جلا کر زمیں پہ سویا تھا — جو اپنے غم پہ ہنسا، دشمنوں پہ رویا تھا
رگوں میں جس نے زمانے کا غم سمویا تھا

وہ جس کے پاؤں سے ذرے لپٹ کے سوتے تھے — وہ رو دیا تو در و دیوار پھوٹ کے روتے تھے
بچھڑ رہے تھے مناظر لپٹ کے روتے تھے

زمیں پہ جس کا حسیں نقشِ پا ہے کون ہے وہ — انہیں خبر تھی جو گھر سے چلا ہے کون ہے وہ
جو بس خدا کا ہے اس کا خدا ہے کون ہے وہ

ادھر اس کے شانہ بشانہ رفیقِ غار چلا — وطن سے دور چلا سوئے رہگذار چلا
قبا کی سمت مدینہ کا تاجدار چلا

شبِ سیاہ نہ گھوڑوں کی ٹاپ روک سکی — نہ سازشوں کے سمندر کی بھاپ روک سکی
نہ غارِ ثور پہ قائف کی چاپ روک سکی

یقین کا نور جبیں سے ٹپکتا جاتا تھا — خدا کا ساغرِ رحمت چھلکتا جاتا تھا
سیاہ شب کا اندھیرا چمکتا جاتا تھا

(۲)

مدینہ جانِ مدینہ کے انتظار میں ہے — اُسی نجات دہندہ کے انتظار میں ہے

ہزاروں آنکھیں ہیں مرکوزِ جلوہ گاہوں پہ — ہزاروں قلب بچھے جا رہے ہیں راہوں پہ
طلوع ہوگا وہ "حسنِ ازل" نگاہوں پر

ہزاروں لوگ کئی میل روز جاتے ہیں — شرار اُگلتے اُفق پر نظر جماتے ہیں
مگر اُداس مدینہ میں لوٹ آتے ہیں

دہک رہی ہیں چٹانیں — کسی کو ہوش نہیں — زمیں نے شعلے نکالے — کسی کو ہوش نہیں
پڑے ہیں پاؤں میں چھالے — کسی کو ہوش نہیں

فقط یہ ہوش ہے دل میں سما رہا ہے کوئی — کہیں سفر میں ہے ناقہ چلا رہا ہے کوئی
اب آنیوالا ہے، آتا ہے، آ رہا ہے کوئی

تمام شہرِ حسیں اضطراب میں گم ہے — اک انتظار کے روشن سراب میں گم ہے
حقیقتوں کا جہاں ایک خواب میں گم ہے

اک انتظار نہیں اضطراب طاری ہے — ہر ایک لمحہ ہزاروں برس پہ بھاری ہے
تصورات میں "محبوب ﷺ کی سواری" ہے

اب انتظار کی شدت سے جاں لبوں پہ ہے　　وفورِ سوزِ محبت سے جاں لبوں پہ ہے
رسولؐ وقت کی فرقت سے جاں لبوں پہ ہے

یکایک ایک حسین نور کا غبار اُٹھا　　اُفق کے پاس اُبھرتا ہوا سوار اُٹھا
بلند چھت سے یہودی کوئی پکار اُٹھا

شبِ فراق کے مارو! سحر مبارک ہو!　　اُٹھا حجاب، اُٹھاؤ نظر! مبارک ہو!
طلوعِ ناقۂ خیر البشرؐ مبارک ہو!

یہ اک ندا تھی کہ مضرابِ سازِ آبادی　　حسین گیتوں سے گونجی مدینہ کی وادی
ہوا بلند فضاؤں میں نغمۂ شادی

یہ جشن ناچتا گاتا چلا قبا کی طرف　　رواں خدائی ہے پیغمبرِ خدا کی طرف
نثار ہونے چلی منزلِ وفا کی طرف

ہر ایک ذرۂ سوزاں پہ فرشِ راہ ہیں دل　　وفا کا سیلِ رواں جذبِ بے پناہ ہیں دل
لرزتے ہونٹ تڑپتی ہوئی نگاہ ہیں دل

اُدھر ہیں مکہ و طائف اِدھر قبا کی زمیں　　اُدھر گماں کی خشونت اِدھر جمالِ یقیں
اُدھر دلوں کی سیاہی اِدھر ہے نورِ جبیں

اُدھر بتوں کے پجاری اِدھر خدا کے غلام　　اُدھر ہے نفرت و وحشت اِدھر اخوتِ عام
اُدھر ہے قتل کی سازش اِدھر وفا کے سلام

وہاں قریش کے پتھراؤ، آگ کی بوچھار　　یہاں رسولؐ پہ قرباں مہاجر و انصار
اِدھر سے نذرِ دل و جاں اُدھر سے وار پہ وار

جو قہرِ مکہ و طائف سے خوں چکاں گذرا　　قبا میں جشنِ محبت کے درمیاں گذرا

بسی تھی جنتِ گیتی کشاں کشاں گذرا

وہ شب پرست تھے بہ روشنی پہ مٹتے ہیں　　وفا کے لمس سے نفرت کے زخم بھرتے ہیں
جلی ہے شمع پتنگے طواف کرتے ہیں

جو سنگ و خشت پیمبرؐ پہ طائفوں میں چلے　　وہ نور بن کے یہاں معبدِ قبا میں ڈھلے
جہاں غلاموں کو آقا لگا رہے ہیں گلے

رسولؐ جانبِ یثرب سلام کر کے چلا　　قبا میں نصف مہینے قیام کر کے چلا
ہلالِ عید کو ماہِ تمام کر کے چلا

کھڑا ہے راہِ مدینہ پہ والہانہ ہجوم　　زمیں پہ بارشِ گل ہے برس رہے ہیں نجوم
خوشا پیمبرِؐ مظلوم ! ہادیِ معصوم

قدم قدم پہ محبت کے موجزن طوفاں　　وفورِ شوق میں آنکھوں سے سیلِ اشک رواں
صدائے "جاء رسولؐ" سے گونجتا ہے جہاں

خدا کے ملک میں حبشی غلام رقص میں ہیں　　جھٹک کے نسل پرستی کے دام رقص میں ہیں
بنامِ عیدِ مساواتِ عام رقص میں ہیں

ہے زن پہ وجد سا طاری تو رات رقص میں ہے　　حیات رقص میں ہے کائنات رقص میں ہے
ملا ہے خوف و الم سے نجات رقص میں ہے

چھتوں پہ چڑھ کے خواتین نے نظارا کیا　　کبھی زباں سے کبھی ہاتھ سے اشارہ کیا
وہ ہیں رسولؐ ! خدا نے انھیں ہمارا کیا

اٹھا ہے چاند وہ کوہِ وداع پر دیکھو　　وہ آ رہا ہے — وہ آیا ہمارے گھر دیکھو
نمازِ شکر پڑھیں گی ہم عمر بھر دیکھو

یہ دف پہ شعر پڑھے بچیوں کی ٹولی نے — ہمارا ربط ہے نجّار کے قبیلے سے
محمدؐ! آپ ہیں ﷺ کتنے اچھے ہمسائے

نبیؐ نے پوچھا "بتاؤ تمھیں ہے مجھ سے پیار؟" — تو "ہاں" میں سر کو ہلا کر کیا گیا اقرار
نبیؐ نے چوم لیا دستِ دخترِ نجّار

سپردگی کے جہاں سے گزر رہا تھا رسولؐ — مآلِ مکہ و طائف سے ڈر رہا تھا رسولؐ
خدا سے رحم کی درخواست کر رہا تھا رسولؐ

وفا کی بزم میں اہلِ جفا بھی یاد رہے — ہلاکِ شامتِ جرم و خطا بھی یاد رہے
اُسے وہ دشمنِ جاں آشنا بھی یاد رہے

لبوں پہ حرفِ تشکرؐ تھا مسکراہٹ تھی — گلاب و لالہ کے عارض پہ تمتماہٹ تھی
نئی بہار کی کتنی حسین آہٹ تھی!

ادائے شکر وفا ساز دل کو چھوتی ہوئی — نگاہ اُٹھتی ہوئی "رازِ دل" کو چھوتی ہوئی
اتر کے سینوں میں آواز دل کو چھوتی ہوئی

اُٹھیں صدائیں کہ فرقت کے مارے تھک چکے ہیں — اِک آپ چاند تو ہم سب ستارے آپ کے ہیں
یہ جاں، یہ دل، یہ کائنات سارے آپ کے ہیں

یہاں قیام، خدارا یہاں قیام کریں — فراق کے در و دیوار جشنِ عام کریں
سحر کے نور سے روشن ہماری شام کریں"

رواں تھا ناقہ، رُکا غریب کے اِک ٹیلے پر — مکانِ حضرتِ ایوبؓ کے کنارے پر
نگاہِ حق تھی اسی آرزو کے بارے پر

وہ والہانہ عقیدت جو منتظر تھی یہاں — قلم ہے اس کے تصور سے دوبدو افغاں

مدینہ جانِ وطن تھا نبیؐ تھے حاصلِ جہاں

دیارِ غیر میں لطفِ وطن ملا تھا اُسے ؐ — وفا شعار دلِ مرد و زن ملا تھا اُسے ؐ
چمن سے دور سراغِ چمن ملا تھا اُسے ؐ

مدینہ جانِ مومنؐ کے انتظار میں تھا — اسی نجات دہندہ کے انتظار میں تھا

یہ عہد نامۂ عقبہ کی پاک وادی تھی — جہاں ضمیر کو تاریخ نے صدا دی تھی
جراحتوں میں دلِ روح مسکرا دی تھی

یقیں کے سوز سے خونِ حیات جھلکائے — وفا کی نذر کو خزرج کے سورما آئے
رفاقت اور اطاعت کے عہد دہرائے

کہا سلیقۂ پیکار کی قسم ہے ہمیں — رگوں میں خونِ شرربار کی قسم ہے ہمیں
برہنہ نیزہ و تلوار کی قسم ہے ہمیں

بس اب یہود و نصاریٰ کا ساتھ چھوڑینگے — خدائی چھوڑ دو — ناطہ خدا سے جوڑینگے
رسولِ وقت کے فرمان سے منہ نہ موڑینگے

ہمیں پیام قبولِ وفا سنا دیجے — اب آپ ہمارے رہینگے یقیں دلا دیجے
ہمارے جذبۂ ایثار کو بڑھا دیجے

اُٹھے پیمبرِ معصومؐ مسکرا کے کہا — جبیں کو نورِ صداقت سے جگمگا کے کہا
خدا کے دین کا علم ہاتھ میں اٹھا کے کہا

تمہارا خون ہوں میں بعد مرا لہو تم ہو — بہار تازہ ہے اسلام رنگ و بو تم ہو
تمہیں خبر ہے محمدؐ کی آرزو تم ہو

وہ امن ہو کہ لڑائی — تمہارے ساتھ ہوں میں   خفا ہو چاہے خدائی — تمہارے ساتھ ہوں میں
کرو نہ خوف جدائی — تمہارے ساتھ ہوں میں

کیا مطالبہ عباسؓ نے قرینے کا   کہ لوگو! عہد ہے یہ عہد مرنے جینے کا
یہ عہد جنگ ہے طوفان اور سفینے کا

ذرا سفینہ و طوفاں کا جائزہ لے لو   سمجھ لو، سوچ لو پیماں کا جائزہ لے لو
عظیم جنگ کے میداں کا جائزہ لے لو

نبیؐ کا بارِ امانت ہے جن کے شانوں پر   رہیں گے سینہ سپر آگ کے دہانوں پر
کریں گے جست کبھی موت کے نشانوں پر

یہ سوچ لو کہ جنوں کا مآل کیا ہوگا!   جگر کے خوں سے رقم قصۂ وفا ہوگا!
بتاؤ تم سے امانت کا حق ادا ہوگا؟

کہا قبیلۂ خزرج نے "اس کا ڈر کیا ہے!   بھلا وفا کے سوا مقصدِ بشر کیا ہے!
وفا کریں گے — وفا کا صلہ مگر کیا ہے؟"

اٹھی نگاہِ پیمبرؐ بصد نشاط و سرور   کہا کہ "اس کے صلہ میں ملے گی جنتِ نور"
پکار اٹھا قبیلہ کہ "ہم کو ہے منظور!"

گواہ ہے دلِ تاریخ کیا کیا سب نے   زباں کا عہد عمل سے وفا کیا سب نے
عظیم فرضِ امانت ادا کیا سب نے

انھیں یقیں تھا کہ حسنِ یقیں ہی سب کچھ ہے   برائے جذبۂ ایثار دیں ہی سب کچھ ہے
خدا کا وعدۂ خلد بریں ہی سب کچھ ہے

اور

گیا وہ عہدِ یقیں اب گماں کا دور آیا　　ہوس کے جذبۂ سود و زیاں کا دور آیا
زمیں کی گود میں خوابِ گراں کا دور آیا

اُس عہد نامہ میں شامل ہمارا نام بھی تھا　　ہمارے نام اسی فرض کا پیام بھی تھا
سنا ہے ہم کو محبت کا احترام بھی تھا

نبیؐ سے عہد وفا کا کیا تھا ہم نے بھی　　یقین یومِ جزا کا کیا تھا ہم نے بھی
بلند نام خدا کا کیا تھا ہم نے بھی

مگر عمل نے پکارا تو سو گئے ہیں ہم　　چراغ لیکے اندھیرے میں کھو گئے ہیں ہم
مگر یہ زعم "مسلمان ہو گئے ہیں ہم"!

سنو! تلافیٔ مافات کی پکار سنو!　　پکارتا ہے تمہیں کوئی بار بار سنو!
سحر کراہ رہی ہے اُفق کے پار سنو!

اُٹھو! اُٹھو کہ اندھیرے نہ کام کر جائیں!　　یقیں کے بجھتے دیئے زہر سے نہ بھر جائیں!
نئے جہاں کے نئے آدمی نہ مر جائیں!

تمہارے پاس ہے تریاقِ زہر — جلد اُٹھو!
رواں ہے سوئے زمیں موجِ قہر — جلد اُٹھو!
اُجڑ نہ جائیں تمدن کے شہر — جلد اُٹھو!

تجلی ستمبر و اکتوبر ۶۰ء

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؒ)

آہ! ۔۔۔ وہ دونوں!!

کتنی خوفناک تھی وہ رات ۔۔۔

قتل و خونریزی کی انتہائی دردناک اور انتہائی منظم سازش کفر و شرک کی سیاہ کمین گاہ۔ دارالندوہ سے چلی اور جلوہ گاہِ رسالتؐ کی دیواروں کو چھونے لگی۔ زہرناک تلواریں میانوں سے باہر نکلی جاتی تھیں۔ نفرت و انتقام کا ناپاک خون آگ بھری آنکھوں سے باہر ٹپکا پڑتا تھا۔ پتھروں کے پجاری آج رات تہیہ کر کے آئے تھے کہ سچائی اور امانت کے مجسمے کو آج نیست و نابود ہی کر کے دم لیں گے۔

اب کیا ہو سکتا تھا؟

رسولؐ کے لئے زندہ سلامت نکل جانے کے تمام دروازے ایک ایک کر کے بند کر دئیے گئے تھے چاروں طرف سے مکان انتہائی سفاک قاتلوں کے نرغے میں تھا جہاں موت اپنے لہو آشام جبڑے کھولے زندگی کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ کفر نے اپنی دانست میں آج کائنات کے سب سے زیادہ روشن اور مقدس چراغ کو گل کر دینے کا پورا اہتمام کر لیا تھا۔

لیکن کہاں! وہ بے خبر اور نادان دشمن یہ تو جانتے ہی نہ تھے کہ ابھی ایک سب سے بڑا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ زندگی کے ایوان کا وہ صدر دروازہ جس کی محرابوں پر آدمؑ سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک بے شمار پیغمبروں کی پیشانیوں کا نور اور جگمگاتی ہوئی روحوں کی تابشیں کبھی نہ دھندلے پڑنے والے نقوش کی شکل

میں کندہ تھیں۔ وہ دروازہ جس کی اینٹ اینٹ پر یہ ازلی وابدی کہانی نقش تھی۔

"موت اور زندگی کا واحد مالک صرف ایک ہے ـــ صرف ایک
وہی جس نے نوح ؑ کی کشتی طوفان سے نکالی جس نے یونس ؑ کو
مچھلی کے پیٹ میں بھی مرنے نہیں دیا۔ جس نے موسیٰ ؑ کے لئے
دریا کا سینہ شق کر دیا اور جس کے حیطۂ قدرت سے کائنات
کا ایک ذرہ بھی باہر نہیں۔"

بے شک ننگی تلواریں اخون آشام تیوریاں اور سفاک جتھہ بندیاں آنکھوں کے لئے لرزہ خیز ہو سکتی ہیں مگر اس دل کے لئے ان کی کوئی حقیقت نہیں جس کی اتھاہ گہرائیوں میں یہ عقیدہ جڑیں پھیلا چکا ہو کہ نفع و نقصان کی فیصلہ کن طاقت صرف اور صرف ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے اور وہی خدا ہے ـــ ہاں وہی میرا اکیلا خدا ہے۔

خدا کی قسم ابھی تمہارا ایمان بالغیب کا وہ فولادی دروازہ جس کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا پر مکمل ترین اعتماد کی معصوم شان سے کھولا اور خدا کا حکم پاتے ہی بے خوف و خطر تلواروں کی دھار پر دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے باہر تشریف لے آئے۔ یہ عقیدہ اگر معاذ اللہ کوئی بے بنیاد عقیدہ ہوتا تو سنگین حقائق سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہوتا یہ عقیدہ ایک حقیقت تھا جس کے آگے ساری دنیا ایک خواب پریشاں سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ سچائی پوری قوت سے سامنے آئی تو جھوٹ اور ظلم کی ساری طاقتیں تہ و بالا ہو کر رہ گئیں۔ جو لوگ ہر جلاد کی طرح بپھرے ہوئے کھڑے تھے وہ زندہ لاشوں اور بے حس و حرکت

بتوں کی طرح ٹکڑے کے ٹکڑے رہ گئے۔ وہ جنہیں خدا نظر نہ آتا تھا خدا کا رسول ﷺ بھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے ان کی نظروں سے اوجھل رہا — اکڑے ہوئے سر بے جان لاشوں کی طرح کاندھوں پر ڈھلک گئے۔ آنکھیں خوفناک اونگھ میں پتھرا کر رہ گئیں۔ تلواروں کو اٹھانے والے بازو شل ہو گئے۔ کیسی بے بس تھی وہ طاقت جس کے ساتھ خدا نہ تھا! خدا کا رسول ﷺ کفر کی اس بیچارگی پر زیرِ لب مسکراتا ہوا اپنی راہ پر آگے بڑھ گیا۔

کتنی انقلابی اور کیسے درسِ عبرت و موعظت سے معمور تھی وہ ہولناک رات! — یہی تھی وہ رات جس کی متاعِ معرفت کا سب سے بڑا حصہ ابو قحافہ کا بیٹا لے گیا — وہ بیٹا جس کا نام لینے سے پہلے ملائکہ وضو کرتے ہیں۔ وہ بیٹا جو کئی مہینوں سے اُس ساعتِ سعید کا منتظر تھا جب وہ اپنے گھر بار، اپنے رشتہ و پیوند اور اپنی پوری دنیا کو پیچھے چھوڑ کر اپنے محبوب آقا، اپنے سردار محمد ﷺ ابن عبد اللہ کے ساتھ خانہ ویرانی اور ترکِ وطن کی سنگلاخ راہوں میں چرکے اور زخم کھاتا چلا جائے۔ وہ بیٹا جس کا سارا وجود محبت اور طاعت کے سانچے میں ڈھل کر ایک سجدۂ مجسم بن گیا تھا — جانتے ہیں آپ کون تھا وہ؟ — ابو بکرؓ — ایک بار پھر کہنے دیجئے۔ کون تھا وہ؟ — ابو قحافہ کا بیٹا ابو بکرؓ! — وہ پیکرِ صدق و تصدیق جس پر صداقت اور طمانیت، سکینت اور ایقان قیامت تک ناز کرتے رہیں گے۔ محمد ﷺ کے بعد سب سے بڑا انسان۔ ثانی اثنین اذ ہما فی الغار۔

لیکن ابھی چند لمحے صبر کیجئے۔ ابھی تو پُر خطرات کے دامن میں وہ انسان کامل اکیلا ہی چلا جا رہا ہے جیسے معلوم ہے کہ میں اکیلا ہو کر بھی اکیلا نہیں ہوں خدائے کائنات میرے ساتھ ساتھ ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت بھی خوف کی کوئی سلوٹ نہ تھی جب زمین اس کے قدموں کے لئے موت کے خطروں سے ہٹ کر تلوار کی دھار بن گئی تھی۔ خون کی گردش نہ تیز ہوئی تھی نہ سست پڑی تھی۔ جسم میں کوئی جھرجھری تک نہ آئی تھی۔ ایمان و یقین کے لامتناہی انوار اس سیاہ رات میں بھی اس کے اس چہرے سے پھوٹے پڑ رہے تھے جس کو دیکھ کر پہلی نظر میں بڑے بڑے کج کلاہ رعب و داب سے تھرتھرائے بغیر نہیں رہتے تھے مگر دوسری نظر میں جس کا جاں نواز تبسم ایک بھکاری کو بھی اس طرح مانوس کر لیتا تھا جیسے وہ اپنے بہترین دوست کی پناہ میں آگیا ہو۔

قدم قدم پر اجڑے ہوئے مکانات احتجاج اور صدمے کی خاموش کراہ بن کر اس کی صداقت کے قدم چوم رہے تھے۔ مکینوں نے آخرت کے زبردست یقین پر یہ رنگینیوں سے بھرپور دنیا تج ڈالی تھی جو انسانی بستیوں سے گھائل کر کے اس لئے نکالے گئے تھے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی پرستش کیوں کرنا چاہتے ہیں ۔۔ پتھروں کو پوج پوج کر انسانوں پر ظلم کیوں نہیں ڈھاتے؟ بچوں کو زندہ کیوں نہیں گاڑتے اور غلاموں کو اپنا جیسا انسان کیوں سمجھتے ہیں؟ یہی تھے وہ لوگ جنھوں نے دوسروں کو لوٹنے کے مقابلے میں خدا کے نام پر خود لٹ جانا پسند کیا۔ یہی تھے وہ لوگ ایمان جن کا نفس ناطقہ بن گیا تھا جو لذیذ دسترخوانوں اور سرد و شیریں پانی کی جوئے رواں کے عین کنارے بھوک اور پیاس سے

جان دے سکتے تھے۔ مگر اپنے شیشۂ ایمان میں ایک بال بھی گوارا کرنے کو تیار نہ تھے۔

ان دردناک مکانوں سے چاروں طرف دُور دُور تک وہ گھر پھیلے چلے گئے تھے جہاں خدا کی زمیں پر بسنے والے اپنے خدا کو بھول بیٹھے تھے۔ جن کو زندگی کے جال میں پھنس کر خود اپنی موت بھی یاد نہ رہی تھی۔ یہ تھے وہ مکانات جو مظلوموں کے اجڑے ہوئے گھروں سے بھی زیادہ دردناک تھے۔ یہاں مکان آباد تھے لیکن مکینوں کے سینے اُجاڑ پڑے تھے۔ یہاں سے اگر زندگی کی کوئی آواز آرہی تھی تو وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے خراٹوں کی آواز تھی یا پھر ان گنے چُنے مظلوم مسلمانوں کی کراہیں جن کو ظلم وستم کی آہنی زنجیروں میں جکڑ کر خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے سے بھی معذور کر دیا گیا تھا۔

انسانیت کے ان خوفناک ویرانوں سے گذرتے ہوئے حضورؐ کے مقدس چہرے پر گہرے درد کی کسک ہویدا تھی۔ یہ دیکھ کر آپ کا دل خون ہو رہا تھا کہ مجھے خدا نے جن انسانوں کو جگانے کیلئے بھیجا تھا ان کے گھروں سے روح ودل کی کیسی تاریکی ابل رہی ہے۔ جیسے آپ کو یہ خیال تک نہ تھا کہ اس وقت خوں خواروں کی ٹولی خود میرے تعاقب میں ہے جیسے آپکو صرف یہ غم تھا کہ مجھ پر ظلم ڈھانے والے خود اپنی جان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

یکایک آپ کے اداس چہرے پر روحانی خوشی کا نور پھیل گیا۔ موت اور خودکشی کی اس تاریک دنیا میں دُور سے زندگی کی آواز بھی آرہی

تھی۔ ان ویران کھنڈروں میں سامنے ہی ایک ایسا مکان بھی تھا جس کے در و بام پر ایک تابندہ روح کے روشن سائے خنک چاندنی کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔
جہاں خدا کے ایک بندے کو نیندوں کے نرم و گرم بستر سے کہیں زیادہ پیاری وہ بجائے نماز تھی جس پر سجدہ میں گرتے ہی بندگی کی پرسوز پیشانی اللہ کے قدموں کو چھو لیتی ہے۔ یہ حضرت ابو بکر رض کا مکان تھا۔ بنی تمیم کا وہ خوش نصیب نرالا سوداگر جس نے خدا کی رضا اور حقیقت خریدنے کے لئے اپنا سب کچھ قیمت میں پیش کر دیا تھا۔ یہی تھا وہ مکان جس کی سمت میں آخری رسول ص کے قدم اٹھ رہے تھے۔ یہی تھا وہ بندۂ مومن جس کے نصیب میں رفاقتِ رسول ص کے آخری اعزاز کا فیصلہ مشیت کا قلم ازل ہی میں لوحِ تقدیر پر ثبت کر چکا تھا — ایک بار پھر اس پیارے اور لذیذ نام کو دہراتے دیکھئے ابو قحافہ کا بیٹا ابو بکر رض — ثانی اثنین۔

"نہیں! — مجھے تمہاری پناہ نہیں چاہئے۔ میرے لئے خدا اور رسول ص کی پناہ کافی ہے۔"
یہ فولادی عزیمت اور بے انداز یقین کے سانچے میں ڈھلے ہوئے واضح الفاظ ابو بکر رض کے لبوں پر اس وقت ابھرے جب قارہ کا سربرآوردہ کافر! ابن الدغنہ یہ صبر آزما دھمکی دے رہا تھا کہ تم زمین والوں کو خفا کر کے آسمان والے کو خوش کرنا چاہو گے تو میں اپنی امان تمہارے سر سے اٹھاؤں گا۔ اس کے جواب میں پیکر صدق کے جو الفاظ زمین و آسمان کے درمیان گونجے تھے وہ

کوئی کھو کھلا جذباتی نعرہ نہیں تھے۔ غیرت بندگی نے ان الفاظ میں پورا خون حیات نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور دنیا کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ خوف خدا اور خوف دنیا آگ اور پانی کی طرح کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ حقیقت پسندی کا یہ زلزلہ خیز اعلان الفاظ کے اندر نہ سما سکا تو ٹھوس تاریخی واقعات کے سیلِ رواں میں ڈھل گیا، یہ اُسی انقلاب انگیز رات کی بات ہے جب رسالت کا "سراج منیر" کفر و شرک اور خوف و خطر کی گھٹاؤں کو چیرتا ہوا نکل رہا تھا۔

جب آنحضرت ؐ نے اُس خطرناک رات کو حضرت ابو بکر رضؓ کے گھر جا کر یہ انکشاف کیا تھا کہ "آج رات میں خدا کے حکم سے مکّہ سے جدا ہو رہا ہوں" تو آنکھیں صاف دیکھ رہی تھیں کہ حضور ؐ کے تعاقب میں کفر و شرک کی کیسی کیسی بلائیں چلی آ رہی ہیں۔ لیکن ایک پل فکر دنیا پر ضائع کئے بغیر حضرت ابو بکر رضؓ نے گڑگڑا کر التجا پیش کی تھی "اے خدا کے رسول ؐ! مجھے بھی ہم رکابی کی سعادت عطا ہو"۔ وہ اس راہ پُر خار پر وجد کرتے ہوئے چلے جو اُن کو ساری خدائی سے دُور خدا کی طرف لے جا رہی تھی۔ آخرت کا گھر بسانے کے لئے وہ گھر بار چھوڑ رہے تھے۔ خدا کے رسول ؐ کے مقابلے میں بیوی بچوں کو خیر باد کہہ رہے تھے۔ ایمان کے لئے دولت دنیا لٹا رہے تھے۔ ساری دنیا سے دامن جھٹک کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے وہ اس شخص ؐ کے پیچھے ہو لئے تھے جو پوری قوت سے یقین دلا رہا تھا کہ "اے خدا کے بندو! میرے پیچھے پیچھے آؤ گے تو خدا سے جا ملو گے۔"

غار ثور کے دہانے پر وہ دونوں اپنے اپنے اونٹوں سے اُترے۔ غار اپنی ہولناکیوں کے ساتھ منہ کھولے ہوئے تھا۔ لیکن وہ دونوں اس غار میں داخل ہونے والے تھے جن کو خوب یقین تھا کہ ہمارا خدا ہر جگہ ہے اور جہاں خدا ہے وہاں کوئی خوف نہیں۔ خدا اور خدا کے رسولؐ پر جاں نثار کرنے والا بیتابانہ آگے بڑھا اور بے محابا غار میں کود پڑا۔ اندر سے یہ والہانہ آواز آرہی تھی "میرے ماں باپ آپ پر صدقے!۔۔۔ ذرا ٹھیریئے!۔۔۔ میں اس غار کو درست کردوں!" فرطِ شوق میں اس نے جیب و گریباں کی دھجیاں کرلیں۔ ان دھجیوں سے غار کے ایک ایک سوراخ کو بند کیا اور جب خوب مطمئن ہوگیا کہ حضورؐ کی جانِ گرامی کو اب کسی اندرونی گزند کا اندیشہ نہیں تو محض خدا کے درکا بھکاری جسم پر دھجیاں لگائے ہوئے دیدہ و دل میں خدا کی اس انمول امانت کو سمائے غار میں داخل ہوا۔

ذرا ٹھیریئے۔۔۔ کیا ہم جیب و داماں کی ان دھجیوں کی قیمت کا کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں جو عقیدت ا جاں نثاری کے پیکر نے غار کے سوراخوں میں اس لئے بھردی تھیں کہ کوئی موذی جانور اسے جان سے زیادہ عزیز آقا کو ایذا نہ پہنچا سکے۔۔۔ قیمت! العظمۃُ للہ۔ سورج کی ساری کرنیں مل کر بھی تو فقط ایک دھاگے کا مول نہیں بن سکیں گی۔ آسمانوں کے تمام ستارے، ساری کہکشائیں، نور و ضیا کے سارے مخازن ایک پلڑے میں رکھ دو اور پھر غار ثور والے ابوبکرؓ کے دامن کی ایک دھجی دوسرے پلڑے میں رکھو تم دیکھو گے کہ دوسرا ہی پلڑا

جھکا ہوا ہے۔

تو یہی تھا وہ شخص جس کے بیوی بچے ایک خوفناک آتش انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھرے ہوئے دور مکے میں پڑے تھے نہ صرف بیوی بچے بلکہ اس کی عمر بھر کی پونجی جو لاکھی کے دہانے پر ڈھیر تھی، لیکن یہی تھا وہ شخص جس کے دل میں ٹھیک اس وقت بھی خدا اور خدا کے رسول م کے سوا کسی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی جب دنیا بھر کی قیمتی چیزیں اس کے دل کا دروازہ پیٹ رہی تھیں۔ جس کے زانو کو محبوب خدا کا تکیہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اللہ اللہ۔ وہ خدا کی سب سے قیمتی امانت جو آج ساری دنیا سے چھین لی گئی تھی وہی ابوبکرؓ کے دامن میں ڈال دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کر ان کے زانو پر حضورؐ کی شکل میں خدا کی قدرت بے حجاب ہوگئی ہے ــــ بے اختیار ان کی روح پکاری "ہاں میں نے گواہی دی تھی کہ اے محمدؐ! آپ یقیناً خدا کے آخری رسول ہیں ــــ اور اے غار ثور کی دیوارو! سن لو کہ ایک بار پھر یہی گواہی دینے کے لئے میرا دل تڑپ کر میرے ہونٹوں پر آگیا ہے ــــ ہاں خدا کی قسم! میرے لئے خدا اور رسولؐ کی پناہ کافی ہے ــــ"

شہادتِ حق کی ادھر یہ پکار اٹھی اور ادھر خدا کی اٹل سنّت کے مطابق ایک زبردست قربانی نے منہ کھولا ــــ غار کی چھلنی دیواروں میں جو ایک سوراخ باقی رہ گیا تھا اسی کے اندر سے ایک سیاہ ناگ کا پھن نمودار ہوا، لیکن جان لیوا خطرے کی صورت دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ کا جذبہ

ابھی تک کچھ اور جاگ اٹھا ـــ وہ جسم و جان جو تھکن سے چور اعصاب کے ساتھ رسولؐ خدا کو راحت پہنچا کر خوشی اور کیف سے سرد ھن رہے تھے جسم و جان کی قربانی کے لیئے بے قرار ہو گئے۔ یہ بات ان کے لئے موت سے زیادہ شاق تھی کہ رسولِ خدا کی راحت میں خلل پڑ جائے۔ اس لئے ذرا سی حرکت کئے بغیر انھوں نے اپنے پاؤں سے اس خوفناک بل کا منہ بند کر دیا جس سے ناگ سر نکال رہا تھا۔ آزمائش کی ایمان افروزیاں تیز سے تیز تر ہوئیں۔ سانپ نے زہریلے دانت حضرت ابو بکرؓ کے تلوے میں گڑو دیئے اور سارے خون کو زہر کی کربناک لہروں میں بدل دیا۔ لیکن محبت اور فرض کے محاذ پر جو قدم پہاڑ کی طرح جم گیا تھا وہ ٹس سے مس کیسے ہوتا۔ زہر کی آتشیں لہریں پورے جسم کو کانٹوں اور شعلوں پر گھسیٹ رہی تھی لیکن ایمان کے تقاضے پھولوں کی سیج بن کر رہ گئے تھے۔ غیرت ایمانی سے ہونٹ سل گئے تھے ایک سسکی بھی تو نہ نکلی۔ ایک جھرجھری بھی تو نہ آئی۔ صرف ایک آنسو ٹپکا ـــ ہائے وہ قیمتی آنسو جس کی تقدیر میں یہ اعزاز لکھا تھا کہ وہ خدا کے رسولؐ کے مقدس رخسار کو چومے۔ اس پر پھیل جائے۔ سارے سمندر مل کر بھی زور لگائیں تو ایسا بیش بہا موتی کبھی پیدا نہ کر سکیں گے۔

اس اشک بے اختیار کے جواب میں رحمت خداوندی کو جوش آگیا حضورؐ تیزی سے چونک کر اُٹھے اور ابو بکرؓ کی اشک آلود آنکھوں سے وہ آنکھیں چار ہوئیں جس میں انسانیت کی حلاوت اور خدا کی رحمت ستارہ بن کر جگمگایا کرتی تھی۔

"کیا بات ہے۔۔۔ اے ابوبکرؓ؟" انسانیت کے درد سے انتہائی بے قرار آواز حضورؐ کے ہونٹوں پر طلوع ہوئی تو ایک ساعت کے لئے ابوبکرؓ یہ بھی بھول گئے کہ وہ کس کرب سے دوچار ہیں۔

"کچھ نہیں اے خدا کے رسولؐ" عقیدت و شوق سے لبریز اور درد سے کانپتی ہوئی آواز میں حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "میرے پاؤں میں سانپ نے ڈس لیا ہے"۔۔۔ آواز درد کے مارے کانپ رہی تھی لیکن اس میں شکایت نہیں تھی۔ مایوسی نہیں تھی۔۔۔ حضورؐ نے فوراً اپنا لعاب مبارک اس جگہ لگا دیا جہاں سیاہ ناگ نے ڈس لیا تھا اور فوراً زہر کا اثر کافور ہو گیا۔ یہ اس ہستی کے لعاب دہن کا خداداد اعجاز تھا جس کے منہ سے وحی کے پھول جھڑتے اور پیغام خداوندی کے انوار ٹپکتے تھے۔

جسمانی آزمائش کے ایمان افروز خاتمہ پر ابھی حضرت ابوبکرؓ کی روح سجدۂ شکر ہی میں پڑی تھی کہ غار کے دہانے پر ایک اس سے بھی بڑی ایمانی آزمائش کی جھلک نظر آنے لگی، انھوں نے دیکھا کہ حضورؐ کے جانی دشمن غار کے کنارے تک آ پہنچے ہیں۔ سانپ کے پھن مارنے کے بعد بھی جو انسان اپنی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتا ہو وہ خدا کے رسولؐ کو خطرہ کی زد میں دیکھ کر اس بیچارگی کے احساس سے نیم جاں ہو گیا کہ اس خطرے کو میری جان کی قربانی بھی نہیں ٹال سکتی۔ انہوں نے انتہائی تشویشناک نظریں حضورؐ کی طرف اٹھائیں اور غار کے دہانے پر نظر آنے والے قدموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی "اب۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔ ہوگا۔۔۔۔ اے خدا کے رسولؐ؟"

یہ لوگ اگر ذرا جھک کر دیکھیں گے تو ہم صاف نظر آجائیں گے۔"

کتنی حسین تھی وہ "بے خوفی" جو خدا اور خدا کے رسولؐ کے قدموں پر جان و مال اور اہل و عیال کو قربان کر دینے کے جذبہ بے اختیار نے اس انسان کے چہرے پر ایمان کا نور بنا کر پھیلا دی تھی ـــــ اور کیا شاندار تھا وہ "خوف" جو خدا کے رسولؐ کی جان کو بے پناہ خطرے میں دیکھ کر اس کے خون کی گردش اور دل کی دھڑکنوں کو نڈھال کئے دے رہا تھا۔ لیکن ٹھیک اس وقت جب ابو بکرؓ جیسے بندۂ مومن کی نظر انسانی بیچارگی کی طرف گئی تھی خدا کا رسولؐ صرف خدا اور خدا کی قدرت کی طرف آنکھیں اُٹھائے ہوئے تھا۔ حضورؐ نے بھی اس خطرہ کو دیکھا اور ابو بکرؓ کے الفاظ سُنے ـــــ حضورؐ بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ جو خطرہ سر پر آگیا ہے وہ غار میں داخل ہو جائے تو اس بند غار میں نہ مقابلہ کا موقعہ ہے اور نہ فرار کی کوئی راہ ـــــ لیکن انھیں یقین تھا کہ میں اس وقت بھی اس قادرِ مطلق کے سایۂ رحمت میں ہوں جس کی مٹھی میں ساری کائنات ایک ذرۂ بے مقدار سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

"فکر مت کرو!" حضورؐ نے انتہاء سکون و استقلال کی شان سے تسلی دی "فکر مت کرو۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔" وہ ہونٹ جن کے لعاب سے سیاہ ناگ کا زہر ہلاہل پانی پانی ہو گیا تھا ان ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے تھے یہ الفاظ ہر خوف و خطر کے احساس تک تریاق بنکر پہنچے اور فی الفور ابو بکرؓ نے محسوس کیا کہ غار کی بوسیدہ دیواریں آہن و فولاد کے قلعہ میں ڈھل گئیں جہاں کوئی بڑے سے بڑا خطرہ پر نہیں مار سکتا۔ ادھر ان کی روح سے

وہی پکار اُٹھی کہ "میرے لئے خدا اور خدا کے رسول ؐ کی پناہ کافی ہے" اور اُدھر انھوں نے دیکھا کہ غار کے کھُلے ہوئے منھ تک آپہنچنے والے قدم پلٹے اور اور ان کی چاپ دشت و صحرا میں گرد کی طرح بکھر کر گم ہوگئی۔ وہ قدم جو پیغمبر ؐ کی تلاش میں جنگل جنگل کی خاک چھان چکے تھے۔ جب خدا نے ان کو روکا تو "ایک نظر" کا فاصلہ طے نہ کر سکے! ابوبکر رضؓ یہ دیکھ رہے تھے اور وجد کر رہے تھے اور وجد کر رہے تھے کہ حضور ؐ کی پیغمبرانہ شخصیت اپنی مکمل ترین رعنائیوں کے ساتھ ان کی نظروں ــــ تنہا ان کی نظروں کے سامنے جلوہ افروز ہے ــــ وہ انسان کامل کو ان لامتناہی بلندیوں پر دیکھ رہے ہیں جہاں انسان اور خدا کے درمیان سے زمین و آسمان کی ہر شے ہٹ گئی تھی اور پیغمبر ؐ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اسباب و علل کے تمام پردے اُٹھا کر خدا کی زبردست قدرت اس غار میں بے حجاب ہوگئی ہے۔

تین دن تک سچ مچ خدا کے سائے میں بسر کرنے کے بعد حضرت ابوبکر رضؓ آنحضرت کے نقوش پا چومتے ہوئے غارِ ثور سے باہر نکلے تو انھیں محسوس ہوا کہ یہ تنگ و تاریک غار نہیں بلکہ ایک ناپیدا کنار دنیا تھی جہاں قدم قدم پر خدا کی قدرت اور انسان کی بندگی کھُلی آنکھوں سے نظر آتی رہی تھی وہ غار میں ایمان بالغیب لیکر گئے تھے لیکن باہر آئے تو ایمان بالغیب صدیوں کا فاصلہ تین دن میں طے کر کے علین الیقین اور مشاہدے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جس انسان ؐ کو انھوں نے روح و دل کی شہادت سے نبی مانا تھا اس غار میں ان کی آنکھیں اس نبوت کا سراپا دیکھ رہی تھیں۔ غار سے باہر انھوں نے

جس خدا کا یقین کیا تھا غار میں وہ خدا خود اپنا یقین دلاتے ہوئے اپنی لامتناہی قدرت کے چہرے سے حجاب پر حجاب اُٹھا رہا تھا۔ لیکن شاید اس عرفان حق کی تکمیل میں ابھی ایک آنچ کی کسر باقی تھی ــــ ابھی ایک ایسا واقعہ بھی پیش آنا باقی تھا جہاں مجرم انسان کی طاقت اور خدائی طاقت کے درمیان غار کی دیواریں اور دنیا کی کوئی ظاہری رکاوٹ بھی حائل نہ ہو۔ پس منظر میں گرد و غبار کا بادل اُٹھا اور ایک زہرناک تلوار کی بجلی چمک کر سر پر آگئی۔ قریش کا ایک جنگ آزمودہ ہرکارہ سراقہ بن جعشم کے گھوڑے کی ٹاپوں سے زمین دہلنے لگی ــــ یہی تھا وہ بے رحم دشمن جس کو سو اونٹوں کا حقیر انعام ایک پیغمبر کا مقدس سر حاصل کرنے کی دھن سے پاگل کئے دے رہا تھا۔ خطرے کی زبردست بجلی سر پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی اور پیغمبرؐ کی جانِ گرامی اس بے پناہ خطرے کی ٹھیک زد میں آچکی تھی۔ محبت رسولؐ کے متوالے کو ایک بار پھر اس بیچارگی نے تڑپایا کہ میں خدا کی عظیم امانت کو بچانے کی کوشش میں بالکل بے بس ہوا چاہتا ہوں۔

"اے خدا کے رسولؐ!" وہ جاں نثاری کی حسرت میں پکار اُٹھے "دشمن سر پر آپہنچا ہے ــــ"

لیکن خدا کے رسولؐ کو خطرہ تو کیا خطرے کا یہ احساس بھی گوارا نہ ہوا۔ سکون دل نے ایمان و یقین کے جلال کی شکل اختیار کرلی اور فرمایا "اے ابوبکرؓ! تو کیا سمجھ رہا ہے ان دو کو جن کا تیسرا اللہ ہے؟" ــــ قدم قدم پر نبیؐ کی تصدیق کرنیوالے نے اسی دم نبیؐ کے اس اشارے کی تصدیق کی اور کامل سکون و اطمینان کے عالم میں ان کی نظر انسانی ساز و سامان سے ہٹ کر خدا کی قدرت پر مرکوز ہوگئی۔ انھوں

نے دیکھا کہ ادھر خدا کے رسول ؐ نے اپنے خدا کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے اور اُدھر زمین شق ہوئی اور سراقہ کے گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں اس کے اندر دھنستے چلے گئے مُنہ کے بل گرنے والا کافر اُٹھا۔ اُٹھکر چلا اور پھر گرا۔ آسمان والے کا اشارہ پاتے ہی زمین نے اس "مجرم" کو آگے بڑھنے کے لئے راہ دینے سے انکار کر دیا تھا جو بہت جلد "اعتراف جرم" اور پھر اعتراف حق تک پہنچنے والا تھا۔ بار بار مُنہ کے بل گرنے والا سراقہ اُٹھا اور ہاتھ جوڑ کر جان کی اماں مانگی۔ جو شخص ظاہری طاقت کے بل پر جان لینے کے لئے آیا تھا وہ خدا کی طاقت سے سہما ہوا خدا کے رسول ؐ سے زندگی کی بھیک دامن میں لئے واپس جا رہا تھا۔ دل سے خدا کو قادر مطلق ماننے والے بندۂ مومن نے آنکھوں سے دیکھا کہ خدا قادر مطلق ہے جس کے ایک اشارے پر سب کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کچھ جس کا تصور بھی آدمی پہلے سے نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد یہ قافلہ سوئے یثرب روانہ ہوا۔

"ہائے یہ قافلہ!" حضرت ابو بکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہ سوچ رہا تھا جس کو حضرت ابو بکرؓ نے راہ دکھانے کے اپنے اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا تھا۔ "ہائے یہ نرالا قافلہ جس میں دو انسان اور ایک خدا ہے! ـــ دنیا پوری قوت کے ساتھ اس قافلہ کا پیچھا کر رہی ہے لیکن اس کے نزدیک پہنچکر بھی اس کو چھو نہیں پاتی!" اور یہ قافلہ خدا کی قدرت و رحمت کی سیکڑوں نشانیوں سے گذرتا ہوا ـــ نفرت و انتقام کی شیطانی طاقتوں سے بچتا ہوا ۱۲ ربیع الاول ۱ نبوی میں یثرب سے کچھ فاصلہ پر قبا کے دامن میں پہنچا تو حق و صداقت کے

پروانے شمع رسالت پر نثار ہونے لگے۔ یہ تھے وہ لوگ جو خدا اور اُسکے رسولؐ کے قدموں پر جانیں نثار کرنے کی پُرسوز تمنا پر سردھن رہے تھے جنھوں نے خدا کیلئے ساری دنیا سے جنگ مول لی تھی۔ اپنی ساری دنیا داؤ پر لگادی تھی۔ لیکن ان پروانوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے زیادہ سپردگی و ایثار کی تپش سے سُلگتا ہوا پروانہ وہی شخص تھا جو ہجرت کی پرخطر گھاٹیوں میں رسالتؐ کے قدموں کو خونِ دل و جگر سے نکھارتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور جسکی زندگی کا ایک ایک سانس رسولِؐ خدا کی حفاظت میں سینہ سپر رہنے پر صرف ہوتا آیا تھا وہ یہاں بھی چادر تھامے ہوئے حضورؐ پر سایہ کئے ہوئے ساری دنیا سے منہ پھیر کر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین چہرے کو والہانہ سپردگی کے ناقابل بیان عالم میں تک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ تنہا اس "ایک چہرے" کو دیکھ دیکھ کر جی سکتا ہے ۔۔۔ جیسے اس چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہوجاتا ہے ۔۔۔ جیسے اسے خود اپنے وجود کی طرف بھی ایک نظر اُٹھانے کی فرصت نہیں رہتی۔

اور ۔۔۔ آج جب وہ چہرہ نظروں سے اوجھل ہے ہماری نظریں ایکبار پھر دنیا اور متاعِ دنیا کیطرف جم کر رہ گئی ہیں۔ اسلام کو خطرات میں گھرا ہوا چھوڑ کر ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کی پناہ گاہوں میں چھپ کر جان بچانے کی کوششیں کررہے ہیں ہمیں تمام مادی وسائل سے اُمیدیں ہیں لیکن اسی واحد ذات سے کوئی امید نہیں جو تمام امیدوں کا حقیقی ملجاؤ ماوٰی ہے کہنے کو دعائیں اسی سے کرتے ہیں لیکن عمل تمام تر ایسا ہی ہے جو اسکی رحمت و نصرت کو نہیں غیظ و غضب ہی کو آوازیں دیتا رہتا ہے۔ خدا کی پناہ! کہاں وہ اسلام جو گوشت پوست کے انسانوں کو ایک سجدہ مسلسل میں ڈھال گیا تھا اور کہاں یہ ہمارا اسلام جو پیہم بغاوت اور نافرمانیوں کی ایک غیر مختتم کہانی ہے (تجلی ستمبر ۶۳ء)

للّٰہیت کا پروانہ

جب تمہیں اپنے کسی بھائی کا سانحہ غم یاد آئے ——
تو اس وقت یاد کرو تم اپنے بھائی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو —— ان
کارناموں کی بنیاد پر جو انہوں نے سرانجام دیئے۔ نبی ؐ کے بعد وہ
ساری مخلوق کا نچوڑ تھے —— خدا سے ڈرنے میں بھی اور خلق خدا سے
انصاف کرنے میں بھی۔ اور انھوں نے جو ذمہ داری اٹھائی اس کو اس طرح
پورا کر دکھایا کہ اس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں۔ وہی ہیں وہ "ثانی"
جن کا نام فوراً حضور ؐ کے بعد آتا ہے اور دشواریوں میں ان کی رفاقت
کو سراہا گیا ہے اور —— وہی ہیں وہ پہلے شخص جس نے سب سے پہلے
رسولوں کی تصدیق کی —"

آغاز اسلام کے چشم دید گواہ، شاعر اسلام حضرت حسان ؓ بن ثابت
نے کبھی یوں حضرت ابوبکر ؓ کے گن گائے تھے۔ یہ شاعری نہیں ٹھوس حقیقت
تھی۔ ٹھوس تاریخ تھی کہ "حقیقت" جیسے ہی ان کے سامنے آئی اس
کے خیر مقدم اور پذیرائی میں انھوں نے فی الفور اپنا سینہ کھول دیا، دل چیر کر

رکھدیا۔ حقیقت کے علم اور اعتراف کے درمیان یہاں سرے سے کوئی فاصلہ ہی نہیں جیسے سورج کے طلوع اور روشنی کے پھیلاؤ میں کوئی فاصلہ نہیں۔ تین سو ساٹھ ۳۶۰ پتھروں کو معبود ماننے والوں کی بھیڑ میں کھڑے ہو کر انہوں نے جوں ہی حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے معصوم ترین ہونٹوں سے یہ سنا کہ "کوئی معبود نہیں لیکن خدائے یگانہ!" اس دم انہوں نے اس عظیم ترین حقیقت کی زبردست سنسنی محسوس کی کہ خدائے زندۂ جاوید۔ خدائے یگانہ سچ مچ انسان کی رگ جاں سے بھی نزدیک تر ہے۔ نظریں اس کو نہیں چھو سکتیں لیکن وہ تمام تب و نظر کی گہرائیوں تک کو چھو لیتا ہے ــ اور انسانی ہستی کے ظاہر و باطن پر اس کی ہستی راج کرتی ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے گہرے دوست کی حیثیت سے ہمیشہ ان کے دوش بدوش چلنے والے ابو بکر رضی تھے۔ جیسے ہی آں حضرت کی زبان مبارک پر رسالت کا مقدس دعویٰ اُبھرتا ہوا سُنا۔ وہ ایک غلام کی شان عجز و انکساری کے ساتھ خدا کے آگے جھکے اور خدا کے رسول کے نقوشِ پا چومنے کے لئے برابر سے ہٹ کر ان کے پیچھے آ گئے۔ دوستانہ برابری کے سالہا سال کے ․ بجہ کو رسالتِ محمدی میں فنا کر دینے کا یہ پر شوق منظر دیکھنے کی چیز تھا۔ خدا جانے خود اس شخص کے جذبات سپردگی کا کیا عالم ہو گا کہ جس کو دیکھنے والے شمع رسالت کے پروانے بن گئے۔ سوز توحید و رسالت کے اس منظر کو دیکھ دیکھ کر سراپا سوز و گداز ہو گئے اور کتنے ہی مکّے کے قیمتی لال خدا کے رسول کی طرف پروانہ وار بڑھے اور اس

شمع حیات کے گرد طواف کرنے لگے۔ ان میں زبیرؓ بن عوام تھے عبدالرحمٰنؓ بن عوف تھے۔ عثمانؓ بن عفان تھے۔ سعدؓ ابن ابی وقاص تھے۔ طلحہؓ بن عبیداللہؓ تھے۔ اور نہ جانے دوسرے کتنے ہی وہ حق پسند جلیل القدر انسان جو اسلام کے افق پر مہر وماہ بن کے چمکے اور زیر زمیں جانے کے بعد بھی آج تک تاریخ کی وسعتیں ان کے نور سے جگمگا رہی ہیں۔

حق و صداقت کی طرف بڑھنے والے اس عظیم انسانی گروہ پر جہاں رسالت ﷺ کی مقناطیسی شخصیت سحر حلال کا اصل کام کر رہی تھی وہاں ان کے جذب وجنوں کی آگ بھڑکانے میں ابو بکرؓ کی شان صدیقیت کا بھی حصہ تھا۔ اس لئے خدا کے آخری پیغام کی اس اولین تصدیق کا صدیقی کارنامہ درحقیقت ایک عظیم ترین — لامتناہی احسان ہے ان تمام پاک روحوں پر جو شروع سے آج تک خدا اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان لائیں اور جو رہتی دنیا تک ایمان لاتی رہیں گی۔ ابو بکرؓ کا ایمان لانا ایک فرد واحد کا ایمان لانا نہ تھا بلکہ ان کی شخصیت کی آڑ میں درحقیقت وہ تمام خوش قسمت انسانیت ایمان لائی تھی جس کی تقدیر میں اپنے خالق اکبر کا دیدار اور محمد ﷺ کی شفاعت لکھی ہوئی ہے ان کے ایمان ویقین میں پوری نوع انسانی کا ہمہ گیر سوز وگداز سمٹ آیا تھا۔ ان کے دل میں آدمؑ کے تمام مؤمن بیٹوں اور حواؑ کی تمام مؤمنہ بیٹیوں کے کروڑوں دلوں کی بے قرار دھڑکنیں یکجا ہوگئی تھیں۔

رسولِ خدا کے سینے پر جو وحی نازل اور ہونٹوں پر بلند ہو رہی تھی ابو بکرؓ کا پورا وجود اس کے سانچے میں ڈھلتا جا رہا تھا اور ان کے گھر کے صحن میں ان

کی چھوٹی سی عبادت گاہ سے حقیقت کی پر سوز صدائے بازگشت نشر ہو رہی تھی۔ شام اور یمن کی راہوں پر جو شخص اسباب تجارت کا بوجھ اٹھائے نظر آتا تھا۔ آج اس کے شانوں پر خدا کے عرش سے اتری ہوئی اس بلند ترین حقیقت کا بوجھ تھا جس کو اٹھانے کے تصور سے ہی سمندروں کا بے قرار سینہ چاک چاک اور پہاڑوں کا جگر پانی پانی ہو گیا۔ ریگستان کے تپتے ہوئے سرخ و سوزاں ذروں نے دیکھا کہ وہ خدا کا یہی پیغام گھر گھر پہنچانے کی دھن میں تلوؤں سے لہو ٹپکاتا پھر رہا ہے تو رات کو آسمان کے ان گنت تاروں نے دیکھا کہ اس کا پورا وجود خدائے واحد کے قدموں میں پڑا ہوا درد مندگی سے سلگ اور سسک رہا ہے اور ہونٹوں پر قرآن کی لاہوتی آواز اس کے آنسوؤں سے تر بتر ہو کر اٹھتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ریگ اور پہاڑوں کی سرزمین مکے پر خونین آنسوؤں کی بوچھار ہو رہی ہے پتھر کے بے حس پجاریوں کا دل سینے سے نکلا جا رہا ہے اور مردوں اور عورتوں اور بچوں کی بیقرار بھیڑ اس کی دیوار تلے بکھری ہوئی اس نالہ نیم شبی پر سر دھن رہی ہے جس کو یہ دنیا بے سمجھے نہ رہ جائے اور سمجھ جائے تو فرط شوق سے مر جائے!

شعلوں کی دہکتی ہوئی سیج کی طرح جھلسا دینے والی ریگستانی راہوں پر دو انسان ہر جگہ ساتھ دیکھے گئے! ان میں ایک وہ شخص تھا جس کی امانت و دیانت اور صداقت کی قسم چالیس سال سے مکے کی گلی گلی میں کھائی جا رہی تھی۔ تو دوسرا وہ تھا جس کو بالتوش شراب ہوں کے کافر مکے نے کبھی ایک بار بھی نشے میں نہیں دیکھا تھا مجھ اپنے خدا کے اشاروں پر جوانوں اور وحشی ترین

انسانوں کی اونچی نیچی دنیا میں جد بھر سے نوائے حق بلند کرتے ہوئے گذرتا
ابوبکرؓ کی بے قرار آواز پیچھے پیچھے بلائیں لیتی، لرزتی اور وجد کرتی ہوئی آتی:۔

"میں گواہی دیتا ہوں!۔۔۔ اے دنیا میں گواہی دیتا ہوں!۔
میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس آدمی کی رگوں میں قریش کا بہترین
خون ہے۔ اس کے قلب و روح میں سوائے نور کے کچھ نہیں
۔۔۔ اس کے کردار میں امانت و صداقت کے جوہر کوٹ کوٹ
کر بھرے ہیں۔۔۔ میں ایک دو دن نہیں چالیس سال سے
اس کی زندگی کے دن اور رات دونوں دیکھتا آیا ہوں اور
اس کی شخصیت کو ہر وقت اپنی حدِ نظر سے زیادہ اونچا پایا
ہے۔ میں کیسے بتاؤں یہ کتنے اچھے ہیں۔ کتنے سچے ہیں۔۔
میں ان کی صداقت کی گواہی دیتا ہوں۔۔۔ اے لوگو! میں
گواہی دیتا ہوں۔۔۔۔"

توحید و رسالت کی درد بھری آواز سینۂ رسولؐ سے اٹھتی اور شہادتِ حق کا صدیقی نعرۂ مستانہ خونِ دل و جگر ٹپکاتا ہوا ساتھ آتا۔ ساری دنیا ایک ساعت کے لئے سکتے میں آجاتی!۔ آخر آخر سنگدلوں نے ان دونوں کو گھوم کر دیکھا خود پرستوں کے کان کھڑے ہوئے!۔۔۔ اور انسان کی جھوٹی خدائی کی ناپاک زنجیروں میں جکڑے ہوئے کتنے ہی غلاموں اور لونڈیوں نے آنکھ میں آنسو بھر کر سسکی لی:۔

"ہائے! کیسی دل کش ہے یہ آواز کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔

کاش ہم اس آواز پر تن من دھن نثار کر سکتے کاش خدا کا کوئی بندہ ہمیں انسانی غلامی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کرا سکتا!"

یہ پکار خدا کے اسی بندے کے کان میں پڑی جس کا نام ابوبکرؓ صدیق تھا۔ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور عمر بھر کے خون پسینے کی گاڑھی کمائی بے دریغ خرچ کر دی ان بیکسوں اور غلاموں پر جن سے ان کا خون نہیں سفاکانہ کا نہیں، خالص ایمان کا رشتہ تھا۔ ایک رشتہ اخوت جس میں اپنے اور بیگانے کا کوئی امتیاز نہیں۔ جہاں کسی سے کچھ لینے کے لئے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ جہاں دینے والا لینے کو ہر دروازے کو یہ کہہ کر اپنے ہاتھوں سے بند کر دیتا ہے کہ "تم سے مجھے کسی اجر و صلہ کی طلب نہیں۔ میری مزدوری میرے رب کے ہاتھ میں ہے"!! خدا کے نہ ماننے والوں نے بھی کبھی ان غلاموں کو خریدا تھا تاکہ اپنی جھوٹی خدائی کا کھلونا انکو بناکر سینہ پھلا سکیں اور غرور سے سر اٹھا سکیں ابوبکرؓ جیسے اللہ والے نے بھی ان غلاموں اور لونڈیوں کو منہ مانگے دام دیکر خریدا تھا لیکن صرف اس لئے کہ خدا کے بندوں اور بندیوں کو خدا کی بندگی کی آزادی دلا کر توحید کے آستانے پر جھکا دیں اور ساتھ ساتھ خود بھی سجدہ شکر میں گر جائیں۔ ان گلو خلاصی پانے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ہاں ان میں بلالؓ حبشی تھے۔ عامرؓ بن فہیرہ تھے ان میں نذیرہؓ تھیں۔ نہدیہؓ اور جاریہؓ تھیں۔ محمد مصطفےٰ کے فیض نظر نے یہ ابوبکرؓ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟۔ وہی ابوبکرؓ جو بنی تیم کے ایک کامیاب سوداگر کی حیثیت سے کبھی سونے چاندی سے دنیا کے سازوسامان

کا موں قول کیا کرتے تھے آج وہی ان کی دولت تھی جس کے عوض وہ دنیا نہیں جنت خرید رہے تھے ـــــ خدا کی خوشی خرید رہے تھے!

حق و صداقت کے جاں نثاروں کا قافلہ بڑھتا گیا۔ اور حق و صداقت سے چڑنے والوں کی مکروہ تیوریاں چڑھتی گئیں۔ دعوۂ حق کرنے والوں کے مقابلے میں اب ظلم و ستم کی قہرمانیت پوری طرح حرکت میں آچکی تھی۔ اب خدا کا نام وہی لے سکتا تھا جس نے سر سے کفن باندھ لیا ہو اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی ہو اس مقام پر کیسا عظیم ثبات تھا رسولِ خدا اور ان کے نام لیواؤں کے قدموں میں! زبانوں کے تیر و نشتر سہنے کے لئے گھائل سینے بے تکلف کھلے ہوئے تھے۔ بھوک اور پیاس کی شدت میں آگ کی طرح جلتی ہوئی زمین پر گھسیٹے جانے کے لئے غلام اور لونڈیاں تک وادیِ خطر میں بے جھجک کود پڑی تھیں جہاں قدم قدم پر ہلاکت کی دھمک تھی۔ موت کی خوفناک چاپ تھی۔ بے حسی اور سنگدلی کی تاریکی میں درندوں کی طرح شعلہ بار آنکھیں تھیں ـــ مظلوموں کا خون ٹپکاتے ہوئے کرخت ہاتھ تھے۔ اور کھوپڑیوں سے کھیلنے والی بے رحم ٹھوکروں کی باڑھ تھی۔ وہاں قدم قدم پر خدا کے نام پر سر دھڑ کی بازی لگانے والے پروانوں کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے۔ اور اس کاروانِ عشق کی چوٹی پر خدا کے رسولؐ کے قدموں کو جو شخص زخمی اور پیاسے ہونٹوں سے چومتا چلا آرہا تھا وہ ابو بکرؓ صدیق ہی تھا ـــ ہائے اے ابو بکرؓ! خدا کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں آپ کی جان پاک پر کہ خدا اور رسولؐ پر فدا ہونے والوں نے ہمیشہ آپ کو فداکاری کے نقطۂ عروج پر ہی دیکھا۔

وہاں دیکھا جہاں کوئی نہ تھا۔ جہاں فداکاری و سرفروشی کی ساری رفعتیں اپنی آخری حدوں کا اعلان کر رہی تھیں۔

جب دنیا نے یہ منظر دیکھا کہ مکہ کے بچے بچے سے اپنے لئے "امین و صادق" کا خراج لینے والا عامیوں اور راہگیروں تک سے گالیاں سن رہا ہے اور جسم نازک پر چوٹ پر چوٹ کھا رہا ہے لیکن اس کے باوجود اپنے اعلان حق پر بڑوں کا توں اٹل ہے جب دنیا نے دیکھا کہ یہ ثابت قدم داعئ حق خانہ کعبہ میں خدا کا پیغام بلند کرتے ہوئے جراحتوں اور چوٹوں کی گود میں بے ہوش کر کے گرا دیا گیا تو دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ اس وادئ قہر و خطر میں بے والہانہ کود کر جس شخص نے درد بھری چیخ ماری وہ خدا کی قسم ابوبکر صدیقؓ کے سوا کوئی نہ تھا پیغمبر پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑنے والوں پر وہ بجلی بن کر گرا اور للکارتے ہوئے کہا:

تمہیں خدا سمجھے اے لوگو۔ کیا تم اس پاکباز رسولؐ

کی جان ہی لے لو گے جس کی خطا بس یہ ہے کہ وہ خدا کو

اپنا خدا کیوں کہتا اور کہلانا چاہتا ہے بس؟

ایک بار نہیں۔ ایسا ہی واقعہ دوبارہ ہوا۔ اور دونوں بار لوگوں نے دیکھا کہ عشق الٰہی اور حب رسولؐ کا پروانہ تلوار کی دھار پر رقص کر رہا ہے۔ "ظلم و ستم" کو ظلم و ستم کہنے والے پر ظالموں کی وحشی بھیڑ ٹوٹ پڑی اور خون آشامی کے بل پر بندۂ حق کو بے ہوش کر دیا گیا تو اس کی صدائے حق خاموش ہوئی۔ لیکن جو لوگ اس کی زندہ لاش کو کاندھوں پر اٹھا کر اس کے گھر لائے انھوں نے اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا کہ جوں ہی اس کو ہوش آیا

تو اپنا نہیں اس کو سب سے پہلے محمد مصطفےٰ کا ہوش آیا تھا۔ اس نے آنکھ کھولی تو اپنے زخموں پر نظر نہیں کی۔ زبان کھولی تو درد بھری کراہ نہیں بلند کی۔ اس نے تو ماں کے لئے بے قرار بچے کی طرح یہ سوال کیا:۔

"خدارا یہ بتاؤ کہ رسولِ خدا کیسے ہیں اور کہاں ہیں؟ خدا کے لئے مجھے جلدی سے اٹھاؤ اور حضور کے قدموں میں لے جاکر ڈال دو۔ میں اپنی آنکھوں سے اُن کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔"

خدا ہی جانے اس انسان کامل۔۔۔ خدا کے بندے اور رسول کی شخصیت کیا چیز ہوگی جس کے ناوکِ کرم سے گھائل ہونے والے، اپنے زخموں کو اس طرح پیار کرتے تھے۔۔۔ جس کو ان عظیم انسانوں نے دیوانہ وار چاہا جو خدا کے سوا کسی کو نہ چاہتے تھے۔۔۔ خدا اور خدا کے رسول کے لئے ابوبکرؓ صدیق نے سچ مچ اپنا سب کچھ نثار کیا۔ بنو تیم کا یہ خوش حال اور معزز ترین فرد جس کو کبھی لوگ جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے اب وہی اس پر بڑھ بڑھ کر وار کر رہے تھے۔ تین سو ساٹھ بتوں کے سامنے خانۂ کعبہ میں اس کو جسمانی مار دی گئی اور اس کے خاندانی وقار کی دھجیاں اڑانے کی ناپاک جسارت کی گئی، لیکن دنیا کے ہر اعزاز کے مقابلے میں ابوبکرؓ نے غیرتِ بندگی کی لاج رکھی۔ حُبِّ رسول کا نام روشن کیا اور عظمتِ توحید کا سکہ بٹھانے کیلئے اپنی پوری زندگی کو خاک میں ملا دیا۔ جب ناپاک ہاتھوں نے ان کی عزت و آبرو پر دست درازیاں کیں تو انھوں نے فخر و مسرت سے بیتاب ہو کر سجدے میں

سر رکھ دیا کہ خوش قسمت ہے وہ شخص جس کی جان جان آفرین کے کام آئے — جب غلاموں اور لونڈیوں کو خدا کے حوالے کر دینے کے لئے دنیا نے ان سے کہا کہ :۔

"دام پیارے ہیں یا خدا کا نام ؟— دعوت بندگی کا ثبوت ہم زبان سے سُن چکے اب تمہاری جیب سے لینا چاہتے ہیں ؟

اور خدا کا نام لینے والے نے فوراً منہ مانگے دام پیش کر دیئے غلاموں اور لونڈیوں کو خریدا اور اسی دم یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ :۔

"تمام انسان خدا کے بندے اور آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے ۔ جاؤ بندگی کی پیاس سے سلگتی ہوئی پیشانیاں لئے ہوئے اسی کے در پر جھک جاؤ جس کے در پر میں خود جھکا ہوا ہوں اور جس در کے سوا کوئی دہلیز اس قابل نہیں کہ اشرف المخلوقات اس کے آگے اپنی پیشانی ٹیک سکے۔"

تنے ہوئے گھونسے اور بپھری ہوئی ٹھوکریں اُبھریں اور خدا کا نام لینے والے سے کہا :۔

"خدا کا نام پیارا ہے یا خاندانی نام و نمود ؟— یاد رکھو کہ خدائے واحد کا نام لو گے تو اس تمام عزت و شوکت سے ہاتھ دھونا ہو گا جو بنو تمیم کے معزز گھرانے کے ایک معزز ترین فرد کی حیثیت سے تمہیں آجتک حاصل رہی ہے "

ابوبکرؓ نے نام سے نام خدا پر دنیا بھر کی ٹھوکریں کھانا قبول کیا۔ آخرت

کی سرخروئی کی چاہ کو زمین کی ذلت و عقوبت کا کوئی خطرہ ذرا بھی تو نہ سہار کا لیکن جیسے ہی دنیائے کفر و شرک نے ان کی متاع ایمانی پر دست درازی کرنی چاہی اور خدا کا نام لینا دشوار کر دیا تو گھر اور وطن ان کو شیطانی قید خانہ معلوم ہونے لگا جہاں سے دامن بچا کر وہ جنگلوں چڑھ جاتے اور دیس بدیس کی ٹھوکریں کھانے کی آرزو کرنے لگتے۔

"اے خدا کے رسولؐ!" اُنھوں نے ماہیٔ بے آب ہو کر عرض کیا:۔
"دیکھ رہیں ہیں آپ؟ --- یہ دنیا اب میرے ہونٹوں کو سی دینا چاہتی ہے اور مجھے مجبور کر رہی ہے کہ خدا کی بندگی میں آجانے کے بعد خدا کا نام لینا چھوڑ دوں۔ خدارا اجازت دیجئے کہ اس وطن اور گھر بار کو چھوڑ کر جینے کے لئے کوئی ایسا گوشۂ عافیت ڈھونڈ نکالوں جہاں میری زبان آزادی سے خالق اکبر کا نام پکار سکے۔"

حضورؐ نے دیکھا کہ ابو بکرؓ کا تمام جسم جراحتوں اور چوٹوں سے پاٹ دیا گیا ہے۔ حضرت طلحہؓ بن عبداللہ کی روح میں ایمان کی جوت جگانے کے "جرم" میں ان کے چچا نوفل بن خویلد نے طلحہؓ کے ساتھ ابو بکرؓ کو جو دردناک جسمانی مار دی ہے اس کی چوٹوں کے نشانات ان کے جسم پر جگہ جگہ نمودار ہے ہیں۔ حضورؐ نے دیکھا کہ خدا کی راہ میں زخم پر زخم کھانے والا ترک وطن کا ایک اور زخم کھانے کے لئے کس درجہ بے تاب و بے قرار ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ان کو اجازت دیدی کہ تم اگر اسی پر مُصر ہو کہ خدا کے لئے ساری دنیا چھوڑ دو تو خوشی سے سوئے حبشہ ہجرت کر سکتے ہو۔

حضرت ابو بکرؓ نے مکے کے در و دیوار پر حسرت بھری نظر ڈالی ۔ کیسا سخت وقت تھا کہ گھر بار، وطن اور اہل وطن چھوٹ رہے تھے ۔ سب سے زیادہ یہ کہ خدا کا رسولؐ چھوٹ رہا تھا، لیکن کیسا حسین تھا یہ وقت جب خدا کی طرف بڑھنے والے بندے نے محسوس کیا کہ اس کا خدا خود بھی بہ نفس نفیس اس عاجز و درماندہ بندے کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ وہ ایک قدم بڑھتا ہے تو خدا اس کی طرف دس قدم آگے بڑھتا ہے ۔ اور وہ تیز چلکر جاتا ہے تو خدا اپنی عظیم رحمت کے ساتھ بندے کی پذیرائی میں دوڑتا ہوا آتا ہے!۔ کوئی بتاؤ آخر وہ کونسا اعزاز ہے جس کی آرزو اور جس کا تصور اس بندہ نوازی کے بعد کیا جا سکے ؟ ہزاروں وطن ۔ ہزار بار تصدق ایسی بے وطنی پر جس کے قدموں کی دھول میں جنت گری پڑتی ہو -- ہزاروں دنیائیں ہزاروں بار قربان اس بے کسی اور غریب الدیاری پر جہاں ساری خدائی چھوٹ رہی ہو اور خدائے قدر داں مل رہا ہو! ۔ یہی تھی وہ جاں نواز حقیقت جو اس وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے جسم و جاں میں رچی ہوئی تھی -- وہ گھر کے ٹھنڈے سائے اور وطن کے زندہ مناظر سے کٹ کر چلتے ہوئے ریت کے ٹیلوں کے درمیان یکہ و تنہا قدم قدم پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ہرگز تنہا نہیں -- یہاں بھی کوئی ان کے ساتھ ہے ۔ وہی "کوئی" جس کے بعد کسی کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔

آگ برساتے ہوئے ریگستان کیف و سرخوشی سے وجد کرتے ہوئے مومن کو ایک کافر "نے دیکھا تو حیران رہ گیا ۔ یہ قارہ کا سرمایہ دار ابن الدغنہ

تھا۔ اس نے سوچا کہ بنو تمیم کا یہ معزز سوداگر آج کس سفر پر چلا جا رہا ہے جہاں نہ اس کے ساتھ تجارت کا ساز و سامان ہے اور نہ کوئی رفیق سفر۔ لیکن پھر بھی اس کے بشرے سے وہ خوشی اور بے نیازی کا نور ٹپک رہا ہے جیسے تمام دنیا کی حکمرانی اس کو مل گئی ہو۔

"اے ابو بکرؓ کہاں چلے!" حیرت و استعجاب کے ساتھ رئیس قارہ نے سوال کیا۔

"قوم نے مجھے وطن سے نکال دیا ہے۔ اب مجھے خدا کی زمین پر ایک ایسا کونہ ڈھونڈ نکالنا ہے جہاں میں آزادی سے خدا کی پرستش کر سکوں۔"

حضرت ابو بکرؓ کی آواز میں دل کی چوٹ اور ایمان کی جاں نواز حلاوت تھی۔ ایمان کیسا بے پناہ تھا یہ منظر ایک کافر کے سرد و سیاہ سینہ میں انسانیت کا سوز جاگ اٹھا۔ درد کی ایک اشک آلود ہنسی اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ جذبات سے بوجھل آواز میں ایک کافر کے منہ سے یہ الفاظ نکلے :۔

"نہیں اے ابو بکرؓ! میں تمہیں کبھی نہ جانے دوں گا۔ تم بیکسوں کی مدد کرتے ہو — بے نواؤں کی پکار سنتے ہو — مہمانوں کے لئے فرش راہ ہوتے ہو — نہیں! — میں تمہیں نہ جانے دوں گا! — آؤ میرے ساتھ واپس چلو — میں عہد کرتا ہوں کہ تم میری امان میں رہو گے اور تمہیں خدا کی عبادت کرنے سے کوئی نہ روکے گا۔"

وہی جسے کفر و شرک نے دیس سے نکل جانے پر مجبور کیا تھا ہاں اسی کو پھر دیس میں واپس لانے کیلئے وہی کفر و شرک اس کے پاؤں پڑ رہا تھا ۔ یہ کفر صدائے شکست تھی ایمان و اخلاق کا اعلان فتح و ظفر تھا ۔ یہ خدائے بندہ نواز کی قدرت کا ایک اشاریہ تھا ۔

ابوبکرؓ پھر ایک نئی شانِ خودداری کے ساتھ اس طرح واپس آئے کہ قارہ کا دولت مند سردار ابن الدغنہ ایک ہرکارے کی طرح قریشی سرداروں میں گھوم پھر کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ :-

"میں اپنی امان میں ابوبکرؓ صالح کو واپس لایا ہوں ۔ اے لوگو! تمہیں غیرت آنی چاہئے کہ تم ملکے کو ایک ایسے بھلے مانس سے خالی کر دینا چاہتے ہو جو غمزدوں کی ہمدردی کرتا اور دکھیاروں کا دکھ درد میں جان و مال سے حصہ لیتا ہے "

کچھ دن یہ لوگ اس توقع کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتے رہے کہ ایک بار ملک بدر ہو جانے والا دوسری بار جلا وطن ہونے کے ڈر سے اپنے طرز عمل میں کوئی احتیاط ۔ کوئی تبدیلی پسند کرتا ہے کہ نہیں ؟ انھوں نے دیکھا کہ ابوبکرؓ کا نالۂ نیم شبی ہر رات اس کی "گھریلو مسجد" سے پوری قوت کے ساتھ بلند ہو رہا ہے تو خدا کو بھول کر میٹھی نیند سونے والے کافروں کے دل ہل رہے ہیں جو آواز کبھی گھر سے باہر مکہ والوں کو ڈھونڈتی پکارتی پھرتی تھی اب وہی آواز گھر کے اندر سے یوں بلند ہوتی ہے کہ دنیا اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے ۔ قریشی سرداروں کا وفد ابن الدغنہ سے ملا اور اعلان کر دیا کہ اب ابوبکرؓ کو گھر کے

سے اندر رہتے ہوئے خدائے واحد کا نام بلند کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔
ابن الدغنہ نے قریشی سرداروں کے غضبناک تیور دیکھے تو ہانپتا کانپتا ہوا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا:۔

"کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو؟ — خدا کا نام لے لیکر تم سارے مکہ کو خفا کئے دے رہے ہو مجھے خطرہ ہے کہ اس طرح میں بھی تمہیں پناہ دینے کے عہد کو برقرار نہ رکھ سکوں گا۔"

یہ اعلان ایک زبردست دھمکی تھی یہ دھمکی اس زلزلہ کی دھمک تھی کہ مکے میں خیریت سے رہنا چاہتے ہو تو خدا کی اعلانیہ پرستش سے باز آجاؤ — ورنہ یہ طے ہے کہ تمہیں مسل ڈالا جائے گا۔ لیکن وہ مؤمن جو خوب جانتا تھا کہ زلزلہ محشر کیا چیز ہے اور دوزخ کے آتشیں تصور میں کس بلا کی ہولناکیاں ہیں اس نے کمال شان استغناء سے ابن الدغنہ کی باتوں کو سنا، ابن الدغنہ کے وہم و گمان پر سکتہ سا چھا گیا جب اس نے اپنے کانوں سے ابوبکرؓ کی بے نیاز آواز سنی:۔

"مجھے تمہاری پناہ درکار ہی نہیں ہے — میرے لئے خدا اور خدا کے رسولؐ کی پناہ بالکل کافی ہے۔"

یا معبود! تیری اس دنیا میں کبھی خدا پر ایمان لانے والا دنیا پر بے نیازی سے لات مار کر خطرات کے منجدھار میں یہ اعلان کر سکتا تھا کہ "اس کو کسی کی پناہ درکار نہیں — اس کے لئے تو خدا اور خدا کے رسولؐ کی پناہ کافی ہے۔" لیکن آج

ہمارے تصورات اس بات کو سوچ کر شل ہو جاتے ہیں کہ "کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ کیا خدا پر ایمان لانے والا خدا پر اس طرح عملی بھروسہ کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟" لیکن کاش ہم سوچ سکتے کہ یہ باتیں سوچنے کی نہیں۔ کر گذرنے کی ہیں۔ خدا پر بھروسہ کا لطف اٹھایا ہی تب جا سکتا ہے جب خدا کے لئے خطرات کو قبول کرنے کی جرأت دکھائی جائے۔ آگ اسی وقت پھولوں کی سیج بن سکتی ہے جب کوئی ابراہیم خدا کا نام لیکر آگ میں کود پڑے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ خطرہ مول لینے سے پہلے خدا کی پناہ گاہ کا دروازہ ہمارے لئے چوپٹ کھول دیا جائے۔ آگ کے شعلے پہلے لالہ و گل میں ڈھل جائیں۔ پھر ہم اللہ اللہ کرکے اس میں کود پڑیں۔ سچے مومنوں نے کبھی یوں نہیں سوچا۔ اور ہم ہمیشہ ہر وقت کچھ اسی طرح سوچ رہے ہیں!!

تجلی جون ۶۳ء

خدا کی سمت میں کشاں کشاں زندگی

ہر شخص اس دنیا میں صبح کی پو پھٹتے ہوئے دیکھتا ہے کہ موت اس کے تسمۂ پاپوش سے بھی نزدیک تر ہوتی ہے۔

یہ تھا عربی کا وہ شعر جس نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاک ہونٹوں پر شدت جذبات میں جیسے دیپک راگ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب وطن، گھر بار اور خود اپنی زندگی کی ساری دلی چاہتیں خدا اور رسولؐ کی چاہت پر نثار کر دینے کے بعد مدینہ کی ناسازگار آب و ہوا میں وہ بیماری کی مسلسل کڑی آزمائش جھیل رہے تھے۔ صحت تھی کہ دن بدن بگڑتی جا رہی تھی، لیکن ایمان و عمل کے گیسو کچھ اور سنور رہے تھے۔ جسم سوئے قبر گرتا نظر آ رہا تھا مگر اللہ سے بچھڑی ہوئی رُوح کی زبردست بیتابیاں اس اللہ کے بندے کو جیسے زمین و آسمان سے آگے تیزی سے وہاں اُڑائے لئے جا رہی تھیں جہاں اس کائنات کی کسی نامعلوم خلوت میں مخلوق اپنے خالق اکبر سے ملاقات کرنے والی ہے۔ یہ تھے وہ نرالے دیدۂ و دل جو ایمان بالغیب کی انوکھی روشنی میں قریب زندگی کے ہر کہر کو چیرتے ہوئے زندگی کے یقینی انجام کو جوتے کے تسمے سے بھی نزدیک تر دیکھا کرتے جو عام حالات میں اس وقت بھی نظر نہیں آتا جب موت بالکل سر پر آ کھڑی ہو۔ کون جانے کہ یہ موت کی قربت کا محض ایک احساس ہی تھا یا جہاد زندگی کے تھکے ماندے مسافر

کے قدموں کو اس کی منزلِ فلاح نے خود آگے بڑھ کر قدم چوم لیا تھا۔ ان کو ہرگز یہ غم نہ تھا کہ یہ دنیا چھوٹ رہی ہے جو ہزاروں حسرتوں اور تعلقات کی شکل میں ہمارے گوشت پوست میں رچی بسی ہے۔ ان کو تو یہ خوشی تھی کہ وہ سچ مچ جس کے ہو اُسی کے پاس چلے جا رہے ہیں۔ کھینچے چلے جا رہے ہیں یہی تھا وہ وجد انگیز احساس جس نے جسمانی دُکھ درد کی ہر کراہ کو بھلا کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو وارفتگی کے عالم میں یہ شعر گنگناتے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

رسول خدا کو اس صورت حال کا پتہ چلا تو شافئ مطلق کے اس مریض کو خود شافئ مطلق کے حوالے کرتے ہوئے اس کے درد کا درماں کرنے کی بے قرار دعا کی۔

• اے اللہ! تو مکہ کی طرح —— یا اس سے بھی بڑھ چڑھ کر —— مدینہ کا پیار ہمارے دلوں میں ڈال دے۔ اس کی آب و ہوا کو روگوں سے پاک فرما دے اس کی پیداوار کے پیمانوں میں برکت عطا فرما اور اس کے وبائی بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔"

مقدس سینے سے نکلی ہوئی پکار فرش سے چلی اور سیدھی عرش تک پہنچی۔ مدینہ کی آب و ہوا میں انقلاب برپا ہو گیا —— دلوں کی گہرائیوں میں وطنی جذبات کی کایا پلٹ گئی اور مدینے کے پیارے سینوں میں ذوق و شوق کی ہلچل ڈال دی۔ وہ مریض جو بستر علالت کی شکن بن گئے تھے محسوس کر رہے تھے کہ ان میں نئے سرے سے جان پڑ گئی ہے وہ جس لئے کمال یقین

کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ "مجھے کسی کی پناہ نہیں چاہیئے ۔ میرے لئے خدا اور رسول ؐ کی پناہ کافی ہے" ہاں اس کے لئے خدا اور رسول ؐ کی پناہ بہر حال کافی وشافی ثابت ہو کر رہی ۔ حضرت ابو بکر رضؓ بستر علالت سے ایک حیاتِ تازہ کی جولانیاں لئے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور خدا سے بچھڑی ہوئی روح رسولؐ خدا کے پر سکون پہلو میں کھڑی ہو کر فرض کے محاذ پر چٹان بن گئی ۔

نئی صحت ، نئی زندگی ، سارے جگ سے نرالی اخوت اور تازہ دم سدا بہار ایمان کے رنگ و نور سے وادی یثرب میں " مدینہ " نام کی جوارضی جنت تعمیر ہو رہی تھی اب وہاں خدا کا گھر تعمیر ہونا تھا ۔ مسجد کی عمارت کے لئے جو جگہ سب سے زیادہ موزوں نظر آئی وہ کچھ یتیموں کی ملکیت تھی ۔ یتیموں کا دل شوق سے مچل گیا کہ یہ خدائی اعزاز ان کے حصے میں آرہا ہے ۔ انھوں نے کوئی قیمت لینے سے انکار کر دیا ۔ لیکن یتیموں کے بہترین والی اور بیکسوں کے سب سے بڑے غمخوار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھلا یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ معاوضہ دیئے بغیر ان یتیموں کو ان کی اس ملکیت سے محروم کر دیا جائے ۔ انھیں تو یہ فکر تھی کہ انسان کی جھولی میں دولتِ دوجہاں سمیٹ دیں ۔ ادا شناس رسالت حضرت ابو بکر رضؓ نے اشارہ پاتے ہی اپنا سرمایۂ حیات حضورؐ کے قدموں پر لا ڈالا اور مدینہ میں خدا کا گھر تعمیر ہو گیا ۔ مکہ میں اپنا سب سے پہلا گھر تعمیر کرانے کا اعزاز خدا نے اپنے خلیلؑ کو بخشا تھا ۔ مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کا شاندار موقعہ آیا تو خدا کی نظرِ انتخاب حضرت ابو بکر صدیق رضؓ پر پڑی جن کے بارے میں خدا کے رسول صلعم

نے فرمایا تھا کہ خدا کے سوا اگر میں کسی کو اپنا دوست بناتا تو وہ ابوبکرؓ ہی ہوتے۔ اسی انسان کے خون پسینے کی کمائی اس قابل قرار پائی کہ اس معبد نور کی بنیادوں میں سوز بندگی بنکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سما جائے۔

اب حق و باطل کا معرکہ تیز و تند تلوار کی دھار بن چکا تھا۔ اب جنگ کی سرخ و سیاہ گھٹائیں ہر افق سے منڈلاتی ہوئیں مدینہ کی طرف بڑھی آ رہی تھیں اب اللہ والوں کو زخم کھانا ہی نہیں ظالم کے سینے پر چرکہ لگانا بھی لازمی تھا۔ وہ مومن جو تیرہ سال سے صبر و سکوت کی قربان گاہ میں کھڑے ہوئے تھے اب ان کو غیرتِ بندگی کے بیقرار تقاضے خون کے دریاؤں اور تلواروں کی چھاؤں میں آجانے کی دعوت دے رہے تھے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ حضورؐ جہاں بھی تشریف لے گئے یہ پروانۂ رسولؐ کشاں کشاں ساتھ آیا۔ خوف و خطر کے اس مقام پر بھی دنیا نے یہی دیکھا کہ ساری دنیا سے دامن جھٹک کے چل دینے والا بے نیاز انسان یہاں بھی ٹھیک اسی ادا نے جاں سپاری سے دامن مصطفٰےؐ کو بچوں کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ جیسے ان کو زندگی کا وہ ایک لمحہ بھی دائمی موت سے زیادہ شاق تھا جب ان کے اور محمدؐ کے درمیان ذرا سا بھی فاصلہ حائل ہو جائے!

جب جنگ بدر کے ہمت آزما میدان میں پہلی بار اس حقیقت کا تاریخی فیصلہ ہونا تھا کہ اکیلا زبردست خدا کافی ہے یا پتھروں سے ڈھالے ہوئے سیکڑوں جھوٹے خدا؟ جب باطل کے پاس سوائے خدا کے سب کچھ تھا اور حق کے دامن میں رحمتِ خدا کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ جب

بھوک اور افلاس سے کچلے ہوئے مٹھی بھر انسان خدا پر بھروسہ اور محمدؐ کا اعتبار کرکے وہاں تک کھنچ آئے تھے جہاں موت اور زندگی کی سرحدوں پر کفر و شرک کی ساری قہرمانیت جبڑے پھیلائے کھڑی تھی۔ جہاں بھولے بھالے انسانوں کو کچا چبا جانے کے لئے درندگی اور شیطنت کا ایک جنگل کا جنگل دانت پیستا اور چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھا چلا آرہا تھا۔ جہاں صرف ایمان کی طاقت سے آہنی ہتھیاروں کو توڑ دینا اور آبدار تلواروں کو کند کر دینا تھا۔ جہاں دلوں کے سوز سے فولادی چٹانیں پگھلا دینی تھیں۔ جہاں بے سر و سامانی کو ثابت کرنا تھا کہ وہ ساز و سامان پر بھاری ہے جہاں انسان کو اپنا عجز اور اللہ کی کبریائی کا ثبوت ایک ساتھ پیش کرنا تھا۔ وہاں جہاں باطل کی دیو پیکر صفوں پر کفر و سرکشی نے شور و شر سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا وہاں خیمۂ رسالت میں بندگی کا عجز آخری انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ یہاں خدا کی شانِ بے نیازی سے لرزہ براندام ہو کر جن و بشر کے آقا محمدؐ کبھی فرشِ خاک پر سر رکھتے تھے اور کبھی ایک بھکاری کی طرح خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بہ ہزار خشوع گڑگڑاتے تھے گڑگڑاتے اور غیرتِ خداوندی اور رحمت کو تڑپ تڑپ کر پکارتے تھے۔ اس وقت بھی وہ رازدانِ رسالت حضورؐ کے پہلو میں کھڑا ہوا شہادتِ حق کی ہوک سے تھرتھرا رہا تھا جب عبد و معبود کے درمیان ناز و نیاز کے اس عجیب و غریب عالم میں آں حضرتؐ کی تڑپ ان دعائیہ الفاظ تک پہنچی :-

"یا اللہ! مجھے بے یار و مددگار نہ چھوڑ! مجھ سے تو نے جو

جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما۔ اگر تیرے یہ مٹھی بھر بندے آج اس میدان میں کام آگئے تو کیا اے خدا! ــــ اے خدا! تو یہ چاہتا ہے کہ زمین پر کبھی تیری پرستش نہ ہو۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔"

تو بے اختیار حضرت ابوبکرؓ کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ دل کی بیقرار دھڑکنیں ہونٹوں پر تڑپ گئیں اور ساری انسانیت کا سوزِ حق ــــ سوزِ شہادتِ حق اپنی آواز میں سمیٹتے ہوئے انہوں نے آنسوؤں سے بھیگی اور جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی "اللہ کا رسولؐ سچا ہے ــــ سچ کہتا ہوں اللہ کا رسولؐ ہم بالکل سچا ہے۔"

اُدھر جنگ تھی کہ شدت پکڑ رہی تھی۔ اِدھر دعائے رسولؐ کا دلدوز سوز تھا کہ جسم وجاں اور کون ومکان سے آگے نکلا جا رہا تھا۔ اُدھر وحشیوں کی چنگھاڑ سے فضاؤں میں شگاف پڑ رہے تھے۔ اِدھر روح و دل کی ہُوک تھی کہ ذروں سے ستاروں تک کائنات کا دل ہلائے دے رہی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ ان دونوں کے درمیان تھے۔ اُدھر فرض تھا جو خون کے ایک ایک قطرے کو گرمائے دے رہا تھا۔ اِدھر رسولؐ کا درد دل تھا جو اُن کو تڑپائے دے رہا تھا کہ حضورؐ کے قدموں پر اپنا دل چیر کر ــــ کلیجہ نکال کر رکھدیں۔ فرطِ شوق سے ان کا وجود "دونیم" ہوا چاہتا تھا کہ اِدھر بھی کام کر سکے اور اُدھر بھی کام آسکے۔ محاذِ جنگ کی للکار سُنائی دیتی تو برقِ نیم بسمل کی طرح تڑپتے، بل کھاتے ہوئے نکل جاتے پھر خیمہ رسولؐ نظر آتا تو موت اور زندگی دونوں کو بھولے ہوئے ــــ آتش لہو کے طوفانوں کو چیرتے ہوئے۔ پلٹے

کی طرح لرزتے تڑپتے ہوئے حضورؐ کے پاس دوڑ کر آتے اور پھر ایک نظر حضورؐ کو دیکھ کر شہادت کی نئی دھن میں محاذ جنگ کی طرف جست کر کے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے، اس عالم میں انھوں نے تلواروں کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر خیمۂ رسالتؐ کی طرف پلٹ کر دیکھا تو شدتِ جذبات سے ایک بجلی سی گر گئی۔ ایک سنسنی خیز، رقت انگیز منظر نے ابو بکرؓ کی تمام توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ حضورؐ اب دعا میں اس قدر گم ہو چکے ہیں کہ آپ کو اور کسی بھی شے کا ہوش باقی نہیں ہے۔ ارتعاش و اضطراب کا عالم یہ تھا کہ آپ کی ردائے مبارک شانوں سے کھسکتے کھسکتے زمین پر جا گری تھی اور آپؐ اسی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے معبود حقیقی کے آگے گڑگڑا رہے تھے۔ پیغمبرؐ کی یہ کیفیت کتنی دلدوز اور کیسی ہوش رُبا تھی کہ حضرت ابو بکرؓ افتاں خیزاں خیمے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اشک بار۔ بیقرار۔ پروانہ وار!۔ صرف اس لئے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر زمین پر گر گئی تھی۔ ہائے ان مقدس شانوں سے ڈھلک کر اس چادر کا زمین پر گر جانا ابو بکر صدیقؓ کے لئے زمین و آسمان کے گر جانے سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ وہ مامتا سے بیقرار ماں کی طرح آئے اور اس حسین چادر کو اشک آلود آنکھوں سے لگا کر پھر انہیں شانوں پر درست کر دیا جن شانوں پر دنیا بھر کی غم خواری کا بوجھ کوہ گراں کی طرح رکھا ہوا تھا۔

یہ تھا وہ "سوز دعا" جس کی تپش سے بھوکے پیاسے مومنوں کے

سینوں میں عشق و اطاعت کے او نچے جذبات جوالا مکھی کی طرح پھٹے پڑتے تھے۔ یہ سوزِ دعا تھا جو صدیقی جرأت پر۔ حوصلوں اور ولولوں پر نغمۂ حدی کا ساحرانہ کام کر رہا تھا۔ نڈھال ہوتے ہوئے قدموں میں بجلیاں سی لپکتی تھیں۔ شل ہوتے ہوئے بازؤں میں خون کی روانی سست پڑتے پڑتے اچانک ایک طوفان بن جاتی۔ باطل کی زبردست طاقت کو دیکھکر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جانے سے پہلے دل فرطِ شوق سے شق ہوتے اور خدا کی طاقت پر اٹل ایمان ایک سیل نور بن کر ابل پڑتا۔ زخموں سے ٹپکتے ہوئے ہر ہر قطرہ خون میں جب آخرت کی سرخروئی ایک جاں نواز جھلک بنکر دکھاتی تو زخموں سے چور جسم جرأت و استقلال کی چٹانیں بن جاتے۔ یہ سوزِ دعا تھا جس سے زمین و آسمان میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ انسان موج در موج آگے بڑھ رہے تھے۔ فرشتے ہجوم در ہجوم زمین پر اتر رہے تھے تاکہ ان انسانوں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کا فخر حاصل کر سکیں جن کے متعلق مشیتِ ایزدی کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ قیامت کے دن خدا کی داہنی طرف جگہ پائیں گے۔ جب خدا انتہائی جلال میں بساطِ کائنات کو اپنے ہاتھوں میں لپیٹ کر کہہ رہا ہوگا "آج کے دن کس کا راج ہے؟ — اللہ زبردست اکیلے کا!"

آخر حق فاتح نکلا۔ شہادتِ حق کے لئے کھلے ہوئے سینوں کو باطل پیٹھ دکھا کر بھاگ رہا تھا۔ بندگی کا حلقہ گردن میں ڈال لینے سے جن لوگوں نے انکار کیا تھا ان کے ہاتھوں میں خدا کے بندے زنجیریں

پھنکار رہے تھے غرور وتکبر سے زمین کو دہلانے والے سلاسل میں جکڑے ہوئے سہمے کھڑے تھے۔ یہ نفرت وسفاکی کے مجرم تھے۔ یہ انسانیت کے ہتیارے تھے۔ یہ خدا کے باغی تھے اسی لئے سب سے بڑے ظالم تھے ــــ وہ ظالم جو دوسروں پر ظلم وستم کر کے درحقیقت خود اپنی جانوں پر آخری ستم ڈھاتے ہیں۔ لیکن یہ ظالمانہ مظلومیت کا دردناک پہلو اس وقت ان کے جرائم کی سیاہی میں اس طرح چھپ کر رہ گیا تھا کہ حضرت عمر فاروق رض نے جوشیلی آواز میں یہ رائے پیش کی ان سب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے اور ساتھ ہی نسل وخون کا بُت بھی اس طرح پاش پاش کر دیا جائے کہ ہر مؤمن اس کافر کو قتل کرے جو اس کا اپنا قریبی عزیز ہو۔ لیکن رحمۃ اللعالمین صلعم نے فرمایا ان لوگوں کو معاف کیا جائے تو کیا حرج ہے ــــ ہائے وہ شفیق دل جو اس وقت بھی اجازت نہ دیتا تھا کہ کفر کے یہ مجرم کفر کی موت مر کر ہمیشہ کے لئے دوزخ کا ایندھن بنیں۔ آپ اس وقت بھی بے چین تھے کہ سرکشی کے جرم میں تلوار کے نیچے پڑی ہوئی گردنیں اٹھیں اور خدا کی چوکھٹ پر پیشانی ٹیک دیں۔ اسلام کی مسلسل مظلومیت اور کفر کے پے در پے مظالم کو دیکھتے ہوئے حضور صلعم کی اس تجویز کو حیرت بھری خاموشی سے سُنا گیا۔ لیکن اس خاموشی کو توڑتی ہوئی اور حضور صلعم کی تائید کرتی ہوئی جو پہلی آواز آئی وہ حضرت ابو بکر رض کے سوا کس کی ہو سکتی تھی ــــ ابو بکر رض جس کے سازِ دل کے تمام تار مضراب رسالت صلعم کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے۔ حضور صلعم نے جو کچھ کہا۔ ابو بکر رض کے سینے سے ہمیشہ اسکی صدائے بازگشت آئی۔

جنگ اُحد میں جب مسلمانوں کی ایک المناک فروگذاشت سے بساط فتح وظفر تہہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی ۔۔۔ جب گھائل کفر نے شکست کا گھرا گھاؤ کھا کر پیچھے سے اچانک حملہ کیا۔۔۔ جب مومنوں کو سوچنے سمجھنے کی فرصت بھی نہ ملی اور ہوش وحواس نے ایمانی تقاضوں کا ساتھ چھوڑ دیا ۔ جب وہ قدم زمین پر رکھے ہوئے تھرتھرا رہے تھے جن میں تلواروں کی دھار پر بھی جنبش نہ ہوتی تھی ۔ جب قتلِ رسولؐ کی ہوش ربا افواہوں نے اہل ایمان کو سکتے میں ڈال دیا تھا ۔۔۔ اُس جنگ میں بھی شروع سے آخر تک حضرت ابوبکرؓ کے قدموں میں بال برابر جنبش نہ ہوئی تھی خوف اور غم کی جس ہولناک آندھی میں جہاد وعزیمت کے سربفلک پہاڑ ذروں کی طرح اُڑ رہے تھے اس وقت ابوبکرؓ کی زندگی میں خوف اور غم کے تمام جذبات احساسِ فرض کو آگے بڑھنے کیلئے دست بستہ راستہ دے رہے تھے ۔ جب معرکۂ فرض سر ہو گیا تو یہی وہ شخص تھا جو گھائل پیغمبرؐ کے نقوشِ پا کو خونِ دل و جگر سے نکھارتا ہوا حضورؐ کے ساتھ ساتھ پہاڑ کی بلندی پر چڑھ رہا تھا ۔ حضورؐ کے زخم رسیدہ چہرے کو دیکھ کر ان کا کیا حال ہوا ہو گا ؟ یہ سوچنے کی بات نہیں ۔ وہی شخص جو اس کے لئے ہزار بار تیار تھا کہ سیاہ ناگ اس کو غارِ ثور میں ڈس لے ، مگر حضورؐ کے خوابِ راحت کو ذرا سی ٹھیس نہ پہنچے وہی اب یہ دیکھ رہا تھا کہ حضورؐ کا مقدس چہرہ خون میں نہایا ہوا ہے بھلا کس کی سکت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خونچکاں کیفیات کا اندازہ کر سکے ۔ اگر کچھ اندازہ ہوتا ہے تو اس زبردست واقعہ سے ہوتا ہے کہ زخموں سے چور چور مجاہدوں کو جب گھائل رسولؐ نے یہ حکم دیا کہ

زخمیں پر پھائے رکھنے سے پہلے انھیں ابھی اور اسی وقت کفار کا پیچھا کرنا ہے تو حضرت ابوبکر رضؓ ایک خوں چکاں بجلی کی طرح ان درندوں کے تعاقب میں زخمی شیر کی طرح لپکے جن کے گھناؤنے ہاتھوں نے انسانیت کے بہترین غمخوار کا روشن چہرہ زخموں سے لہولہان کر دیا تھا۔

غزوہ بنی مصطلق میں جب وہ جوش ایمانی اور دست و بازو کے جوہر دکھا کر حبیبِ خدا کے ساتھ فاتحانہ مگر فرطِ شکر سے عاجزانہ پلٹ رہے تھے تو یہی وقت تھا جب ایک سپاہی پر پھولوں کی بارش ہوا کرتی ہے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ٹھیک اس وقت ان کے ننگ و ناموس پر تیر و نشتر کی بوچھار ہو رہی تھی جب منافقوں کی انتہائی شریر ٹولی نے ابوبکر رضؓ کی چہیتی بیٹی زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کی ماں حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ کے خلاف رسوائے زمانہ مہم چھیڑی تھی جب ایمان و یقین سے روشن سینوں میں سُوئے ظن اور بدگمانی کا شیطانی خنجر بھونکا جا رہا تھا۔ جب ایک طرف نبیؐ کی روح کو دوسری طرف حضرت ابوبکر رضؓ کی شرافت کو مجروح کر دینے کیلئے وحشیانہ وار کیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی حضرت ابوبکر رضؓ نے اپنے جذبات کی طرف نہیں اسوۂ رسولؐ کی طرف ہی دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ حضورؐ انتہائی اضطراب کے باوجود کس شان صبر و سکوت کے ساتھ قدم اٹھا رہے ہیں تو وہ بھی سر جھکا کر اسی راہ پر ہو لئے۔ ایک بھی چیخ بھی نہ نکلی۔ ایک گرم نظر بھی تو نہ اُٹھائی۔ شدید اضطراب کی کرب ناکیاں اور پھر مکمل صبر و سکوت! چند قدم اس راہِ پُرخار پر چلے تھے کہ زخمی دل پر ایک اور بجلی گری۔ پتہ چلا کہ اس

لرزہ خیز فتنہ کا شکار کچھ سادہ دل مسلمان بھی ہو گئے ہیں اور ان مسلمانوں میں وہ مسطح بن اثاثہ بھی شامل ہیں جن کی عمر بھر کی کفالت پر حضرت ابو بکرؓ نے اپنی آغوش محبت کی بہترین گرم جوشیاں صرف کی تھیں خود اپنے پروردہ نعمت کے ہاتھوں کو اپنے ننگ و ناموس کے خون سے رنگین دیکھ کر ان پر جو بھی قیامت گذر گئی ہو کم ہے لیکن اس وقت بھی انہوں نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ دل تھام کر اور کلیجہ مسوس کر رہ گئے۔ وہ اس وقت تک کچھ کہنے کی بجائے صرف سہنا چاہتے تھے جب تک حقیقت خود واضح نہ ہو جائے وہ خوب جانتے تھے کہ یہ الزام ایک عفیفہ کی پاکدامنی پر قاتلانہ حملہ ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حضورؐ کی بے چینی اور فتنہ انگیز منافقوں کی فتنہ طرازیوں کے درمیان حضرت عائشہؓ کے ڈھانچے لگے جا رہے ہیں اور آنسوؤں سے تر بتر تکیے پر سر ڈالے ہوئے کانٹوں اور شعلوں کی سیج پر تڑپ رہی ہیں۔ لیکن کوئی شے صدیقی صبر کا پیمانہ نہ چھلکا سکی وہ سینے پر صبر کی سل رکھے ہوئے اور ہونٹوں پر تقویٰ کے قفل چڑھائے ہوئے صرف اس لئے خاموش تھے کہ یہ خاموشی اسوۂ رسولؐ تھی۔۔ یہ رضائے الٰہی کا دل کش تقاضا تھا۔ یہ ادا ان کے جذبات پر کتنی ہی شاق کیوں نہ ہو ان کو دل و جان سے زیادہ پیاری تھی کہ یہ ان کے مولا کو پیاری ہے۔۔ آخر صبر کی جاں گدازیاں اپنے نیک انجام کو پہنچیں۔ انتظار کے پہاڑ سے دن کٹ ہی گئے اور آسمانی آواز نے اعلان کیا کہ زمین پر یہ فتنہ سراسر کذب و افترا ہے۔ ابو بکرؓ اس وقت بولے جب خدا خود بول اٹھا تھا۔ اخلاق و شائستگی کی حدوں میں رہتے ہوئے اس وقت بھی انھوں نے اس سے زیادہ احتجاج

نہ کیا کہ "خدا کی قسم! اس فتنہ پردازی کے بعد میں مسطحؓ بن اثاثہ کی کفالت نہیں کر سکتا"
یہ ایک حلیم ترین بندۂ مومن کے الفاظ تھے جہاں سادہ و متین الفاظ کی
تہہ میں مجروح جذبات کے طوفان دبے ہوئے تھے۔ لیکن ابھی اس فیصلہ کن اعلان
کی گونج بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ خدا کی دوسری آواز نے حضرت ابو بکرؓ کو محویتِ
جذبات سے چونکا دیا۔

"تم میں سے بڑے اور ذی استطاعت لوگ عزیز و اقربا،
مسکینوں اور راہِ خدا میں گھر بار چھوڑ دینے والوں کو (مدد) نہ
دینے کی قسم نہ کھائیں۔ اور چاہیئے کہ ان کے قصور معاف
کریں اور درگذر کریں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش دے؟
اور اللہ انتہائی معاف کرنے والا اور ترس کھانے والا ہے۔"

خدا کی یہ آواز سنتے ہی حضرت ابو بکرؓ نے اپنی آواز دبا دی۔۔۔
اپنے زبردست جذبات کا گلہ گھونٹ دیا۔ یہ الفاظ کہ "کیا تم یہ نہیں چاہتے
کہ اللہ تم کو بخش دے؟" حضرت ابو بکرؓ کی روح کو تڑپا دینے والا
سوال تھا۔ غیرت و خودداری کے جذبات عجزِ بندگی میں ڈھل گئے۔ دل و
جگر کا گرم خون آنسوؤں میں تبدیل ہو گیا۔ خدا کا پرستار خدا کے قدموں
پہ گرتے ہوئے گڑگڑا رہا تھا "ہاں میرے مولا میں یہ چاہتا ہوں ۔۔۔ میں
یہ چاہتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے۔" سجدے سے سر اٹھایا اور اعلان
کیا "خدا کی قسم! اب بھی ہمیشہ مسطحؓ کا کفیل رہوں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ"
سمع و طاعت کا مقام آتا تو وہ سراپا گوش اور پیکرِ تسلیم و رضا ہوتے تھے۔

لیکن غیرت بندگی پر ذرا سی آنچ آتی تو پھر ان کا جوش و خروش دیدنی ہوتا۔ جب صلح حدیبیہ کے تاریخی موڑ پر مشیت ایزدی کے رموز اہل ایمان کیلئے ایک زبردست راز تھے۔ جب اسلام شانِ مغلوبیت کے ساتھ کفر سے معاہدہ کرتے وقت یہ اعلان کر رہا تھا کہ یہ حق و صداقت کی کھلی ہوئی جیت ہے جب جوش جہاد سے کانپتی ہوئی اور جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں حضرت عمر رضؓ نے حضورؐ سے بیتابانہ سوال کیا تھا کہ "کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ ؟" اس وقت صدیق اکبر حضرت عمر رضؓ کو ایک طرف لیجا کر کیسی بھولی بھالی باتیں کر رہے تھے "حضورؐ تو اللہ کے رسول ہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کا کہنا نہ مانیں اور دیکھو عمر رضؓ اللہ حضورؐ کا مددگار رہے" لیکن جب کفار مکہ کے ایلچی عروہ بن مسعود نے حضورؐ کا دل دکھانے والی یہ چھوٹی بات کہی کہ "اے محمدؐ! خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ ایسے چہرے اور ایسے لوگ دیکھتا ہوں کہ وقت پڑے گا تو وہ تمہیں چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے" تو یہی فرشتہ خو، حلیم ترین انسان تھا جس کا چہرہ غیرت و حرارت سے لال ہو گیا۔ وہی شخص جو سیاہ ناگ کے زہریلے پھن سے چپ چاپ خود کو کٹوا سکتا تھا۔ ایک کافر کا طنز برداشت نہ کر سکا جس کی اصل چوٹ اس کے اپنے وجود پر نہیں بلکہ غیرت ایمانی اور پیمان بندگی پر پڑ رہی تھی مجروح جذبات کے طوفانی تھپیڑوں کو چند سادہ و شائستہ الفاظ میں سمیٹتے ہوئے آپ نے پلٹ کر طنز کیا "اچھا تو ہم رسول اللہؐ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے!؟" بظاہر کتنے سادہ الفاظ

تھے لیکن ان کے تیور میں نہ جانے کون سے جذبات کی زبردست یورش تھی کہ ان الفاظ کی کاٹ تلوار سے زیادہ تیز نکلی۔ عروہ بن مسعود نے تڑپ کر پوچھا "یہ کون شخص ہے آخر؟" لیکن جواب میں حضرت ابوبکر رض کا نام سُنا تو ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر سر جھکا لیا اور بولا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اگر میرے سر پر آپ کے احسانات نہ ہوتے تو میں نہایت سخت جواب دیتا"۔

...........اور...........

یونہی جہاد در جہاد ایمان و عمل کی قربان گاہوں میں حق و صداقت کی کی قیمت سمجھتے اور حق و صداقت پر جاں نثاری کی والہانہ ادائیں سمجھاتے ہوئے جب وہ غزوہ تبوک کی تاریخی منزل تک پہنچے تو قربانی کے جذبے نے انکو سراپا قربانی بنا دیا۔ غزوہ تبوک کی تیاریوں میں جب ہر مومن مالی و جانی حصہ لینے کے شوق میں اپنی بساط سے آگے نکلا جا رہا تھا جب حضرت عمر رض نے نصف گھر بار اُٹھا کر راہ مولا میں لٹاتے ہوئے سوچا تھا کہ شاید نیکی کی دوڑ میں آج میں صدیق اکبر رض پر بازی لیجا سکوں گا۔

— اس وقت حضرت ابوبکر رض ایک کونے میں غلام و مسکین کی طرح یوں سمٹے بیٹھے تھے جیسے بہت کچھ کر گذرنے کی زبردست تڑپ ہو مگر عملاً تڑپ کا حق ادا نہ ہو سکا ہو۔ اس عالم میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ "آج تم خدا اور رسول کے لئے کیا لائے ہیں؟" تو عجز و فنا دگی میں ڈوبا ہوا یہ جواب ملا "جو کچھ تھا وہ سب کچھ لے آیا ہوں" یہ جواب اور پھر یہ

ادائے عاجزانہ ـــ حاضرین سناٹے میں آ گئے۔ خدا کے رسول صلعم فرطِ شفقت سے پکار اُٹھے "اور گھر والوں کے لئے آخر کیا چھوڑ کر آئے ہو؟" ـــ "خدا اور خدا کا رسول ﷺ!" محبت اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

ہاں ـــ اے گردشِ تقدیر! کبھی ہماری سب سے قیمتی متاع کا نام "خدا اور خدا کا رسول صلعم" ہی تھا۔ کسی اور کا تو رونا کیا! سچ یہ ہے کہ ہمیں اب خود بھی یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ کیا سچ مچ ہم اب بھی ٹھیک وہی ہیں جو کبھی تھے؟ کبھی ہمارا یہ حال تھا کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ بھی نہیں ہو سکا اب کچھ نہ کر سکنے کے باوجود ہم اس طرح مطمئن ہیں جیسے بندگی کے سارے حقوق ادا کر چکے ہوں! ہاں خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اپنی اس "دیوانگی" کا دکھ بھرا احساس ہے اور بس یہی وہ احساس ہے جس کے دم تک ہمارا ایمان زندہ ہے۔ لیکن کیا یہ ایمان کی جاں بلب طاقت زندگی اور موت کا پل صراط طے کرنے کے لئے کافی ہے؟ ـــ کیا یہ فکر ہمیں ستاتی ہے کہ ـــ "کیا ہم مسلمان ہیں؟"

تجلی اکتوبر ۶۳ء

عرش رسا آوازیں

"اے اللہ! میں اپنی ناطاقتی اور بے چارگی اور لوگوں میں اپنی ہوا خیزی کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔

اے ارحم الراحمین! تو ہی ناتوانوں کی پرورش کرنے والا اور تو ہی میرا پروردگار ہے۔

تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ — کیا کسی اجنبی بیگانے کے؟ — جو مجھے دیکھ کر تیوری چڑھائے — یا کسی دشمن کے؟ جس کو تو نے مجھ پر قابو دیدیا ہو

— خدایا! اگر تو مجھ سے خفا نہیں ہے تو پھر مجھے کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔

تیری حفاظت میرے لئے بس ہے۔

میں طالب پناہ ہوں تیرے رخ کے اس نور سے جس سے تمام ظلمتیں کافور ہوگئیں — جس سے دونوں جہاں کی بگڑیاں بن جاتی ہیں۔ میں طالب پناہ ہوں اس بات سے کہ مجھ پر تیرا عتاب ہو — یا تو مجھ سے روٹھ جائے

تاوقتیکہ تو خوش نہ ہو جائے تجھے منا لے جانا ناگزیر ہے۔"

یہ کون کہہ رہا ہے؟۔

کس سے کہہ رہا ہے ؟۔

کہاں کہہ رہا ہے ؟۔

یہ خدا کے در پہ خدا کے رسولؐ کی دل ہلا دینے والی پکار ہے جو آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے طائف کی کوہستانی وادیوں میں گونجی تھی اور آج بھی صفحۂ قرطاس پر اُترتی ہے تو جیسے قلم کا جگر کانپ کانپ جاتا ہے۔ یہ پکار حبیب خدا نے سمیع و رحیم نے سنی ہوگی تو رحمت و غیرت کا کیا عالم ہوا ہوگا — خدا گواہ ہے کہ کوئی اس کا صحیح تصور تک نہیں کر سکتا۔ تاریخ اتنا ضرور بتاتی ہے کہ ادھر یہ فریاد آپؐ کے معصوم ترین ہونٹوں سے جدا ہوئی تھی اور اُدھر خدا کا جواب آ پہنچا تھا — فضائے کائنات کو چیرتے ہوئے دو عظیم فرشتے فرش خاک پر آ کھڑے ہوئے۔ ان میں ایک خود حضرت جبرئیلؑ تھے اور دوسرا وہ طاقتور فرشتہ جس کے شانوں پر خدا نے پہاڑوں کے نظم و نسق کا بوجھ رکھا ہے

السلام علیکم یا رسول اللہؐ! کمال ادب کے ساتھ جبرئیلؑ امین نے کہا تھا "خدا نے وہ ساری گفتگو بنفس نفیس سن لی ہے جو آپ اور آپ کی قوم کے مابین ہوئی — اور اس نے اس فرشتے کو خدمت میں حاضر کیا ہے جس کے سپرد کوہستانوں کا نظام ہے کہ جو حکم آپ چاہیں اس کو دیں"۔

بے رحم انسانوں نے جس پیغمبر پر پتھراؤ کیا تھا خدائے ارحم الراحمین

نے اس کے قدموں پر پہاڑوں کو لا ڈالا تھا حضور ؐ نے ارحم الراحمین کی اس بندہ نوازی کو سنا اور ابھی شکر نعمت ہی میں ڈوبے ہوئے تھے کہ فی الفور دوسرا فرشتہ آگے بڑھا۔

السلام علیکم یا رسول اللہ!" وہ عرض کر رہا تھا" میں ہی وہ فرشتہ ہوں جو مالک کائنات کی طرف سے آپ کے حکم کی تعمیل پر مامور ہوا ہے، اگر ارشاد ہو تو طائف کے دونوں محاذوں کے پہاڑوں کو حرکت دوں اور ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرا دوں کہ اس سرپھری آبادی کی کچلی ہوئی لاشوں پر رونے والا بھی کوئی نہ ہو۔

کیسا عجیب و غریب وقت تھا! — اے دل والو! ذرا سوچو تو سہی! ایک طرف وہ سنگدل آبادی ہے جس نے ایک انتہائی رحم کھانے والے کو پتھروں سے مارا ہے۔ اس کا انتہائی پاکیزہ اور بے لوث پیغام سنکر وحشیانہ تمسخر سے تالیاں پیٹی اور بغلیں بجائی ہیں، فقرے کسے اور پتھراؤ کئے ہیں۔ دوسری طرف پہاڑوں کی باگ ڈور خدا نے اپنے مظلوم رسول ؐ کے ہاتھ میں دیدی ہے اور پہاڑوں کے نظام پر مامور دیو پیکر فرشتہ ایک اشارے پر اس سفاک بستی کے جفا طرازوں کو سرمہ بنا ڈالنے کے لئے ہمہ تن اشارہ چشم و ابرو کا منتظر ہے۔ اور ان دونوں لرزہ خیز مناظر کے درمیان خود ہی رحمۃ اللعالمین ؐ حائل ہے جس کے گھائل پیروں سے خون کے فوارے چھوٹ نکلے ہیں — پاپوش لہو سے چھلک رہے ہیں اور جس کی مظلومیت کے قدم قدم

ضعف سے لڑکھڑانے لگے ہیں، لیکن چوں ہی اس کو محسوس ہوا کہ ظالموں کے حق میں خدا عذاب کا فیصلہ کیا چاہتا ہے وہ اپنے ہر زخم کی کسک کو بھول ہی گیا۔ اس وقت اس کو بس ایک ہی بات یاد تھی کہ میں حق پھیلانے اور انسانوں کو بچانے کے لئے آیا ہوں ـــ بے رحموں کی بستی کی طرف اس نے غمناک نظروں سے دیکھا اور اپنے گھائل جسم کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں پھر درد بھرا جواب دیا:۔

"میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو ان کی نسلوں میں سے ایسے لوگ ضرور پیدا ہوں گے جو اللہ کی پرستش کریں گے۔

یہ تھا وہ اشاعتِ حق کا اتھاہ سوز جس کی برکت سے ایک گناہ آلود بستی عذاب کے لپیٹ میں آتے آتے بچ نکلی ـــ آج پھر دنیا عذاب کی زد پر ہے ـــ کاش خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اس سوز درد کی بھی امین ثابت ہو۔ کم سے کم کوئی ایک سینہ تو اس سوز درد کا ہے۔ پھر ایک بار اللہ اللہ بن جائے۔

جب کوہ اُحد پر اہل ایمان کے اُن قدموں میں ڈگمگاہٹ آئی جو ہمیشہ جمے رہنے کیلئے بنے تھے!

جب خود پہاڑ لرز اٹھا ـــ جب کفر نے اسلام کے کھلے ہوئے سینے پر ناکام مشق ستم کے بعد اسلام کی پیٹھ میں خنجر اُتار دینے کے لئے دستِ ستم بڑھایا تو گھن گرج کو کچل ڈالنے والی ایک آواز فضا میں لہرا رہی تھی۔ یہ حضرت انس بن

نضر کی پرشوق آواز تھی "اے سعد! کہاں چلے؟ کیا تم نہیں محسوس کرتے مجھے تو جنت کی خوشبو اسی اُحد کے پہاڑ سے آرہی ہے!۔۔"

پھر انہوں نے جواب کا انتظار کہاں کیا؟۔۔ تاب انتظار تھی کس کو؟ ۔۔ جنت کی خوشبو سے جو دماغ و دل بس گئے ہوں وہ دنیا کی عفونت میں کتنی دیر تک رک سکتے ہیں؟ دوسرے ہی لمحے حضرت انس رض موت کے لشکر پر خود ٹوٹ پڑے تھے۔ تلوار ان کے ہاتھ میں تھی اور جان ہتھیلی پر!۔ اور نگاہ اس جنت پر جس کی محض خوشبو سونگھ کر وہ دنیا و مافیہا سے دامن جھٹک کر چل دیئے تھے۔ جب ان کی روح خدا سے جا ملی تو لوگوں نے ان کے گھائل جسم کو دیکھا۔ ایک جسم جس کو جسم سے زیادہ زخم کہنا موزوں ہوگا ایک لاش جس کو ان کی بہن بھی فقط ہاتھ کے پوروں سے پہچان سکی تھی!۔ ایک مجاہد، ایک شہید جس کے جسم پر اسی گھاؤ تیر اور تلوار کے گنے گئے!۔ اللہ اکبر!۔۔ اللہ اکبر! لا الٰہ الا اللہ۔ واللہ اکبر! اللہ اکبر۔۔ وللہ الحمد!۔

"اور مت کہہ دینا مردہ ان لوگوں کو جو راہ خدا میں موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔۔ نہیں نہیں!!۔ وہ تو جیتے جاگتے ہیں لیکن یہ سمجھنا تمہارے بس کی بات نہیں!"

انہی زخموں سے پارہ پارہ بدن گواہ ہے کہ زندگی وہی زندگی ہے جس کو دنیا موت کہے جائے مگر خدا کہے کہ وہی تو زندگی ہے۔ لیکن ذرا ان مردوں کا دھیان تو کرو جن کو تمام عمر کبھی اس زندگی کی آرزو تک نہیں ہوتی!۔۔ کیسے تھے وہ لوگ بھی جو حق پر مر جانے کو مٹ جانے کو تڑپتے تھے!۔

اور ـــ اور کیسے ہیں ہم کہ حق پر جینے کے لئے بھی تیار نہیں! ـــ وا حسرتا۔

حضرت ابو جندل رضؓ کتنے بڑے آدمی تھے! ـــ اللہ اکبر! کتنے بڑے آدمی تھے ـــ یہی تو تھے وہ بزرگ جو مکے سے زنجیریں تڑا کر حدیبیہ کے اس مقام تک گھسٹتے ہوئے آ پہنچے تھے جہاں ان کے اپنے باپ کفار مکہ کے وکیل سہیل اور امت اسلامیہ کے "صاحبؐ" کے درمیان صلح کا معاہدہ ہو رہا تھا۔

"واپس جاؤ!" سہیل نے جو ابھی تک کافر تھے اپنے مومن بیٹے ابو جندلؓ کو تلخ ترین لہجے میں حکم دیا تھا ـــ لیکن اخوتِ اسلامی کے حسین حلقے تک آجانے کے بعد پھر کفر کی آہنی زنجیروں کی طرف واپس جانا بھلا! ایک مومن کے لئے کیونکر ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ واپس نہیں پلٹے ـــ چیخ اٹھے۔ امت اسلامیہ کی طرف غمناک آنکھیں اٹھاتے ہوئے پکار اٹھے:۔

"مجھے بچاؤ!!"

اس چیخ نے رسولؐ اور مومنوں کے سینوں میں جذبہ اخوت کا طوفان اٹھا دیا ـــ معاہدہ کی مخصوص دفعہ کی زد سے ان کو بچانے کیلئے حضورؐ نے درخواست تک فرمائی مگر پتھریلا کفر ایک قیدی کو مانگا ہوا دینے تک کے لئے کسی طرح راضی نہ ہوا۔ اب صرف ایک راہ باقی تھی ـــ بال سے باریک اور تلوار سے تیز تر! مگر سیدھی خدا تک لے جانیوالی راہ ـــ وہ راہ جس میں منزل ساتھ ساتھ چلتی ہے ـــ وہ راہ جس میں تمنا

نے بندے کے ساتھ ہو جانے کا یقین اپنی کتاب میں شتر بار دلایا ہے
—— صبر جمیل کی راہ۔

صبر! —— اے ابو جندل صبر! "حضورؐ ضبط غم کی عظیم شان سے تلقینِ صبر فرما رہے تھے" صبر کر! ۔ دیکھو ہم نے ان سے یہ عہد کرتے ہوئے خدا کا نام لیا ہے —— صبر کرو۔ خدا تمہارے لئے راہ نکالے گا۔۔"

ٹھیک یہی صورتِ حال حضرت ابو بصیرؓ کے ساتھ اس وقت پیش آئی جب وہ ایمان لا کر مدینے میں داخل ہوئے تو ان کے پیچھے پیچھے کفر کے ہرکارے صلح حدیبیہ کے تحت اپنے آدمی کو واپس لیجانے کے لئے حضورؐ کے پاس آئے۔ ایک طرف اخوتِ اسلامی تھی تو دوسری طرف اس معاہدے کی یہ دفعہ کہ مکہ سے آنے والے کو مکہ لوٹا دیا جائے گا۔ ایک طرف جذبات تھے تو دوسری طرف اصول —— ابو بصیرؓ کا صبر جمیل ہی جذبات اور اصولوں کی درمیانی خلیج کو پاٹ سکتا تھا —— اور انھوں نے خونِ دل و جگر سے ہنسی خوشی یہ خلیج پاٹ دی۔

وہ دونوں واپس چلے گئے۔ دونوں نے صبر کا وہ جام اُٹھایا جو زہر ہلاہل سے بھی زیادہ تلخ تھا مگر حق کوشی اور ایمان نے اس میں نہ جانے کونسی حلاوت گھول دی تھی کہ وہ ہنسی خوشی یہ تلخاب پی گئے۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیئے تھا۔ انھوں نے آنکھیں بند کر کے خدا پر بھروسہ کیا اور خدا نے ان کے لئے راہ نکال دی۔ حالات اس درجہ دگرگوں ہوئے کہ جو کافر ان کو ساتھ لے جانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے

تھے وہی ان کو واپس مدینہ بلانے کے لئے التجائیں کرتے نظر آئے!

— مسلمان تو ہم بھی ہیں مگر ہم رات اور دن کو دیکھ دیکھ کر آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ وہ لوگ بھی مسلمان تھے مگر وہ اس ذات کی طرف دیکھا کرتے تھے جس کی قوت سے دن میں سے رات اور رات میں سے دن نکل آتا ہے۔ اسی لئے ہم گردشِ ایام کے تھپیڑے کھاتے پھرتے ہیں اور گردشِ ایام ان کے سامنے تہہ و بالا ہوا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں قسم کے مسلمان مسلمان ہی ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ورنہ سوچو تو سہی ہم جیسوں کا کہاں ٹھکانہ ہے۔

جلتی ہوئی ریت کی چنگاریوں پر سیدھا لٹا کر۔
جھلستے ہوئے سینے کو منوں کی پتھریلی سل سے کچلکر۔

کافروں کے جھنڈ کے جھنڈ ایک بلال رض سے کہا کرتے تھے "ہمارے خداؤں کو مانو!"

"اَحد! ۔ اَحد! ۔ اَحد! ۔ اَحد! — ایک! ۔ ایک! ۔ ایک! ۔ ایک"

خدا کی قسم یہی تھا حضرت سیدنا بلال رض کا پرقرار آہنگ!۔ درد و کرب کا احساس کہیں چلا نہیں گیا تھا۔ مگر جس کا دل ایمان سے چمک اٹھا ہو اس ہونٹوں سے کراہ بھی نکلتی ہے تو ایمان کی تب و تاب لئے ہوئے۔

رات کی تاریکی میں ان کو زنجیروں کے کسا ڈگھائی ہی کر ڈالتے۔

— رات بھر یہ زنجیریں گوشت میں پیوست ہوا کرتیں — اور رات اسی طرح

آنکھوں میں کٹ جاتی۔ صبح کی روشنی میں ان زخموں کو اُدھیڑ ڈالنے کیلئے تڑاتڑ کوڑوں کی مار دی جاتی۔ نیلی نیلی رگیں اُبھرتیں پھٹ جاتیں اور خون دینے لگتیں۔ پھر رات بھر کے لئے اس سراپا جراحت مومن کو زنجیروں میں اینٹھنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ پہاڑ سی رات ایسی عالم میں کٹ جاتی کہ ظالم تازہ دم ہونے کے لئے میٹھی نیند میں خراٹے لیتے اور مظلوم کربناک زخموں اور کانٹوں پر کروٹ بھی نہ بدل سکتا! دوسرے دن کا سورج دیکھتا کہ اس بلاکش حق و صداقت کو گرم گرم بالو کے بھاڑ میں بے تحاشا جھونک دیا جاتا۔

"اب بھی کہدے خدا ایک نہیں۔۔۔۔!" کفر و شرک کے انسانی درندے اس کے اوپر جھکتے اور چلاتے۔

زخموں اور کرب و درد میں ڈوبی ہوئی نہ نشین آواز پھر سینے سے اُبھرتی اور "اَحد! ۔ اَحد! ۔ اَحد! ۔" کا والہانہ آہنگ جو کانوں سُنائی دیتا ظلم و سفاکی تھک ہار کر بیٹھ جاتی اور بلال رضہ کی آواز کو کسی طرح خاموش نہ کر پاتی۔ ہاں ہاں۔ کبھی بالکل ایسا ہی تھا کہ ہزاروں ستمگر مل کر بھی کسی ایک بلال رضہ کی آوازِ حق کو نہ دبا سکتے تھے۔ مگر اب کروڑوں مسلمانوں کے سینوں میں بھی اس آواز کی کوئی دھمک سنائی نہیں دیتی۔ ہم کروڑوں میں بھی ایک بلال رضہ کی ایمانی توانائی نہیں ہے اور ہم اپنے ایمان کی اس نامعلوم ترین رمق پر کس اطمینان سے بیٹھے ہیں ۔۔ پاؤں پسارے سو رہے ہیں۔ دن میں اکڑ اکڑ کر زمین پر

چل پھر رہے ہیں۔ اے لوگو! یہ ہمیں کیا ہوا ہے؟...

لیکن جب تک حضورؐ ان کے سامنے رہے حضرت بلال رضؓ پر مظالم کے پہاڑ بھی ٹوٹ گئے تو انہوں نے اُف تک نہ کی۔ مگر حضورؐ کے وصال کے بعد انھیں اس دنیا میں ایک دن ٹھیرنا دوبھر ہوگیا۔ عشق رسولؐ سے مومن کے دل میں کیسی نزاکت اور کیسا استحکام پیدا ہو جاتا ہے کفر کے مقابلہ میں پہاڑ کی طرح اٹل مگر حُبِ رسولؐ کی بارگاہ میں پانی پانی! — حضورؐ کے دنیا سے تشریف لے جاتے ہی بلال رضؓ کا یہ حال تھا کہ وہ دیوانہ وار شہادت کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

وہ جنھوں نے حضورؐ کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کر لی تھیں ان کو یہ دیکھ کر کیسا اضطراب تھا کہ یہ دنیا حضورؐ سے خالی ہو گئی ہے۔ لیکن ہم نے حضورؐ کو کبھی نہیں دیکھا اور ان کے خلا کو کبھی اتنی شدت سے محسوس نہیں کرتے یا اگر ہمیں کبھی یہ آرزو نہیں ہوتی کہ فرش زمین پر شہادت کا سرخ سرخ خون ٹپکاتے ہوئے ہم بھی ادھر دوڑے چلے جائیں جدھر حضورؐ تشریف لے گئے ہیں تو ہم اس ایمان کی لذت و سرمستی سے کتنے دُور ہیں جو خدا اور خدا کے رسولؐ کی دلی چاہت کے بعد قلب و روح میں فصل بہار کی طرح لہلہاتا ہے!

نظام عالم کی ذرا سی ہلچل پر حضورؐ کیسے کیسے چونک جاتے

تھے اے کتنا گہرا اثر لیتے تھے آپ۔ ذرا ہوا تیز ہوتی اور آپ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ ذرا گھٹائیں اُمنڈتی ہوئی نظر آتیں کہ آپ کے مقدس متبسم چہرے کا رنگ زرد پڑجاتا اور آپ کے لبوں پر یہ بیتاب دعا تھرانے لگتی :۔

"میرے اللہ! میں تجھ سے اس کی خیر چاہتا ہوں۔ اور وہ
خیر جو اس میں ہے اور وہ خیر جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے۔
اور میرے اللہ! میں اس کے شر سے تیری پناہ کا طالب
ہوں اور اس شر سے جو اس کے اندر ہے۔ اور اس شر سے
جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔"

حضورؐ موسم کی ان تبدیلیوں پر کیسے پریشان ہوتے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خدا بھلا کرے کہ انھوں نے یہ راز معلوم کرنے کے لئے ایک دن حضورؐ سے سوال کر لیا تو ہمیں اس کی عظیم وجہ کا پتہ چل گیا۔ ان کے سوال کے جواب میں خوف و خشیت میں ڈوبی ہوئی حضورؐ کی یہی آواز تو سنائی دی تھی کہ "اے عائشہؓ! مجھے یہ کیسے اطمینان ہو جائے کہ اس میں خدا کا قہر نہیں ہے؟"۔۔۔ پھر آپ نے اس بدنصیب غارت شدہ قوم عاد کا تاریخی حوالہ دیا تھا جو ابر و باد کو دیکھ کر یہ خوفناک دھوکا کھا چکی تھی کہ ان میں ہمارے لئے شادابیوں کے سوا کچھ اور نہیں ۔۔۔ حالانکہ ان میں اس بستی پر ٹوٹ پڑنے کے لئے عذاب کے ہولناک دھماکے چلے آرہے تھے۔

دنیا آج پھر قوم عاد کی ذہنیت پر چل کھڑی ہوئی ہے ۔۔۔ بادلوں

کی گھن گرج ــــ آندھیوں کے جھکڑ ــــ طوفانوں کا خروش ــ بھونچالوں کے جھٹکے، اب تو آئے دن کی باتیں ہیں، لیکن کتنے چہرے اس سب کے اچھے چہرے، کی یاد تازہ کرتے ہیں جو نظام عالم کی ذرا سی اتھل پتھل پر خدا کے خوف سے کملا جاتا تھا۔ کتنے سینوں میں خدا کے قہر کا وہ اندیشہ سر اُٹھاتا ہے جو ایسے مواقع پر حضورؐ کی بے قرار دعاؤں کے لفظ لفظ سے ٹپکا کرتا تھا۔ ہم خدا نہ کرے کہ اس زمین پر عذاب کی گود میں دم توڑیں لیکن ایک عذاب رسیدہ قوم کی منحوس ذہنیت کو اپنا لینا کیا بجائے خود ایک مستقل عذاب سے کچھ کم ہے؟ ــ ہائے وہ لوگ جو کھلی ہوئی آنکھوں سے حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے ان کا انجام اس وقت کیا ہوگا جب آنکھیں بند ہو چکی ہوں گی! لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ

اسی شب و روز کی دنیا میں ایک ایسی رات بھی تو آئی ہے جس کو حضورؐ نے رو رو کر گذارا تھا۔ آپؐ خدا کے سامنے اس وقت ہاتھ باندھے ہوئے لرزہ بر اندام کھڑے تھے اور رہ رہ کر رو پڑتے تھے جب دنیا میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ اور آپ کی اس رات کی یہ آواز گواہ ہے کہ آپ اپنے لئے نہیں اس دنیا کے غم میں رو رو کر جان ہلکان فرما رہے تھے۔

"یا مالک الملک! اگر آپ ان کو عذاب میں ڈالدیں تو یہ
آپ ہی کے غلام ہیں اور اگر آپ ان کی خطائیں معاف
کردیں تو بے شک آپ زبردست اور حکیم ہیں۔"

تمام رات اسی عالم میں گذری۔

ہائے وہ رات!—

اور— ہائے وہ درد بھرے آنسو!

کاش!— ہم اور کچھ نہیں تو ان آنسوؤں ہی کی قیمت پہچان سکیں!
ذرا اس وقت کا دھیان تو کرو جب میدان حشر میں ایک طرف
ہم اور دوسری طرف خدا ہوگا۔ اَرْ حَمْ یُومِئِذٍ اللّٰہِ!— جب جرم و
گناہ کی ماری انسانیت ہولناک عذاب کی لپیٹ میں آرہی ہوگی اور
ہم سب اس کے چشم دید گواہ ہوں گے — جہاں دوسری طرف
عرش الٰہی کے خنک سایے میں وہ خوش نصیب لوگ ہوں گے جن
کے دن آبلہ پائیوں میں اور راتیں سجدوں میں گذری ہوں گی اور اس
طرح اس رات کی یاد تازہ ہوگی جو حضور ؐ نے ساری دنیا کے غم
میں رو رو کر بسر کی تھی۔ امام اعظم حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی
ایک پوری رات اس آیت قرآنی کے دریائے معانی میں سفینۂ پیاس
کی طرح چکراتی پھری

"اے اے مجرمو!— آج کے دن تم الگ تو الگ
کھڑے تو ہو جاؤ!—"

یہ تو طے ہے کہ قیامت کا میدان لگے گا۔ یہ بھی طے ہے کہ اس میدان میں تمام نوعِ انسانی ایک جھڑکی سنتے ہی دبے پاؤں سمٹ آئیگی اور ہم خود اس ہجوم بیکراں میں ہوں گے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ وہاں سب ایک ساتھ نہ رہ سکیں گے۔ انسانیت کا لامتناہی خاندان صالحین اور مجرمین کے دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ الگ تھلگ کر دیا جائے گا۔ ہائے اے لوگو! سوچو تو سہی اس دن ہم ادھر بلائے جائیں گے یا اُدھر ہنکا دیئے جائیں گے؟۔ اِدھر جہاں خدا ہو گا۔ خدا کا رسول ہو گا اور مومنین وصالحین کی جماعت ہو گی۔ یا اُدھر جہاں ابلیس لعین ہو گا۔ ملعون ابوجہل ہو گا۔ مردود فرعون ہو گا اور عاد و ثمود جیسی بدبخت قومیں ہوں گی۔ ادھر جہاں رحمت و مغفرت ہو گی یا اُدھر جہاں عذاب ہی عذاب ہو گا — اِدھر جہاں پھولوں کی طرح ہنستے کھلتے چہرے ہوں گے یا اُدھر جہاں دھول میں اٹے ہوئے چہرے ہوں گے۔ زنگ چڑھے دل اور خوف و حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھیں ہوں گی؟۔

— ہاں ابھی ہم یہ سب کچھ سوچ سکتے ہیں، یہ مہلت ایک دن ختم ضرور ہو جانے والی ہے، لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی چاہے یہ لمحہ اس کا آخری ہی لمحہ کیوں نہ ہو۔ ہاں ہم ابھی یہ سوچ سکتے ہیں کہ کیا ہم مسلمان ہیں؟ خدا کا شکر ہے کہ ابھی اس نے ہمیں سوچنے سمجھنے اور خدا کی طرف پلٹ جانے کی مہلت دے رکھی ہے۔ ہے کوئی جو اس مہلت سے فائدہ اُٹھائے ۱۲ ؂ تجلی جنوری ۶۴ء

اسلام دل سے نہیں نکل سکتا

وہ بھی کیسا جاں نواز وقت رہا ہوگا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دردبھری دعا کی صدائے بازگشت بنتے ہوئے حضرت عمرابن خطابؓ کفر کی وادیٔ تاریک سے اسلام کے کشورِ نور کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے مگر خود انہیں بھی اس کی خبر نہ تھی کہ آج دارِ ارقم کی دیواریں ان کے نعرۂ توحید سے گونج اٹھنے کے لئے کیسی بیقرار و منتظر ہیں!۔ انہیں کیا گمان ہو سکتا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے خلاف جو تلوار انہوں نے انتہائی خوفناک ارادے سے بے نیام کی ہے وہ خود ان کے اپنے کفر پر برقِ بے اماں بن کر گر جانے والی ہے! ——وہ نہ جانتے تھے کہ ان کے صاحب ایمان بہنوئی اور بہن کے چہرے جب عمرؓ کے وحشیانہ تھپڑوں سے خوں چکاں ہو جائیں گے تو ان کے اس مقدس خون کی چند چھینٹیں ان کے دل کی ایک ایک دھڑکن پر یہ عظیم اعلان ثبت کر دیں گی:۔

"خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔"

حضورؐ نے اپنے خدا سے کفر کی جنھوبندی توڑ دینے کیلئے یہ دعا مانگی تھی کہ "اے قادرِ مطلق! ابوجہل بن ہشام اور عمر ابن خطاب

میں سے کسی ایک کو ہمیں دیدے!" ابوجہل کی تیرہ بختی تھی کہ اس نے باغات جنت کے بجائے جہنم کے آتشکدوں میں رہنا پسند کیا اس لئے ایک اولوالعزم رسولؐ کی دعا بھی اس کے پتھریلے سینے سے ٹکرائی اور پلٹ گئی ــ مگر خطاب کے خوش قسمت بیٹے کی فطرت کو کفر کی ناپاک صلابتیں پتھر نہیں بنا سکی تھیں اس لئے یہ دعا کا تیر ان کے سینے میں ترازو ہوگیا۔

ان کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو ــ ان کے دل کی کوہ افگن استقامت کو ــ ان کے ضمیر کی تہہ میں شعلہ زن تلاش حقیقت کو ــ قدم قدم پر ــ بار بار "حق" پکارتا آرہا تھا اور ــ عمرؓ اس پکار کو سنتے ہوئے ــ اپنی مخصوص شان پختگی کو قائم رکھتے ہوئے ۔ اندر ہی اندر ــ آہستہ آہستہ ــ قطعی غیر محسوس طور پر کفر کی طرف اپنی پشت اور اسلام کی جانب اپنا رُخ تبدیل کرتے آرہے تھے۔

پہلی بار شاید وہ اس وقت چونکے تھے جب خانہ کعبہ میں کسی نے پتھر کے بت پر عقیدت کا چڑھاوا چڑھایا تو اس پتھر میں سے یہ آواز صاف آتی ہوئی سُنی گئی کہ:۔

"خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے"

یہ تھی وہ پہلی جھرجھری جس کا تجربہ ان کے دور کفر کو ہوا تھا ــ ہوا تو اور فراموش ہوگیا تھا۔ اس لئے یہ اس وقت کی بات تھی جب

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسولؐ بنائے جانے سے پہلے مکے کی گلی کوچوں میں عرب کے امین و صادق ہی کی حیثیت سے چلتے پھرتے تھے — غار حرا کی پُراسرار تنہائیوں میں اپنے قلبی اضطراب میں غوطہ زن رہتے اور انسان کی حالتِ زار پر آنسو بہاتے تھے یا ریگستانوں اور صحراؤں میں ریت کے خاموش ٹیلوں کے درمیان بیٹھ کر زمین و آسمان پر متجسس اور بیتاب نگاہیں ڈالتے اور حیات و کائنات کے انتہائی درد بھرے سوالات میں ڈوب جاتے تھے۔

اس کے بعد ایک بار پھر عمرؓ نے خدا کی آواز سنی —

حق کی یہ سنسنی خیز — تہلکہ انگیز آواز آج کسی بُت کے لبوں پر نہیں۔ دنیا کے سب سے کامیاب بُت شکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں پر گونجتی ہوئی سنائی دی تھی۔

آج عمرؓ اگرچہ اس ارادے سے اُدھر آنکلے تھے کہ فرصت کے لمحوں میں کچھ دیر حق کے اس پیغام کے ساتھ چھیڑ خانی کا لطف اُٹھایا جائے — مگر خدائے نادیدہ، خدائے واحد کے آگے دست بستہ کھڑے ہوئے رسولؐ کے پاک لبوں سے جو حیات آفریں اور وجد انگیز آواز آ رہی تھی اس نے تو جیسے آج عمرؓ کے پورے وجود کو سکتے میں ڈال دیا تھا! عمرؓ کھڑے کے کھڑے رہ گئے! — اس وقت وہ سورۂ الحاقہ کی عظیم آیات کو محمدؐ کی آواز میں سن رہے تھے — جن میں کبھی زمین کی دو غارت شدہ قوموں عاد و ثمود کے کھنڈر

ابھرتے تھے اور کبھی قیامت کے زلزلے کی گرج صاف سنائی دیتی تھی۔ — کبھی یہ منظر آنکھوں کے سامنے لایا جا رہا تھا کہ قبروں کے دہانوں سے مُردوں کے دَل کے دَل اُمنڈتے ہوئے میدانِ حشر کی بیکراں وسعتوں میں پھیلتے جا رہے ہیں تو کچھ چہرے سیاہ پڑ گئے ہیں اور کچھ پھولوں کی طرح مسکرا اُٹھے ہیں۔ — یہ کارواں آگے بڑھ رہا ہے اور اس ترازو کے گرد جمع ہو رہا ہے جہاں نیکی اور بدی کے دو پلڑوں میں پوری پوری زندگیوں کو تول تول کر یہ بتایا جائے گا کہ کون خدا کی جنت کا مستحق ٹھیرا اور کون دوزخ کا ذلیل ایندھن قرار پایا؟ — اور پھر کس طرح ستر ستر گز کی بھاری بھر کم زنجیروں کی ایک زبردست جھنکار ہو گی اور یہ منظر جاں ستاں سامنے ہو گا کہ خدا کی فرض شناس پولس نے مجرموں کے شکنجے کس ڈالے اور اب انھیں اہلِ جنت کے تبسم نشاط سے بہت دُور اس دوزخ کی طرف ہنکا دیا گیا جو دُور ہی سے تیوری چڑھائے چیختا دہاڑتا سنائی دے رہا ہے۔

عمر ابن خطاب نے یہ آواز حق سُنی اور انھیں صاف محسوس ہوا کہ یہ آواز اب باہر نہیں خود ان کے اپنے سینے کے اندر ہلچل ڈال رہی ہے — مگر ابھی تک دل جاگا نہ تھا۔ — سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔

"کیسی عجیب و غریب آواز!!" دل ہی دل میں وہ بڑبڑائے اور پھر — خود ہی زیادہ سے زیادہ محض یہ نتیجہ نکال سکے "یقیناً یہ شخص تو کوئی بڑا ہی معرکۃ الآراء شاعر ہے ..... !" — لیکن یہ آواز ابھی ان کے سینے سے اُٹھی ہی تھی کہ وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے، سکتے میں آ گئے کہ قرآن نے ان کی یہ

آواز خفی بھی سن لی ہے اور نہ صرف سن لی ہے بلکہ اگلی آیات میں اس کا دو ٹوک جواب بھی دیا جا رہا ہے!

"وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ! — نہیں، یہ کسی شاعر کی بات نہیں۔ مگر تم بہت کم ایمان لاتے ہو!"

"ارے!" عمرؓ کے دل کی سرگوشی بے ساختہ حرف استعجاب میں ڈھل گئی "کتنا بڑا کاہن ہے!!"

"وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ" قرآن نے فی الفور اس خیال کو بھی مسترد کرتے ہوئے کہا "یہ کسی کاہن کا بھی قول نہیں ہے — تم تو بہت ہی کم سمجھتے ہو!"

عمر ابن خطابؓ کی دنیائے خیال میں یکایک ایک سناٹا چھا گیا اور اس زبردست سناٹے میں قرآن کی آواز آئے چلی جا رہی تھی۔

"یہ (کلام) اُتارا ہوا ہے رب العلمین کا۔ اور اگر یہ (پیغمبر) گھڑ لاتا ہم پر کوئی بات تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن — پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے (خدا سے) بچا سکے اور یہ نصیحت ہے ڈرنے والوں کیلئے — اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے بعضوں کا شیوہ جھٹلانا ہے مگر یہ شیوہ اندوہ و حسرت کے سوا کچھ بھی دینے والا نہیں۔"

اُنھوں نے یہ سب کچھ سُنا — روح یقیناً ہل گئی تھی مگر تاثرات کا یہ زلزلہ ابھی لاشعور کی تہہ سے اُبھر کر شعور کی سطح تک نہ پہنچا تھا۔ اس لئے سچائی کے یہ حسین جھٹکے پیاپے لگائے جا رہے تھے ادھر حق تھا

کہ اندر ہی اندر ان کے دل کے لطیف تاروں کو چھیڑ چکا تھا مگر شعور تھا کہ ماحول کے حق دشمن شور و غل میں پستا ہوا خود اپنی روح کی موسیقی سُن ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک زبردست کشمکش اندر اور باہر برپا تھی جس نے ایک زبردست جھنجلاہٹ اور غصے کی شکل اختیار کرلی۔

آخر اس ذہنی کشمکش کا دو ٹوک فیصلہ کرنے کیلئے انھوں نے اپنی تلوار کو میان سے باہر نکالا اور اس ہستی کو قتل کرڈالنے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے جس کے ایک قطرہ خون کی قیمت آسمان کے سارے ماہ و انجم بھی نہیں ہوسکتے تھے ——— یہ وہ لمحہ تھا جب غیر محسوس حق اور محسوس باطل ان کے اندر پوری قوت سے گتھم گتھا ہو رہے تھے جذبات کی یہ پُرشور آندھی چلی مکے کی گلی کوچوں میں داخل ہوئی کہ اچانک اس آندھی سے ایک انسان آ ٹکرایا یہ حضرت نعیم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ وہ عمر کے خوفناک تیور دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"کدھر؟ — اے عمر کدھر؟" انھوں نے آگے بڑھ کر گہری تشویش کے ساتھ پوچھا۔ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے چلا ہوں" عمر کی سُرخ سُرخ آنکھوں سے شعلے سے نکلے اور ابن عبداللہ نے ان کی آواز میں رعد جیسی کڑک محسوس کی۔

"پہلے اپنے گھر کی خبر لو" ابن عبداللہؓ نے پوری بے جگری کے ساتھ اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار بھی اور جو پورے گھرانے کا سردار تھا "جس حق کا فیصلہ کرنے کے لئے تم اس طرح گھر

سے نکلے ہو وہ حق خود تمہارے گھر میں گھس کر تمہاری بہن اور بہنوئی کے سینوں میں اُتر چکا ہے ۔"

یہ بات سنتے ہی عمر ابن خطاب تلملا گئے ---- سرعت سے گھومے اور بارگاہ رسالت کے بجائے اپنی بہن کے مکان کی طرف طوفانی رفتار سے چل پڑے۔

دروازے پر قدم رکھتے ہی انھوں نے سنا کہ اندر قرآن پڑھا جا رہا ہے ۔ یہی وہ وقت تھا جب ان کی بہن اور بہنوئی حضرت حباب ابن ارت رضی اللہ سے اللہ کی کتاب کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے ۔ آج عمر قرآن پر کچھ غور کرنے کے قابل نہ تھے ---- آج تو قرآن کی آواز سنتے ہی ان کے غیظ و غضب کا لاوا کھول اٹھا تھا ۔ انھوں نے دروازے کو خوفناک جھٹکوں سے جھنجوڑ ڈالا ---- دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئے مگر انھوں نے دیکھا کہ وہ کتاب چھپا دی گئی ہے اور ہر طرح کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے کے لئے ایک مومن اور مومنہ نے پوری جرأت سے سینہ کھول دیا ہے ۔

"یہ کیسی آواز تھی ؟" بہن اور بہنوئی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جانے کے انداز میں گھورتے ہوئے انھوں نے پوری قوت سے للکارا ۔

"کیسی آواز ؟" مومن اور مومنہ دونوں نے انتہائی بے نیازی کے ساتھ کہا ---- ان کو مکمل اطمینان تھا کہ وہ اپنے خدا کی کتاب اور اپنے معلم صحابی رسول کو اس غضبناک طوفان سے بہت دور پہنچا چکے

ہیں اور اب جو کچھ ابتلا پڑتی ہے وہ خود ان کے اپنے جسموں پر ہی پڑتی ہے ۔۔۔ وہ جسم جن کا رواں رواں خدا کے ہاتھ بک چکا ۔۔۔ وہ جسم جن کی سب سے بڑی کامرانی یہ ہے کہ خود اپنے لہو میں نہا دھو کر وہ ہمیشہ کے لئے زندہ اور پاک و صاف ہو جائیں ۔

"بس کرو!" عمر ابن خطاب زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے گرجے "میں خوب سمجھ چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہو گئے ہو!"

یہ کہا اور پھر جواب کا انتظار کرنے کی بھی ان کے غیظ نے اجازت نہ دی، بھوکے شیر کی طرح وہ بہنوئی پر جھپٹے تو بے رحم ہاتھوں کی بھرپور ضرب پڑتے ہی وہاں آہ اور کراہ کے بجائے توحید و رسالت کی گواہی کی آواز بلند ہوئی۔ پھر فوراً ہی ایک بجلی سی چمکی اور عمر ابن خطاب نے دیکھا کہ مومنہ بیوی اپنے مومن شوہر کو بچانے کے لئے ڈھال بن کر آگے آگئی ہے ، ٹھیک اس وقت جب دو قوی ہاتھوں کے پے در پے وار ایک مرد مومن کو نڈھال کرنے کے بعد ایک مومنہ کے معصوم چہرے پر اپنی قوت آزما رہے تھے ۔۔۔ بہن کے ہونٹوں ۔۔۔ خون آلود ہونٹوں پر غیرتِ ایمانی کی زلزلہ انگیز گرج ابھری اور عمر نے سکتے کے عالم میں یہ محسوس کیا کہ یہ آواز اپنی پوری گرج اور دھماکے کے ساتھ ان کے دست و بازو کی تمام فولادی قوتوں کو بیک ضرب پاش پاش کرتی ہوئی ان کے وجود کے اندر گھس آئی ہے ۔ ایک زبردست تھرتھری پیدا ہوئی اور ان کے قلب و روح کی بنیادیں لرزتی چلی گئیں ۔

"اے عمر!" جسمانی محاذ پر نڈھال ہوکر گرتی ہوئی بہن نے ایمان کے روشن افق سے ابھرتے ہوئے کہا "اے عمر! — جو بن آئے کر گذرو۔ لیکن اب اسلام اس دل سے نہیں نکل سکتا!"

کیا یہ محض ایک آواز تھی؟ یہ تو ایمان و یقین کا ایک زلزلہ تھا۔ یہ تو حق پر جاں نثاری کا کوہ افگن ولولہ تھا — یہ حقیقت کی پر جلال کڑک تھی — کیسے ممکن تھا کہ اس آواز کے آگے وہ انسان بےحس و حرکت پتھر بنا رہتا جس کے سینے میں ایمانی حرارت نے بھٹیاں سلگا دی تھیں — یہ آواز سنتے ہی عمر ابن خطاب کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔۔ — شرم اور کرب کے دو آتشہ جذبات میں سر جھک گیا۔ پھر نظر اٹھی اور بہن کے چہرے کو جسم کے خون اور ایمان کے جلال سے سرخ دیکھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آنسوؤں کا یہ ابال بتا رہا تھا، سینے کی تمام چٹانیں پگھل رہی ہیں

"میری بہن — فاطمہ!" درد بھری آواز میں عمر ابن خطاب پکار اٹھے "مجھے بھی تو وہ چیز دکھاؤ جس کو تم لوگ پڑھ رہے تھے....."

بھائی کی زندگی میں حیات انگیز انقلاب کی یہ سنہری پو پھٹتے ہوئے دیکھ کر بہن اور بہنوئی دونوں بھول گئے کہ ابھی ابھی ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے، وہ بیتابانہ اٹھے — بہن نے اپنے بھائی کو غسل کے وہ آداب سکھائے جو اس مقدس کتاب کو چھونے سے پہلے ضروری تھے — اور پھر وہ کتاب کے اجزا بھی ان کے سامنے لاکر کھول دیئے جس کے اندر

سے خدا کی آواز آرہی تھی:۔

"زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب خدا کی پاکی بیان کرتا ہے خدا زبردست ہے ـــ وہ حکیم ہے۔"

اُدھر زخمی بہن اور بہنوئی کی آنکھوں میں مسرت کی شدت اشک بیقرار بنکر ابل پڑی تھی یہ دیکھ کر کہ ان کے بھائی کفر و شرک کی دل دل سے نکل کر قبول حق کی سمت لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتے آرہے ہیں اور ادھر عمر ابن خطاب کے سینے کو عرفان حق کا جذبہ بے پناہ شق کئے دے رہا تھا قرآن کے ایک ایک حرف میں ان کو اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی اور دل کی دھڑکنوں کی یہ چوٹ ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز کر چکی تھی، جب اس کیفیت میں وہ یہاں تک پہنچے کہ:۔

"لاؤ ایمان اللہ اور اس کے رسول پر۔"

تو بے ساختہ پکار اُٹھے:۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اور اب ـــ

اپنے دیدۂ و دل کی محرابوں پر پرسوز صداقت کے دیئے جلائے ـــ عمر ابن خطاب حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظیم الشان شخصیت میں ڈھلتے ہوئے ایک بار پھر اسی کوچہ رسالت کی طرف کشاں

کشاں کشاں چلے جدھر تھوڑی دیر ہوئی وہ دنیا کا سب سے بڑا جرم کرنے روانہ ہوئے تھے ۔ وہ تلوار اب بھی ہاتھ میں تھی مگر تلوار اُٹھانے والا خود ہی ہلاک ہو گیا تھا ۔ اب اس تلوار کا رُخ اسلام کی طرف نہیں کفر کی طرف تھا اب رگوں میں دوڑتا ہوا خون بیقرار تھا کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاکِ پا کے ایک ایک ذرّے کو رنگین کر دے ۔ دارِ ارقم پر جب ان کی دستک سُنی گئی اور دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ عمرؓ ننگی تلوار لئے آرہے ہیں تو مسلمانوں کو قدرتاً خطرے کا احساس ہوا اور اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے حضرت امیر حمزہؓ نے للکار سنائی :-

" آتا ہے تو آنے دو ۔ اگر کسی بُری نیت سے آرہا ہے تو خود اس کی تلوار سے اس کا فیصلہ کر دوں گا ۔"

مگر حضورؐ ایک عجیب مسرّت بھری کیفیت میں اُٹھے ۔ سب کو روکا اور خود آگے بڑھ کر حضرت عمرؓ کے دامن کو جھٹکا دیتے ہوئے فرمایا " کہو عمر ؟ ۔ کس ارادے سے آئے ہو ؟ "

غلامانہ عجز و انکسار میں ڈوبی ہوئی آواز حضرت عمرؓ کے ہونٹوں سے بلند ہوئی ۔

" ایمان لانے کے لئے ۔ "

حق کی اس عظیم الشان فتح پر بے اختیار رسولؐ خدا اور اصحابؓ رسول کے منہ سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا ۔

" اللہ اکبر ! "

"اللہ اکبر" کا یہ فلک شگاف نعرہ وادی وادی ــــ پربت پربت گونجتا لہراتا چلا گیا۔

یہ نعرۂ ظفر و کامیابی وہ انقلابی موڑ تھا جہاں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کی صفوں میں داخل ہوئے اس نعرے کو سنکر شیاطین میں صفِ ماتم بچھ رہی تھی ــــ کفر و شرک کے گھروں میں کہرام برپا ہو گیا تھا۔ آگ اور خون تھوکتے ہوئے کفر و شرک کے درندہ صفت انسان حضرت عمر رضؓ کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ اس مظاہرے میں غیظ و غضب تھا۔ نفرت و حقارت تھی ــــ جوش انتقام تھا ــــ درندگی اور وحشت کے کڑے تیور تھے اور ان سب کے پس منظر میں دلوں کے اندر چٹکیاں لیتا ہوا یہ احساس شکست تھا کہ کفر کی بہترین تلوار اسلام پر گھمتے گرتے خود کفر کے سر پر بجلی بن کر گر گئی! ــــ کفار و مشرکین کے جذبۂ انتقام سے بچانے کے لئے حضرت عمر رضؓ کے ماموں نے اعلان کیا کہ "عمر رضؓ ان کی پناہ میں ہیں" مگر تلوار کی طرح کاٹتی ہوئی سیکڑوں نظروں پر نفرت و حقارت کی نگاہ ڈالتے ہوئے حضرت عمر رضؓ نے اعلان کیا کہ وہ اس پناہ سے خود کو نکالتے ہیں اور بڑے سے بڑے خطرات کو محض خدا کے بھروسے پر پوری قوت سے للکارتے ہیں۔

اور سچ مچ وہ چھ سال تک ان خطرات سے بے محابا ٹکراتے رہے ــــ ظلم و سفاکی کی تمام شیطانی قوتوں کو للکارتے رہے ــــ اور ٹھیک اس دور میں جب کہ کفر و شرک کی قہرمانی طاقت اس بات کی

قسم کھا رہی تھی کہ اہل ایمان کو ان کے گھروں میں بھی خدا کا نام نہ لینے دیں گے حضرت عمرؓ نے تین سو ساٹھ بتوں پر اس طرح ٹھوکر ماری کہ اہل ایمان کے ساتھ خانہ کعبہ میں گھس کر نماز پڑھی ـــ ظلم و ستم اور درندگی و بربریت کے جنگل میں پانچ چھ سال کا عرصۂ طویل بسر کرنے بعد جب انھوں نے خدا کی راہ میں وطن کو قربان کر کے ہجرت کا قصد کیا اور حضورؐ نے ان کو اس کی اجازت دیدی تو انھوں نے اعلان کیا:۔

"میں اس کفرِ و شرک کی دنیا سے دور جا رہا ہوں ـــ جس کسی کا جی چاہے وہ میرا تعاقب کرے اور میری تلوار کا ذائقہ چکھ لے!"

لیکن بھری بستی میں سے کوئی مقابلہ پر نہیں آسکا ـــ کیسے آسکتا تھا کوئی؟ جب مخبر صادقؐ کا کہنا تھا کہ "اے عمرؓ! تم سے شیطان بھی ڈرتا ہے!"

ہاں تاریخ اس انسان کو کبھی نہیں بھول سکتی جس سے شیطان خوف کھاتا تھا تاریخ جانتی ہے کہ یہ ہستی وہ ہستی تھی جس کے سینے میں پیغمبرِ خداؐ کی دعا کے سوز سے خدا نے ایمان کی جوت جلائی تھی، مگر یہ بات کم ہی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ پیغمبرؐ کی اس دعا کی عملی تشکیل کے لئے خدا نے اسباب ظاہر کی دنیا میں جس ہستی کا انتخاب کیا وہ ایک عورت تھی! ـــ ایک کمزور عورت جس نے درد و کرب کی یورش میں پستے ہوئے کہا تھا۔

"اے عمر! ـــ جو بن آئے کر گزرو! ـــ اب اسلام اس دل

سے نہیں نکل سکتا۔"

نہ جانے کیسے ہوتے تھے وہ "دل" جن میں ایک بار اسلام داخل ہو جاتا تھا تو پھر کبھی نہیں نکلتا تھا ــــ اور نہ جانے کیا چیز تھا وہ اسلام وایمان کہ اس کی ایک ہی آواز کفر کے مقفل تالوں کے فولادی پٹ کھول دیتی تھی ــــ جس کی ہوک سے وہ انسان عرفانِ حق کا عظیم داعیہ حاصل کرتے تھے کہ جن کے ایمان کے جلال سے شیطان بھی برگِ حشیش کی طرح کانپتا تھا۔

اور اب ــــ آہ اب ہمارے پاس نہ وہ سینے رہے اور نہ وہ اسلام وایمان ــــ اب تو ہم اسلام کی آواز بلند کرتے ہیں تو خود ہماری زندگی بھی اس کا کوئی اثر نہیں لیتی ــــ ہمارا اپنا جمود بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

خدارا! ــ کوئی بتاؤ کیا یہ دونوں اسلام ایک ہیں؟ ــــ ایک ہو سکتے ہیں؟ روح اس تصور ہی سے لرز اُٹھتی ہے کہ کیا۔۔۔۔ ہم بھی۔۔۔۔ مسلمان ہیں؟ ــ کیا۔۔۔۔ ہم۔۔۔۔ بھی اس قابل ہیں کہ خدا کی اس زمین پر کھڑے ہو کر سر اٹھا کر یہ کہہ سکیں کہ ہاں ہم مسلمان ہیں! ــــ جب یہاں یہ عالم ہے تو پھر ــــ وہاں کیا حال ہوگا جہاں سب کچھ دیکھنے اور جاننے والا خدا ہمارے بارے میں فیصلہ کر رہا ہوگا۔

فیالیتنا فیاحسرتا۔ تجلی ستمبر ۶۴ء

ایمان — جمال و جلال کا دو آتشہ

خدا کی قسم !—

"خدا کی قسم !! میں اس شخص کا سر اڑا دوں گا جو یہ کہے گا کہ میرا محبوب آقا اس دنیا سے چلا گیا ہے"

وفات رسول ؐ کے جاں کاہ اور ہوش ربا حادثے پر حضرت عمر فاروق رضؓ کی عجیب حالت تھی۔ زندگی بھر وہ جس انسان کاملؐ کو دنیا جہان کی ہر شے اور خود اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتے رہے تھے اس ہستی کا اس دنیا سے اٹھ جانا کتنی بڑی چوٹ تھی۔ عشق رسولؐ سے جو دل چور چور تھا یک لخت چکنا چور ہو گیا تھا اور ہوش و حواس ایک زبردست خوں چکاں جنون کے سامنے سے ہٹ کر نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ لاکھوں ٹوٹے ہوئے دلوں سسکتے ہوئے سینوں اشکبار آنکھوں اور لرزتے ہوئے خشک ہونٹوں کے درمیان سے خدا کے آخری رسولؐ اپنے خدا کے پاس تشریف لے جا چکے تھے مگر یہ ایک ایسی فلک شگاف حقیقت تھی جس کو سہنا تو دور کی بات ہے اس کو سننے کی تاب و تواں بھی حضرت عمرؓ کھو چکے تھے — وہ دیوانوں کی طرح مسجد نبوی میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے — ننگی تلوار کے دستے پر ہاتھوں کی فولادی گرفت میں تشنج کی کیفیت

پیدا ہو رہی تھی اور جذب و جنوں کی یہ للکار ان کے ہونٹوں پہ رہ رہ کر تڑپ اٹھتی تھی۔

"خدا کی قسم!۔۔۔ میں اس شخص کا سر قلم کر دوں گا جس نے یہ کہا کہ محمدؐ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔۔۔۔۔

خدا کی قسم!۔۔۔۔۔

توحید و رسالت پہ جی جان سے فدا ہونے والا کیسا قابلِ رشک بندۂ مومن تھا یہ شخص!!۔۔۔ یہ کہاں سے چلا تھا اور۔۔۔ کہاں جا پہنچا!! حق سے بے خبری کے دور میں ایک دن ایسا بھی آیا تھا جب۔۔۔ یہی انسان تلوار سونتے محمدؐ کو شہید کر دینے کی قسم کھاتا ہوا نکلا تھا لیکن جوں ہی قرآن کے افق سے ابلتی ہوئی روشنی کو دیکھ کر اس نے روح و دل کی محرابوں پہ ایمان و عرفان کا چراغاں کیا بس اسی لمحہ اس نے اپنی اسلام سے پہلے کی ساری زندگی پر وہی تلوار بے دریغ چلا دی۔ پھر جنگِ بدر کے صبر آزما محاذ پر اس کی یہ تلوار بجلی بن کر چمکی اور ایمان کے مقابلے میں نسل و خون کے تمام رشتوں کو زہرہ گداز للکار سناتی چلی گئی۔ اس کا اپنا ماموں عاص بن ہشام بھی خدا اور رسولؐ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی جسارت بے جا کرنے کے بعد اس کی غیرتِ حق کی ننگی تلوار کے آگے اپنی جان سلامت نہ لے جا سکا! جن ہاتھوں نے خدا کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے وہ ہاتھ اس نے قلم کر دیئے اور جس سر نے خدا کی عظمت کے آگے جھکنے سے انکار کیا تھا اس کو خاک و خون میں ہمیشہ

کے لئے سرنگوں کر دیا۔ پھر خون و ایمان اور جسم و جان کے درمیان جہاد و عزیمت کی عظیم گھاٹیاں طے کرنے کے بعد اس نے اسلامی پرچم کے قدموں میں بڑے بڑے مکی کافروں کو جنگی قیدیوں کی شکل میں پابجولاں پڑا ہوا دیکھا تو وہ بیساختہ پکار اٹھا:۔

"ان لوگوں کی جاں بخشی نہ کی جائے جو جہاں آفریں کے ذلیل باغی ہیں۔ یہ سب کے سب گردن زدنی ہیں ___ آؤ ہم میں سے ہر شخص آگے بڑھے اور یہ بتائے کہ یہ خدا کے نہیں تو ہمارے بھی کچھ نہیں ___ آؤ ہم میں سے ہر شخص ان میں سے اپنے اپنے قریبی عزیزوں کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر کے خدا کے قدموں میں ڈال دے ....."

___ پھر غزوہ اُحد میں بھی تلوار چمکی ___ آہن و فولاد کا جگر چیرتی ہوئی تلوار ___ باطل کی سنگلاخ چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرتی ہوئی تلوار! ___ لیکن جیسے ہی محمدؐ کی شہادت کی جھوٹی خبر میدان کارزار میں اس کو سنائی دی اس کے بازو یکایک شل ہو گئے اور اس کی کوہ افگن ہمت موم کی طرح پگھلتی چلی گئی ___ لیکن یہ سنتے ہی کہ محمدؐ ہمارے درمیان زندہ سلامت ہیں وہ شیر نر کی طرح اٹھا اور اس وقت بھی غیرت حق کی گرج سے باطل کا سینہ دہلاتا رہا جب فتح یاب اسلام کچھ لوگوں کی لغزش کی بنیاد پر شکست کے خونچکاں معنی سمجھا رہا تھا ___ جب پہاڑ کی چوٹی پر زخموں سے چور چور مومن پیغمبر اسلامؐ کے مقدس چہرے کو خون سے شرابور دیکھ کر تڑپ رہے تھے اور اپنے گھائل ہاتھوں سے حضورؐ کے زخم دھو رہے تھے تو عمرؓ نر شیر کی طرح

ابوسفیان کے نعرۂ کفر کے خلاف یوں گرج رہے تھے ۔۔

"اللہ ۔۔ سب سے عظیم ہے ۔۔ اللہ کی بڑائی کی کوئی حد نہیں ۔

اور ۔۔ اللہ ہمارا ہے تمہارا نہیں ۔۔۔

سُن لے او دشمنِ خدا کہ ہم سب زندہ ہیں ۔۔۔ محمدؐ بھی زندہ ہیں ۔۔

ابوبکرؓ بھی اور عمرؓ بھی ۔۔۔۔۔ تاکہ کفر کو کیفر کردار تک پہنچا کر دم لیں ۔۔۔"

غزوہ خندق کی برفانی راتیں بھی پھر عمرؓ کے سوزِ دروں کو ٹھنڈا نہ کر سکیں ۔۔ خندق کے جس کنارے پر وہ حضورؐ کے ارشادِ گرامی پر آتش بار دن اور یخ پوش راتوں میں ایک زبردست چٹان کی طرح باطل کے ٹڈی دَل کے خلاف سینہ سپر رہے تھے وہاں آج بھی اس مومنِ حنیف کی یادگار میں "مسجد عمرؓ" قبلہ رو کھڑی ہے ۔۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عمر بن خطاب نے تیروں کی بوچھار اور تلواروں کی چھاؤں میں جہاد و عزیمت کی نماز پڑھی تھی ۔ صلح حدیبیہ کے نازک موقعہ پر جب خدا کی دُور رس مصلحتوں کے اشارے سے اللہ کے رسولؐ کفرِ شرک کو بظاہر دب کر دعوتِ صلح و آشتی دے رہے تھے تو عمر فاروقؓ کی بیتابیٔ حق دیدنی تھی ۔ ان کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ جب تک عمرؓ کے ہاتھ میں تلوار اور سینے میں حق کی تپش ہے وہ کس طرح یہ منظر دیکھنے کی تاب لائے کہ دعوتِ صلح و آشتی کے لئے حضورؐ کو ذرا بھی دبنا پڑ رہا ہے ! ۔۔ ہائے وہ حسین حدِ ادب میں ان کی غیرتِ حق کا اضطراب ۔۔ ہائے وہ بارگاہِ رسالت میں خدا کے اس جاں نثار بندے کا بچوں

کی طرح چلنا ! :

"اے خدا کے رسول ص !..... کیا ...... مومن نہیں ہیں ؟

لیکن اللہ اللہ ! وہ عظیم جذبہ تسلیم و رضا کہ جیسے ہی غیرتِ حق نے اس نیم بسمل کو محمد ص کی زبان سے یہ پتہ چلا کر جو کچھ ہو رہا ہے مشیتِ خداوندی کے ٹھیک ٹھیک اشارے پر ہو رہا ہے تو دنیا نے دیکھا کہ حضرت عمر رض فوراً سجدۂ اطاعت میں گر گئے ـــــ سجدے سے سر اُٹھایا تو قدم قدم پر ایمان بالغیب کو درجۂ عین الیقین تک پہنچانے والے واقعات پیش آئے اور اسلام کی اس شانِ مغلوبی کے افق سے فاتحانہ مستقبل کے ہزار آفتاب نمودار ہوتے چلے گئے۔

"اے خدا کے رسول ص !" ایک دن حضرت عمر رض نے حضور ص کو دیکھ کر والہانہ انداز میں عرض کیا "مجھے اپنی جان کے سوا دنیا جہان کی ہر شے سے زیادہ آپ ہی عزیز ہیں ....!"

یہ اس شخص کے بھاری الفاظ تھے جس کی زندگی غزوۂ تبوک کے موقعہ پر فرطِ عشق سے دو نیم ہو گئی تھی ـــــ جس نے پوری زندگی اور متاعِ زندگی کے بیچ بیچ دو برابر ٹکڑے کر کے ایک فرائض دنیا کے لئے گھر چھوڑا تھا اور دوسرا دین کے بادشاہ کے قدموں میں صرف ایک جنگی مہم کے لئے لا ڈالا تھا ـــــ اُف ! کتنے بھاری ہوتے ہیں اس شخص کے الفاظ جس کی عملی زندگی کا ہر قدم جذبہ و جنوں الفاظ سے آگے ہی آگے ہو۔ ہمیشہ آگے ہی آگے ! بلکہ "تکمیلِ ایمان" کی منزل تو آسمانوں سے بھی بلند ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے لفظ و کردار کا اتنا عظیم سفر بھی کافی نہ تھا ـــــ ایک عشق ہی اس منزل جس کا طالب بنے جذبہ و جنوں سے

پر لگا کر خدا کی سمت اڑتا ہے تو سارے جہان کے ساتھ خود اس کی اپنی جان کی محبت بھی اس کو پکارتی ہوئی پیچھے پیچھے پھڑپھڑاتی ہی رہ جاتی ہے مگر عشق رسولؐ کا پروانہ اس وقت تک نہیں رکتا جب تک شمع توحید کے طواف شوق میں اس کا وجود کچھ کام نہ آجائے۔

"نہیں عمرؓ" سرکارؐ نے جواب دیا "ایمان تو پورا جبھی ہوگا جبکہ میں تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز محسوس ہونے لگوں۔"

یکایک ایک بجلی سی چمکی، ایک خاموش زلزلہ سا آیا اور پھر اسی آن عمرؓ کے سینے میں عشقِ رسولؐ کے جذبات سیل بیکراں میں تبدیل ہوتے چلے گئے — منزل تکمیل تک پہنچنے میں صرف ایک قدم کا فاصلہ دیکھ کر کمال ایمانی کے لئے ترستی ہوئی زندگی نے جست کی اور چشم زدن میں کمال ایمانی کی منزل کو چھو لیا۔

"اے خدا کے رسولؐ" روح عمرؓ نے حضورؐ کو ہمیشہ سے زیادہ والہانہ عالم میں پکارا "اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

اس دن وہ بزم رسولؐ سے ایک نئی تب و تاب لیکر اُٹھے — اور پھر عمر بھر اس تب و تاب نے ان کو کہیں چین سے بیٹھنے نہ دیا — اس میں نہ جانے کس بلا کا سرور و سکون تھا کہ عیش و عشرت ان کے پاؤں پڑتی تھی مگر وہ اسے ٹھوکر مارتے تھے — لذتیں ان کے ہاتھوں کو چومتی تھیں مگر وہ دونوں ہاتھوں کو گھبرا گھبرا کر جھٹکتے تھے — اینٹ پتھر اور سونے چاندی کی اس دنیا میں بیٹھ کر وہ تو ہر لمحہ سوتے جاگتے خدا کے ان سدا بہار باغاتِ خلد کو اشک آلود اور پرشوق نظروں سے

سنکے جارہے تھے جن کے کنارے ابدی نہریں ابدیت کی حسین ترین موسیقی بکھیرتی ہوئی بہہ رہی ہیں بہتی چلی جارہی ہیں ــ نجانے کہاں سے ــ نجانے کہاں تک !! ــ ادماں چمنستانوں کی سمت اسوۂ رسول ؐ کے نقوش پا پر دیدۂ و دل فرش راہ کئے وہ بڑھے چلے جارہے تھے ــ سراپا اُمید ــ سراپا خشیت ! ــ سراپا شوق ــ سراپا اضطراب ــ سراپا درد! ــ سراپا درماں !! ــ ہائے وہ فنائیت کا حسین ترین منظر جس کو انسان کی تاریخ نے سراپا نگاہ بن کر دیکھا اور ہزار زاویوں سے اسکی تصویریں کھینچیں ۔

حضور ؐ کی زندگی کا یہ پہلو حضرت عمرؓ کے سامنے تھا کہ حق اپنی فتح و کامیابی کے لئے ساز و سامان کا محتاج نہیں ــ ایک اکیلا انسان محض خدا کے بھروسے پر کفر و زندگی کے ہولناک جنگل میں کھڑا ہوکر حق کی آواز بلند کرسکتا ہے ــ تیرہ سال تک ظلم و استبداد کی بدترین چکّی بھی انسانی ہڈیوں کو تو پیس ڈال سکتی ہے مگر اس حق کی آواز کو کچل نہیں سکتی ــ اس حق و صداقت کے محض تین سو تیرہ بے سر و ساماں شیدائی تیرہ سالہ مظلومیت کا خون ٹپکاتے ہوئے اُٹھتے ہیں تو محاذِ بدر پر سیکڑوں خوں آشاموں کی کلائیاں موڑ دیتے ہیں اور آخر آخر ــ فتح مکّہ کے روشن دروازے سے یہی حق ــ "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" کا رجز چھیڑتا ہوا آتا ہے تو باطل کو نہ زمین پر پناہ ملتی ہے اور نہ انسان کے تنگ و تاریک سینوں میں۔

خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی حضرت عمرؓ حضور ؐ کے اسی اسوۂ حسنہ پر بے جھجک چلتے گئے ــ انھوں نے جزیرہ نمائے عرب

سے چٹیل ریگستان میں کھڑے ہو کر باغات اور کھیتیوں سے لدی ہوئی
سرزمینوں کو للکارا ۔۔۔ قیصر و کسریٰ کی طاقتوں کو خدا کے اقتدارِ اعلیٰ
کا جلال انگیز پیام بھیجا تو سیکڑوں سال کی درفش کاویانی کے پرخچے
اُڑ گئے ۔۔۔ قیصر کی سطوت و شکوہ کو نعرۂ تکبیر سے پاش پاش کر ڈالا
فراعنۂ مصر کی سرزمین پر آسمانی قانون کا نفاذ کیا۔

حق کے دفاع میں ایک اٹل چٹان بن جانا اور حق کی پذیرائی میں
موم سے زیادہ نرم ہو جانا انھوں نے اپنے آقا سے سیکھا تھا یہ بات
ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھی کہ عظیم الشان مہمات کے قائد حضرت سعدؓ ابن
وقاص کے قصر کوفہ کی ڈیوڑھی کو آگ لگانے کا حکم دیدیں کیونکہ اندیشہ
تھا کہ یہ ڈیوڑھی حاکم و محکوم کے درمیان انصاف کی راہ میں دیوار بن کر
حائل ہو گی ۔۔۔ انصاف جو تقویٰ سے قریب ترین نسبت رکھتا ہے
اس کی حفاظت کی گئی اور حضرت سعدؓ بن وقاص کی آنکھوں کے سامنے
حضرت عمرؓ کے ایلچی نے اس ڈیوڑھی کو نذر آتش کر دیا۔ ان کے لئے
یہ بھی کچھ دشوار نہ تھا کہ حضرت خالدؓ بن ولید کو عین میدان جنگ میں
اس لئے سپہ سالاری سے معزول کر دیں کیونکہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ
اسلامی فتوحات کے لئے خاص خدا کی طرف دیکھنے کے بجائے
لوگ خالدؓ کی تلوار کی طرف دیکھنے لگے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے لئے
بہت آسان تھا ۔۔۔ لیکن یہ بات ان کے بس ہی میں نہ تھی کہ کوئی بھی
شخص ۔۔۔ معمولی سے معمولی شخص اُٹھ کر انھیں خدا سے ڈرائے اور وہ
خوف و خشیت کی شدت سے برگِ حشیش کی طرح کانپ نہ جائیں۔
ایک بار دورِ خلافت میں جب وہ کسی مسئلے پر تقریر کر رہے

تھے تو ایک معمولی سا شخص بیچ تقریر میں کھڑا ہو گیا اور تلخ و کرخت لہجے میں بولا :۔

"اِتَّقِ اللّٰہ ۔۔۔ یا عُمرؓ! ۔۔۔ اے عمر! اللہ سے ڈر!" ایک ہی تقریر میں ایک ہی شخص نے یہ مداخلت بار بار کی تو تمام حاضرین اس بے محابا اندازِ تنقید پر چراغ پا ہو گئے اور چاہا کہ اس آدمی کا منہ بند کر دیں ۔ لیکن وہ بندۂ مومن جو کمال صبر سے برسرِ منبر یہ تنقیدی کچوکے مسلسل سہہ رہا تھا اور اُف تک نہیں کر رہا تھا۔ لوگوں کے اشتعال پر خفا ہو گیا۔

"نہیں۔ نہیں" خوف و خشیت میں ڈوبی ہوئی آواز حضرت عمرؓ کے منہ سے بیتابانہ نکلی "نہیں، نہیں! کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں تو یہ بے مصرف ہیں اور ہم نہ سنیں تو ہمارا مصرف کوئی نہیں ۔"

ایک بار زرِ مہر کو گھٹانے کے لئے انہوں نے امیر المومنین کے عظیم الشان منصب سے امت کو خطاب کیا کہ یکایک دوران تقریر میں ایک عورت نے کتاب و سنت کے حوالے سے حضرت عمرؓ کی تردید کرتے ہوئے پوری قوت سے کہا :

"اے عمر! ۔۔۔ اللہ سے خوف کھا !"

اور عمرؓ کو فوراً خشیتِ الٰہی نے پکڑ لیا۔ وہ پورے جوش سے بولتے بولتے اس آواز پر گنگ ہو گئے۔ اور کھڑے کھڑے کانپنے لگے۔

مدینے کی عورتیں بھی "حق کے آگے بے تکلف ہتھیار ڈالتے اور اس خاتون کو خراجِ عقیدت نذر کرتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا "مدینے کی عورتیں بھی عمرؓ سے زیادہ جانتی ہیں ۔"

اسوۂ رسول ؐ کی ان کو کیسی چاہت تھی اس کا کچھ اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے جو مسلم و نسائی میں حضرت جابر رضؓ سے منقول ہے ۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدیہ میں آئی ہوئی ایک دیبا کی حسین قبا زیب تن فرمائی ۔۔۔ لیکن اس پیکرِ عبودیت کو دیر تک اس کو پہنے رہنا گوارا نہ ہوا ۔ بہت جلد آپ ؐ نے اسکو اتار دیا اور حضرت عمر رضؓ کو یہ تحفہ بھجوا دیا ۔ کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ یہ بیش قیمت تحفہ لئے ہوئے حضرت عمر رضؓ بارگاہ رسول ؐ میں دوڑے ہوئے آئے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز گلوگیر تھی ۔

" حضور ؐ " وہ بچوں کی طرح رو پڑے " میں اس چیز کو آخر کیا کروں جس کو آپ نے ناپسند فرمایا ہے ..... ؟

سنتِ رسول ؐ کے پروانے کو اُس وقت قرار آیا جب یہ پتہ چلا کہ حضور ؐ نے یہ قبا پہننے کے لئے نہیں بھیجی تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ اس کو فروخت کر کے اسکی رقم کو بہترین مصرف میں لایا جائے ۔

ٹھیک اس وقت جب فقر و فاقہ کی طویل آزمائش میں کھرا اترنے کے بعد اللہ کے بندوں پر دنیا کشادہ ہو رہی تھی ۔۔۔ سونے چاندی کا ایک سیلاب تھا جو قیصر و کسریٰ کے مفتوح خزانوں سے بہتا چلا آ رہا تھا ۔۔۔ غریب خوشحال ، اور محتاج مالا مال ہو رہے تھے ۔۔۔ ہاں ٹھیک اسی وقت عمر رضؓ دولتِ دنیا سے دامن سمیٹ کر موتوا قبل اَن تموتوا کی زندہ تصویر بنتے جا رہے تھے خدا سے ملاقات کی آرزو میں گم ہو کر انھوں نے خود کو جیتے جی کفن پہنا لیا تھا ۔ جنت میں خدائے غفور و رحیم کی میزبانی کے تصور میں

غرق وہ تخت خلافت پر بیٹھے ہوئے موٹے چھوٹے کھانے کھاتے تھے اور بھوکوں کا پیٹ بھرنے کے لئے ایک مزدور کی طرح غلے کی بوریاں ڈھو ڈھو کر بھوکوں کے گھر پہنچاتے تھے۔ ایسی ہی تو ایک رات تھی جب ایک دور افتادہ جھونپڑی میں چولہا ٹھنڈا پا کر وہ بیت المال تک ہانپتے کانپتے آئے تھے اور پھر وہاں سے کھانے کا بھاری سامان اپنی کمر پر لادے ہوئے لرزاں و ترساں اسی دور افتادہ مسکن کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ غلام التجائیں کرتا ہوا پیچھے پیچھے دوڑا کہ آپ تھکان سے چور ہیں خدارا یہ بوجھ میری کمر پر لاد دیجئے ــــ ورنہ آخر میرے وجود کا مقصد ہی کیا ہے؟ ــــ مگر حضرت عمرؓ کو یہ کہاں ہوش تھا کہ ان کے وجود کا مقصد کیا ہے۔ انھیں تو خود اپنا مقصد حیات تڑپائے ہوئے تھا ــــ وہ تو خدا کے بندے تھے اور انھیں اپنی رعایا کے دکھ درد کا پورا احساب خدا کو دینا تھا۔ جب غلام نے بہت زیادہ اصرار کیا تو ان الفاظ میں انھوں نے دل و جگر کا لہو نچوڑا ــــ

"بتا کیا اس دن بھی جب خدا کی عدالت میں میرے لئے پکار لگ رہی ہوگی تو میرا بوجھ اٹھا سکے گا ...؟"

حضرت امام حسنؓ کا بیان ہے کہ امیر المومنینؓ کی عظیم الشان حیثیت سے حضرت عمرؓ امت اسلامیہ کے سامنے خطبۂ جمعہ پیش فرما رہے تھے اور ٹھیک اس وقت جب وہ اللہ کے بندوں کو آخرت کی گھاٹیاں یاد دلا کر اللہ کے جلال سے لرزہ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ اللہ کا یہ عاجز بندہ پورے بارہ پیوند کا تہبند باندھے ہوئے ہے۔

اس دنیا میں کسی بھی وقت ان کو اپنے لٹ جانے کا اتنا یقین

تھا کہ ایک ہی جوڑے کو خود دھوتے اور سکھاتے ہوئے وہ اس سرائے فانی میں اپنے دن کاٹ رہے تھے۔ یہ جوڑا پھٹ کر بھی بدن سے جدا نہ ہوتا تھا۔ اس پر خود بھی پیوند لگاتے اور پیوند بھی جواب دیدیتا تو یہ لباس فقر۔ ہائے یہ لباس تقویٰ پیوند در پیوند اور پیوند بالائے پیوند کے غیرت خیز مرحلوں سے گذرتا تھا۔ انس رضی ابن مالک سے پوچھیئے کہ کیا انھوں نے خطاب کے بیٹے کے بدن پر زمانہ خلافت میں وہ کرتا نہیں دیکھا تھا جس کے پر پیوندوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا!

خدا کی قسم! یہ لباس گواہی دے رہا ہے کہ عمرؓ بن خطاب سچے دل سے بس خدا کے خریدار تھے اور خدا کے خریدار کو دولت دنیا کے خزانے کبھی نہیں خرید سکتے۔ اسی ایمان افروز گدڑی میں وہ اسلامی قلمرو کے شاہی معائنوں پر تشریف لے جاتے اور بڑی بڑی سلطنتوں کے کج کلاہوں سے آنکھیں چار کرتے تھے۔ فلسطین کی مہم پر جب ان کو بنفس نفیس روانہ ہونا پڑا تو جسم پر وہی پارہ پارہ پیوند لگا کرتا تھا۔ سر پر وہی پھٹا ہوا عمامہ تھا اور پاؤں میں وہی ٹوٹی ہوئی جوتیاں۔ سواری ضرور ان کے ساتھ تھی مگر یہ سواری جب عیسائیوں کے فلسطین میں داخل ہو رہی تھی تو سواری کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی اور سوار وہ غلام ہمراہی تھا جس کی سواری کی باری اس مقام پر آگئی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ دن بدن بڑھتی پھیلتی چمکتی دمکتی اسلامی سلطنت کا یہ خدا ترس "فرماں روا" دن بدن خود کو قبر ہی میں اتارے چلا جا رہا ہے۔ ایک بار ان کے پاس امہات المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت

حفصہ رضہ کا وفد پہنچا اور صورتِ حال کی نزاکت سمجھائی۔

"آپ اپنے لباس کی طرف تھوڑی سی توجہ فرمائیں — آپ کو قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے ملنا پڑتا ہے اور مسلمانوں کو شرم آتی ہے...."

"افسوس!" آہ سرد کھینچتے ہوئے حضرت عمر رضہ نے کہا "افسوس! تم دونوں اُمت کی مائیں ہو کر مجھے دنیا طلبی کی ترغیب دے رہی ہو! اے عائشہ رضہ! کیا تم رسول اللہ صلعم کی اس حالت کو بھول گئیں کہ تمہارے گھر میں صرف ایک کپڑا تھا جس کو دن میں بچھایا جاتا اور رات کو اوڑھ لیا جاتا۔ اور اے حفصہ رضہ! تم کو یاد نہیں کہ ایک بار تم نے فرشِ خواب کو دوہرا کر کے بچھا دیا تھا تو رسول اللہ صلعم اس نرمی کے باعث رات بھر سوتے رہ گئے، اور پھر بلال رضہ کی آذان پر گھبرا کر حضور کی آنکھ کھلی تو آپ نے تمہارے اس عمل پر اظہارِ غم کرتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے راحتِ دنیا سے کیا سروکار — اور فرش کی نرمی سے تم نے مجھے کیوں غافل کر دیا؟"

نہ جانے کس عالم میں حضرت عمر رضہ دردِ دل بکھیر رہے تھے کہ امہات المومنین بے اختیار رو پڑیں اور دیر تک روتی رہیں — تو حضرت عمر رضہ کا پورا وجود جیسے آنسوؤں میں بہہ رہا تھا۔

ایک مرتبہ اقلیم فقر کا یہ دلق پوش شہنشاہ سفرِ شام پر نکلا تو وہاں کے مسلمان افسروں کو دیکھا کہ وہ پر تکلف حریر و دیبا کی قباؤں میں ان کا شاہانہ استقبال کرنے آئے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان کا چہرہ کبھی شدتِ غم سے زرد ہو تا تھا تو کبھی غصے کے مارے

تمتما اُٹھتا تھا یہ احساس ان کی دھڑکنوں پر تیشہ زنی کر رہا تھا کہ سلطنت کے عظیم پھیلاؤ کے ساتھ وہ "فقر" سمٹ رہا ہے۔ جس پر حضورؐ فخر کرتے تھے اپنے اس استقبال و اعزاز پر وہ اپنے ہاتھ سے خاک ڈالتے ہوئے غم و غصہ کے عالم میں آگے بڑھے اور ان پر تکلف پوشاکوں پر سنگریزے مارتے ہوئے بولے:۔

تم !..... تم ..... اس وضع میں میرا استقبال کرتے ہو؟!۔

انھوں نے احنف بن قیس کو ایک جماعت کے ساتھ عراق کی تاریخی مہم پر روانہ کیا تھا۔ یہ لوگ وہاں سے فاتحانہ پلٹے تو ان کے جسم پر زرق برق ملبوسات نظر آرہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دل پر یہ تبدیلی تیر بن کر لگی۔ اس قدر خفا ہوئے کہ ان لوگوں کو دیکھ کر غصے سے مُنھ پھیر لیا ــــ جلال عمرؓ سے سہمے ہوئے یہ لوگ دربارِ خلافت سے اُٹھ آئے اور عرب کی سادہ پوشاک پہنکر دوبارہ حاضر خدمت ہوئے۔ اب ان کو حضرت عمرؓ نے دیکھا تو خوشی کے مارے بے قابو ہوگئے ــــ بیتابانہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور ان سب کو ایک ایک کرکے سینے سے چمٹایا۔ اور اس طرح حق پسندوں کے دامن سادگی کو خوشی اور قدر شناسی کے اشکوں سے تر کر دیا۔

ہائے یہ اللہ کا بندہ جب خلافت کے خزانوں کی کنجیاں جیب میں ڈالے ہوئے سرکاری اسفار کے مواقع پر بے تکلف پیڑوں کی چھاؤں میں اور فرش خاک پر لیٹ جاتا تھا تو دیکھنے والوں کو اس حقیقت کا کیسا کیسا یقین آتا ہوگا کہ مومن کا گھر تو بس خدا کی جنت ہی ہے اور اس جہان فانی میں تو اس کی حیثیت ایک مسافر

بلکہ محض ایک "راہگیر" کی ہے اور بس۔ سفر شام کے موقع پر جب اسلام کی فاتح قوتوں نے ان کو ایک قیمتی پوشاک نذر کرنی چاہی اور سواری کے لئے ایک صبا رفتار ترکی گھوڑا حاضر خدمت کیا تو انھوں نے درد بھرے انداز میں کہا:۔

"خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے تو وہی بس ہے۔۔۔۔"

وہ دل کی گہرائیوں سے اللہ کے غلام تھے۔ اس لئے غلاموں کا درد ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اس طرح وہ حضورؐ کی اس پرسوز وصیت پر جان و دل سے عمل پیرا ہوئے جو آپؐ نے دنیا سے جاتے جاتے حجۃ الوداع کے موقعہ پر یہ تاکید کی تھی اور بستر وفات پر جب آواز نے ساتھ چھوڑ دیا تھا تو اپنے لبوں کی آخری حرکت سے یہ درد بھری تنبیہ فرمائی تھی کہ:۔

"نماز!۔۔۔ نماز!۔۔۔ اور وہ جو تمہارے دست نگر۔۔۔ ہیں۔۔۔۔"

چنانچہ حضرت عمرؓ نے تخت خلافت پر آتے ہی عربی غلامی کو بیک قلم ختم کر ڈالا تھا اور غلام نوازیوں کا شاندار اسوہ پیش کر کے گویا ہر قسم کی انسانی غلامی کے جسم سے جان ہی نکال دی تھی۔

آپ اپنی کمر پر لاد لاد کر بیت المال سے سامان خورد نوش لے جاتے اور رات کے پرسکون لمحوں میں غلاموں کو پاؤں پھیلا کر سوتا ہوا چھوڑ کر یہ سامان بہ نفس نفیس غریبوں کو اور محتاجوں کے دور افتادہ محلوں میں تقسیم فرماتے تھے۔۔۔ فلسطین کے تاریخی سفر میں

ان کی سواری پر ان کا غلام سوار تھا اور وہ خود ایک غلام کی طرح سواری کی باگ پکڑے ہوئے اپنے لباس اور قدموں کو گرد آلود کرتے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ ایک دن صدقہ کے کسی اونٹ کے بدن پر تیل کی مالش اپنے ہاتھوں سے کرتے ہوئے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے کہ کسی مسلمان نے پاس آکر دکھ بھری شکایت کی " یہ کام آپ خود کیوں کر رہے ہیں اے مومنوں کے سردار!۔۔۔ کسی غلام سے یہ خدمت لے لی ہوتی۔۔۔۔۔"

تیز اور تلخ انداز میں آپ نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ جیسے کہنے والے نے ان کی عزت افزائی نہیں توہین کی تھی۔

" آخر مجھ سے بڑھ کر غلام کون ہو سکتا ہے؟" آپ نے پلٹ کر جواب دیا " جو شخص مسلمانوں کا والی ہے وہ ان کا غلام بھی ہے۔" کہنے والا اپنا سا منہ لیکر چلا گیا اور حضرت عمرؓ پھر اسی کام میں جٹ گئے

خلافت ہی کا زمانہ تھا اور حضرت عمرؓ سر پر چادر ڈالکر کسی خدمت خاص پر روانہ ہوئے تھے واپسی میں۔ بری طرح تھک گئے تھے۔ دیکھا کہ ایک غلام گدھے پر سوار جا رہا ہے آپ نے اس کو آواز دی اور کہا۔

" میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا کر لے چلو۔۔۔۔۔۔"

یہ سننا تھا کہ غلام فرطِ ادب اور کمال مسرت کے عالم میں سواری سے اُتر کر کھڑا ہو گیا اور بولا:۔

" اے امیر المومنین! بسر وچشم! یہ سواری پوری کی پوری حاضر خدمت ہے۔۔۔"

"نہیں" حضرت عمرؓ نے صاف صاف جواب دیا ۔۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں میری وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑے ۔۔"

"تو.... پھر کیا حکم ہے؟"

"تم جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھ جاؤ" حضرت عمرؓ نے سیدھا سادہ حل پیش کرتے ہوئے کہا" اور میں تمہارے پیچھے بیٹھ جاؤں گا۔"

چنانچہ غلام کو بجبر و اکراہ ایسا ہی کرنا پڑا۔ جب یہ عجیب و غریب سواری مدینے کی گلیوں میں داخل ہوئی تو لوگ حیرت کے مارے یہ منظر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر اشارے کر رہے تھے" دیکھ رہے ہو! ۔۔ غلام کہاں بیٹھا ہوا ہے اور امیر المومنین کہاں! ۔۔"

ایک بار صفوان بن اُمیّہ نے ان کی خدمت میں لذیذ دسترخوان سجا کر بھیجا تو اس دسترخوان کے چاروں طرف فقیروں اور غلاموں کی بھیڑ جمع کر لی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر یہ کھانا کھایا اور کھلایا ۔۔ اخوت و مساوات کی مقدس قربان گاہ پر اس طرح عزیٰ فخر و مباہات کو بھینٹ چڑھانے کے بعد آپ نے فرمایا" خدا کی پھٹکار ہو ان خود سر دلوں پر جن کو غلاموں کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے عار آتا ہے۔"

خود اپنے کھانے پینے کا یہ حال تھا کہ لوگ ان کے "شاہی دسترخوان" سے جان چرا کر دور بھاگتے تھے۔ اس شاہی دسترخوان پر سوکھی روٹیوں اور بے مزہ سالنوں کے سوا اور ہوتا ہی کیا تھا۔ حضرت حفصؓ بن ابی العاص جیسے اکثر و بیشتر کھانے کے وقت موجود رہتے تھے، امیر المومنینؓ کے شریکِ طعام ہونے کا دل گردہ پیدا نہ کر سکے۔

"کیوں بھئی؟" ایک دن حضرت عمر رضؓ نے آخر ان سے پوچھ ہی لیا "تم ہمارے ساتھ کھانا کھانا پسند کیوں نہیں کرتے؟"

"جی؟" حضرت حفص رضؓ بن ابی العاص حیران تھے کہ بھلا یہ بات انھیں خود کیوں معلوم نہیں — کچھ دیر سوچا کیے آخر پھر صاف صاف کہدیا "بات یہ ہے اے امیر المومنین اپنا مزیدار کھانا چھوڑ کر آپ کا یہ انتہائی موٹا جھوٹا کھانا حلق سے اُتارنا ہمارے بس کا کام نہیں۔"

درد و کرب کا ایک عجیب ایمان افروز رنگ حضرت عمر رضؓ کے چہرے پر کھیلنے لگا — پھر غم آخرت سے بھیگی بھیگی آنکھوں میں جلال ایمانی کی چمک پیدا ہوئی۔

"کیا تم سمجھتے ہو" سوز دل سے دہکتا ہوا جواب حضرت عمر رضؓ کے ہونٹوں پر آ ہی گیا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں قیمتی اور لذیذ کھانا کھانے کی مقدرت نہیں رکھتا؟ — قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر قیامت کا دھڑکا نہ لگا ہوتا تو تم لوگوں کی طرح میں بھی دنیا کے عیش و عشرت کا دلدادہ ہوتا......"

ایک بار عتبہ بن فرقد کو مجبوراً شریک طعام ہو جانا پڑا — بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ بے کیف اُبلا ہوا گوشت اور سوکھی ہوئی روٹی کھا تو کیا رہے ہیں: بمشکل "زہر مار" کر رہے ہیں — حضرت عمر رضؓ کی نگاہ اُٹھی تو ان کی حالت قابل رحم محسوس ہوئی۔

"تم سے کھایا نہیں جا رہا ہے تو مت کھاؤ" انھوں نے اپنے شریک طعام کو اس بیچارگی سے نکلنے کی چھوٹ دیتے ہوئے کہا اور پھر خود اس کھانے کی طرف بہ صد ادائے شکر متوجہ ہو گئے۔

"اے امیرالمومنین" عتبہ بن فرقد نے حضرت عمرؓ کا یہ موڈ دیکھا تو کچھ اور ہمت بندھی اور محبت بھری جھنجلاہٹ کے ساتھ کہہ دیا "اگر آپ اپنے کھانے پہننے میں کچھ زیادہ صرف کرنے لگیں تو مسلمانوں کا خزانہ خالی نہ ہو جائے گا۔"

یکایک حضرت عمرؓ کھاتے کھاتے رک گئے۔ دل کی چوٹ آنکھوں سے ہویدا ہوئی۔

"افسوس!" آہ سرد کھینچتے ہوئے انھوں نے بس اتنا فرمایا۔ تم مجھے عیش دنیا کی پٹی پڑھاتے ہو؟....."

کچھ ایسی ہی تھی اس ہستی کی زندگی جسے اس دنیا میں دس خوش نصیبوں کے ساتھ رسول خداؐ کی زبان سے جنت کی نوید مل چکی تھی ـــــ کہاں ہیں وہ لوگ جن کا ایک ایک سانس دنیا طلبی میں گذر رہا ہے ـــــ جن کا پورا وجود دنیائے دنی کے قدموں میں پڑا ہے، مگر پھر بھی خدائے رحیم وکریم کا وعدۂ رحمت وہ اپنے ہی لئے خاص سمجھتے ہیں۔

ـــــ خدا کیلئے وہ آئیں اور دوزخ کے خطرے کی آتشیں باڑھ کو چند طفل تسلیوں سے روکنے کے بجائے عمرؓ ابن خطاب کی زندگی میں خدا کے وعدۂ جنت کی یقینی راہیں تلاش کریں ـــــ یہ حق کی پکار ہے یہ ضمیر کا مطالبہ ہے ـــــ یہ عقل وخرد کا مشورہ ہے ـــــ یہ اس زندگی کی خوں چکاں چیخ ہے جس کا خون موت کو دیکھکر کسی بھی لمحہ رگوں میں ہمیشہ کے لئے خوف سے جم سکتا ہے

زندگی جو ایک سوال ہے کہ "کیا ہم مسلمان ہیں؟" ـــــ اور موت جو اس سوال کا ایک فیصلہ کن جواب ہو گی۔

تجلی نومبر سنہ ۶۴ء

محمد عربی ﷺ کی درد بھری پکار

دس ہزار اسلامی مجاہدوں کا لشکرِ جرار طوفانی رفتار سے سیدھے آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔

قدموں کی مجاہدانہ دھمک سے کفر و شرک کی دنیا تہہ و بالا کرتا ہوا۔

ہتھیاروں کی چمک سے حق و صداقت کے دشمنوں کو چندھیاتا ہوا خدا کی عظمت و جبروت کے ولولہ انگیز نعروں سے جھوٹے خداؤں کا دل دہلاتا ہوا۔

اسلام کے کٹر حریف —— اس وقت تک کفر و شرک کے سرغنہ ابو سفیان نے فرازِ کوہ سے یہ ہوشربا منظر دیکھا تو انکا خون خشک ہو گیا! —— وہ خوب جانتے تھے کہ یہ دس ہزار مظلوموں کا زخم خوردہ لشکر ہے جس پر اسی مکے کی سرزمین میں تیرہ سال تک وحشیانہ ستم ڈھائے جا چکے ہیں۔ بدترین سفاکیوں کا یہ خونیں پس منظر اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ ان کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔

آگ —— جس میں نحیف و ناتواں مظلوموں کی ہڈیوں کو تپایا اور جھلسایا گیا۔

سرخ شعلے —— انسان کی گردش گرد و دشت بنتے ہوئے

چھالوں کی چھاپ ڈالتے اور آبلوں کے پانی سے بھیگتے ہوئے ۔۔۔ کوڑوں کی بے رحمانہ بوچھار ۔۔۔ شائیں شائیں کی دلخراش آواز کے ساتھ مظلوم خون کی چھینٹیں اڑاتی ہوئی ۔

لہولہان انسانی ڈھانچے تڑپ تڑپ کر فرش خاک پر گرتے ہوئے ۔۔۔ جن کو کبھی جلتے ہوئے پتھروں سے باندھا گیا تو کبھی بھبکتے ہوئے ریت پر ننگا کر کے مردار جانور کی طرح گھسیٹا گیا ۔

درد و کرب کی پکار پر زبان کے زہرناک تیر ۔۔۔ بھرپور ٹھوکریں عرصۂ حیات تنگ کرتی ہوئیں ۔ ذلت و رسوائی کے شکنجے اور نفرت و حقارت کے طوق ایک ایک گردن میں پڑتے ہوئے

اوجھڑیوں اور غلاظتوں کے سڑتے ہوئے ڈھیر نماز پڑھنے والوں کے مقدس سر پر برستے ہوئے

شعب ابوطالب کی خوفناک گھاٹی ! ۔۔۔ جہاں ان مظلوموں کو تین برس تک سماجی اور معاشی طور پر مکمل اچھوت بنا کر موت اور زندگی کے درمیان بری طرح سسکایا گیا ۔۔۔ جہاں ان کو آب و دانہ کے بجائے درختوں کی چھالیں اور بھنے ہوئے سوکھے چمڑے کھا کھا کر خون تھوکنے پر مجبور کیا گیا ۔

پھر جن کو وطن سے دھکے دے کر نکال دیا ۔ بالآخر ویرانی میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا ، بلکہ جنگ کی آگ بھڑکا کر ان کے شہیدوں کی لاشیں بگاڑی گئیں ۔۔۔ دل و جگر نکالے ، کاٹے اور چبائے گئے ۔۔۔ خدا کے عظیم ترین رسول ؐ کو پوری بے رحمی سے گھائل کر ڈالا گیا ۔

اور یہ سب کچھ اس گناہ کی سزا میں کہ ان کا گناہ کوئی نہ تھا ۔

اب کیا ہوگا؟ ....."

ابو سفیان وحشت و اضطراب کے عالم میں سر دھن رہے تھے ــــ انقلاب کی گرج نزدیک سے نزدیک تر آرہی تھی ۔ زمانہ کروٹ لے رہا تھا ــــ ظالم آج مظلوموں کے رحم و کرم پر تھے ــــ جس سچائی کو ضعیف و ناتواں سمجھ کر نکالا گیا تھا وہ ایک طاقت کی شکل میں واپس آرہی تھی۔

کون ہے جو ابو سفیان کی وحشت و بدحواسی کو بیجا کہے؟ ــــ کیا حیوانیت و خونخواری کا جرم ایک لمحے کے لئے بھی قابل معافی ہے؟ ــــ پھر یہاں تو درندگی کا تیرہ سالہ جشنِ وحشت تھا جس کی ٹیسیں ان مظلوموں کے ایک ایک زخم میں محفوظ تھیں۔ یہاں گھائل جسم تھے۔ گھائل جسم ہی نہیں، ٹوٹے ہوئے دل بھی تھے۔ زخموں، چھالوں اور ناسوروں سے لدی ہوئی یہ تیرہ سالہ جاں کنی کیسے بھلائی جا سکتی تھی آخر؟ یہاں تو اگر ہر رگ و پے سے انتقام کی آگ شعلہ بار ہو جاتی تو کم تھا۔ آج تو انتقام ہی انصاف تھا ــــ ظلم کی طاقتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ہی حق کوشی اور امن کیشی کا شاندار ثبوت تھا

لیکن ابو سفیان حیران تھے کہ نفرت و انتقام کی کوئی آواز اس لشکر کی طرف سے اب تک سنائی نہیں دی تھی! وہاں صرف ایک آواز تھی انسان کی بندگی اور خدا کی خدائی کا بلند بانگ اقرار ــــ خدا کی کبریائی کا نعرہ پُرشوق! ــــ ایک نعرہ جو ایک ہی جوش اور ایک ہی جذبۂ بیکراں کے عالم میں دس ہزار زبانوں پر جاری و ساری تھا ــــ دس ہزار سینے ایک ہی حقیقت کی پکار سنا رہے تھے ــــ ظالموں کی بستی کو اپنے فاتحانہ قدموں کے نیچے آتا ہوا دیکھ کر بھی ان کی مظلومیت کا سر غرور و تکبر سے اونچا

نہ ہوا تھا، بلکہ اس عظیم انقلاب کو انسانی کارنامہ تصور کرنے کے بجائے وہ اس کو خدائے ذوالجلال کی قدرت سے منسوب کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی ابوسفیان کو دل و دماغ سے ابلتے ہوئے خوف و ہراس سے نجات نہ تھی۔ مجرم ضمیر کے اندر ہی اندر احساس جرم اور خوفِ سزا کے دھماکے ہو رہے تھے۔ نعرہ تکبیر کی ہر آواز ان کو آتش فشاں کے پھٹنے کی آواز محسوس ہوتی تھی۔ جوش و خروش کی ہر نئی اہر ان کو خون کی طغیانی کا تھپیڑا لگتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اچانک اسلامی سپاہ کی طرف سے اسلامی پرچم اٹھانے والے مجاہد کی آواز بلند ہوئی جس نے ابوسفیان کے اوسان خطا کر دیئے — یہ آواز انتقام کی پہلی اور آخری آواز تھی! — ایک انسان بیتاب ہو کر دس ہزار مظلوموں کی ٹیس سے چیخ اُٹھا تھا — اعلان کر دیا تھا کہ انسانیت کے ڈاکوؤں کو مقدس زمین کی روایات میں پناہ نہ لینے دی جائے گی۔

"الیوم یوم الملحمۃ آج کا دن — جنگ و جدل کا دن ہے آج بیت اللہ کی حرمت اٹھا دی جائے گی ...."

ابوسفیان نے یہ رجزیہ للکار سُنی اور تھرا گئے۔

"مارے گئے!" وہ کراہ اُٹھے "ہلاک ہو گئے! — آج تو.... .. کعبہ ..... بھی حلال کر دیا جائے گا ..... !"

حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا — جو آنحضرتؐ کے حکم پر ابوسفیان کو اسلامی طاقت کا شاندار منظر دکھانے کے لئے ان کو اس پہاڑ کی چوٹی پر اپنے ساتھ لائے تھے — "دیکھ رہے ہو! — اُدھر کیا ہو رہا ہے؟ یہ دوسری آواز سُنی تم نے؟"

ابوسفیان نے بیتابانہ سر اُٹھایا تو سکتے میں رہ گئے۔

دور ۔۔۔ اسلامی لشکر کے قلب میں خدا کا آخری رسول ؐ شکر و فقر کے عجیب عالم میں تھا۔ سادہ سی اونٹنی پر وہ پیوند زدہ لباس میں دنیا کا انوکھا فاتح اعظم! ۔۔۔ آج بھی زندگی کی اس شاندار کامیابی پر اس کو سر اٹھا کر چلنا پسند نہ تھا۔ فرطِ شکر اور احساس بندگی سے جھکا ہوا سر اس طرح جھکا تھا کہ اُٹھتا ہی نہ تھا! ۔۔۔ کائنات و حیات کے ذرّے ذرّے پر ایک قادرِ مطلق خدا کی خدائی کا اعلان کرنے والا اس وقت بھی بندگی کا اقرار کر رہا تھا جب انسانی طاقت اپنے شان و شکوہ کے نقطۂ عروج پر تھی۔ سچائیوں کا یہ فاتحانہ منظر آپ ؐ کے روئے مبارک پر مسرت کا نور بکھیر رہا تھا تو ہونٹوں پر یہ الفاظ اس دنیا کے بعد آنے والی دنیا کی حقیقت فاش کر رہے تھے "میرے اللہ! ۔۔۔ سچا عیش تو عیشِ آخرت ہی کا ہے! ۔۔۔"

ایک ساعت کے لئے ابوسفیان اس حسین منظر میں کھو گئے ۔۔۔ وہ بھول گئے کہ ابھی ابھی انھوں نے اسلامی پرچم اٹھانے والے مجاہد سعد بن عبادہؓ کی للکار میں موت اور ہلاکت کا فیصلہ سُنا تھا۔ لیکن پھر اچانک یہ آواز ان کو یاد آئی اور ان کے چہرے کی بیچارگی نے امید و بیم کی دو آتشہ کیفیت میں خاموش سوال کیا۔

"کیا رسول اللہ ؐ کا یہ جذبہ دس ہزار انسانوں کے جذبات پر بھی غالب آسکتا ہے؟ ۔۔۔ کیا امن و رحمت کا یہ پیغام ان بیتاب دلوں کو موہ لے گا جو مظلومیت کی تیرہ سالہ گھٹی ہوئی چیخوں کو آج نعرہ انتقام میں تبدیل کرنے کے لئے ظالموں کی تکا بوٹی کرنے چلے

آرہے ہیں؟ — کیا یہ طوفان بھی دب سکتا ہے جو اُمنڈ چکا ہے — کیا.....''

لیکن رسولؐ کی جاں نواز شخصیت کی بے پناہ تاثیر نے اس سوال کو لفظ و بیان تک پہنچنے کا موقعہ نہ دیا — حالات و واقعات اس سوال کا پورا پورا جواب دینے کے لئے پوری قوت سے سامنے آگئے۔ ابھی الیوم یوم الملحمۃ کی انتقام انگیز آواز فضاؤں میں پوری طرح گونجنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک اور بلند و بالا آواز اس کو کچلتی ہوئی زمین و آسمان کے درمیان گونجتی چلی گئی — خوف و خشیت سے دہکتی ہوئی آواز — درد و کرب سے کسکتی ہوئی آواز — مقناطیسی کشش سے چھلکتی ہوئی بیتاب و بے قرار آواز!

"الیوم یوم المرحمۃ — الیوم یوم المرحمۃ — آج کا دن رحم کھانے کا دن ہے — رحم کھانے کا دن ہے!! —''

یہ خدا کے رسول کی پکار تھی — یہ حضرت سعدؓ بن عبادہؓ کی للکار کا بھرپور جواب تھا — یہ دس ہزار انسانوں کے اُمنڈتے ہوئے جذبات کے خلاف، سپاہ کے علی الرغم سپہ سالار کی آواز تھی — لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ آواز فضا میں گونجتی ہوئی سینوں کی گہرائیوں میں اُتر گئی — روحوں میں سما گئی — دل و دماغ میں بس گئی اور دس ہزار دلوں کی بیشمار دھڑکنیں اسی آواز کے محور پر گردش کرتی ہوئیں دس ہزار زبانوں پر یہی آواز بن کر گونج اُٹھیں — ہونٹوں کی ایک حسین حرکت نے دلوں کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا تھا — نگاہ کے ایک اشارے نے جذبات کے بھرپور طوفانوں کا دھارا موڑ دیا تھا — وہ آنکھیں

جن سے نفرت و انتقام کے خونین جذبات چھلک نکلے تھے عفو و رقت کے آنسوؤں سے نم ہوگئیں ــــ وہ ہاتھ جن میں ننگی تلواریں ظالموں کے خون کی پیاس سے زبانیں نکالے ہوئے تھیں وہی ہاتھ ان ظالموں کے سروں پر پیار سے تھپکی دینے لگے ــــ وہی سینے جن کو مکافات کے جذبے نے امن کی دنیا تہہ و بالا کرنے کے جوش سے سنسا دیا تھا وہی سینے ظالموں کو پناہ دینے کے لئے فرط شوق سے پھٹنے لگے ــ انتقام کا نعرہ لگانے والا مجاہد پرچم اُٹھانے کے اعزاز سے محروم کر دیا گیا اور وہ خود بھی پوری بیتاب فوج کے ساتھ رحمت عام کی صلائے عام بلند کرنے لگا۔ یہ نعرہ پھیلتا بڑھتا ہوا آخر دنیا کے اس عظیم ترین اعلان امن میں تبدیل ہوگیا جس میں نہ صرف ظالم سے ظالم شخص کو سر چھپانے کے لئے جگہ دی گئی تھی، بلکہ بدترین ظالموں کے گھروں کو "پناہ گاہ" کا شاہانہ اعزاز عطا کیا گیا تھا!

جس نے مقابلے سے دست کش ہو کر اپنا دروازہ بند کر لیا ــــ امن میں ہے!

جو ابوسفیان کے مکان میں چلا گیا ــــ ہاں وہ بھی امن میں ہے!

جو خانہ کعبہ میں داخل ہوا ــــ امن میں ہے!

جس نے ہتھیار ڈال دیئے ــــ امن میں ہے!

جس نے گھر کے کواڑ بند کر لئے ــــ امن میں ہے!

جو حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہوگیا ــــ امن میں ہے!

جو ابی رویحہ کے پرچم تلے آگیا ــــ امن میں ہے!

امن ــ امن! ــ امن!!! ہر طرف امن کی پکار تھی ــ

امن کی پکار عفو و درگذر کا خزانہ لٹاتی ہوئی! — انسان کے خون کا احترام کرتی ہوئی پکار — سیاہ کاروں کو دامن کرم میں چھپاتی ہوئی — ظالموں کو سینے سے لگاتی ہوئی پیغمبرانہ پکار! — سارا مکہ اس دامن میں آگیا — ظلم وستم کی پوری دنیا پناہ لینے کے لئے محمد عربیؐ کے نرم و نازک دل میں آچھپی! — اس دل میں ہر اُس شخص کے لئے جگہ تھی جس نے اسی دل پر کاری سے کاری وار کیا تھا — یہ سینہ ہر اُس شخص کے لئے کھلا ہوا تھا جس نے سفاکی و استبداد کے بدترین جنوں میں اسی سینے کو زخموں سے چھاپ دیا تھا! — اور پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی رحمت کا چلتا پھرتا پیکر بن کر مکے میں داخل ہوئے اور صحن حرم میں اپنے چاروں طرف ظالموں کی خوں آشام بھیڑ کو آج عجز و بیچارگی سے گریبانوں میں سر ڈالے ہوئے دیکھا تو یہ منظر دیکھکر آپ کا دل ان لوگوں کے لئے بھی رو دیا جو آپ کے مقدس خون سے اپنی نفرت کی پیاس بجھانے کے لئے درندوں کی طرح چنگھاڑتے پھرتے تھے۔

"لوگو! تمہارا کیا گمان ہے کہ محمدؐ تمہارے ساتھ کس طرح پیش آئے گا؟"

مفتوح آبادی کے ستم کاروں سے آپ نے جیسے ہی یہ سوال کیا سینوں پر جھکے ہوئے سر کچھ اور ڈھلک گئے — احساس جرم نے نظر اُٹھانے اور آنکھیں چار کرنے تک کی جرأت سلب کر لی تھی — اخلاق کریمانہ کے آنسوؤں نے پتھر دلوں کو بھی پانی پانی کر دیا تھا لرزتی ہوئی آوازیں ہر طرف سے یہ کانپتی ہوئی بازگشت سنائی دی — اعتراف خطا اور عفو طلبی کی آخری، کراہتی ہوئی بازگشت!

" آپؐ سب سے زیادہ شریف النفس ہیں۔ آپؐ سب سے

زیادہ معاف کرنے والے ہیں ......"

اپنے شدید درد مظلومی کو دباتے ہوئے ـــ اپنے آنسوؤں کے سمندر کو پیتے ہوئے خدا کے رسول نے ظالموں کو عفو و رحمت کی مسکراہٹ عطا کی اور اپنا گھائل سینہ عظیم ترین محبت، کے ساتھ کھول دیا۔

"لاتثریب علیکم الیوم! ـــ آج تم پر کوئی دار و گیر نہیں ـــ جاؤ! ـــ تم سب آزاد ہو! ـــ

اور "اسوۂ حسنہ" پر جان و دل نثار کرنے والے دس ہزار ایمان کے پروانے سپردگی و عقیدت کے ساتھ پکار اٹھے "ہاں ـــ تم پر کوئی دار و گیر نہیں! ـــ رسول خدا کا یہ فیصلہ ہمیں بھی جان و دل سے منظور ہے۔

رسالت کی نورانی شمع آج بھی تاریخ کی انجمن میں پوری آب و تاب سے روشن ہے۔

اسلام ـــ آج بھی اس تاریک روشنی کے دور میں محمد عربی کی آواز کو نشر کر رہا ہے ـــ

"مسلمان" آج بھی یہی اعلان کر رہا ہے کہ میں اس محبوب ترین شخصیت کا پروانہ ہوں۔

لیکن ـــ یہ اعلان "آج حلق سے نیچے نہیں اترتا ـــ زبانوں پر سب کچھ ہے ـــ دلوں میں کچھ بھی نہیں!! ـــ پھر بھی ہمیں اصرار ہے کہ "ہم مسلمان ہیں!" ـــ یہ کوئی نہیں سوچتا "کیا ہم مسلمان ہیں؟" آستینوں میں نت نئے "بت" چھپائے ہوئے ہم کعبے کیطرف رخ کر کے نعرۂ تکبیر لگاتے جا رہے ہیں کہ شاید دنیا توحید و رسالت کیطرف دوڑ سکے! اور دنیا ہماری آستینوں کی طرف اشارہ کر کے قہقہہ لگاتی ہے اور پوچھتی ہے ـــ "کیا.... تم مسلمان ہو؟ تم؟!" "تجلی اکتوبر ۶۲ء"

جذبات کے گھمسان رن میں!

کفر و اسلام کے درمیان "صلح حدیبیہ" کی وہ تاریخی دستاویز قلم و قرطاس کی فیصلہ کن منزل میں داخل ہوا چاہتی تھی جہاں لڑائیوں اور تلواروں کی خونیں چھاؤں میں کبھی نہ جھجکنے اور دبنے والا اسلام صلح کے محاذ پر قلم و قرطاس کے سائے میں ہر لحاظ سے دبتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نازک صبر آزما صورتِ حال کو ایک ڈرامائی موڑ دینے کے لئے کفر کے ترجمان کی جھنجھوڑ دینے والی للکار بلند ہوئی۔

"اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے نہیں بلکہ" اے اللہ تیرے نام سے" کے الفاظ اس دستاویزِ صلح کی پیشانی پر چمکیں گے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا فقرہ خالص اسلامی فقرہ ہے جب کہ دوسرا لفظ کفر کی قدیم روایت ہے۔ اسلامی روایت قربان کر کے کفر کی روایت کو زندہ رکھا جائے!"

اسلام کے دبتے ہوئے موقف کو دیکھ کر توحید و رسالت کے سر بکفن مجاہدوں کے سینوں میں جذبات کا جو ہنگامہ اندر ہی اندر ایک زبردست ہلچل برپا کئے ہوئے تھا لیکن جس کو محمد ؐ کے پاس خاطر میں سینوں کے اندر ہی گھونٹ ڈالا گیا تھا وہ اس غیرت آزما چوٹ پر آتش فشاں کی طرح بیتاب ہی تو ہو گیا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کی چشم و ابرو کے اشاروں کو تکنے والے بے محابا پھوٹ پڑتے۔ بے شک حال یہ ضرور ہو چکا تھا کہ

رگ و پے میں خون کی جگہ آگ بہہ نکلی تھی ــــ چہرے انگاروں کی طرح تمتما چکے تھے جبینوں پر گہری آتشیں شکنیں ابھر آئی تھیں اور فرطِ غیرت و غضب سے تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ اچانک ایک فولادی گرفت کے ساتھ ننگی تلواروں کے دستوں پر اینٹھ گئے تھے ۔ نام خدا پر مرمٹ جانا ہی جن لوگوں کی اکیلی آرزو کا درجہ رکھتا ہوان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے خدائے رحمٰن و رحیم کا نام صلحنامہ سے کھرچ کر پھینک دیں محض اس لئے کہ کفر کے جذبات اپنی روایت کی پاسداری چاہتے ہیں ؟۔

کون کہہ سکتا تھا کہ اس محاذ پر مسلمان اپنے جذبات کے ریلے پر قابو پا سکیں گے ؟ کون سوچ سکتا تھا کہ یہ طوفان جو ایک بار چہرے کی تمتماہٹ ، آنکھوں کی خونابی اور تلواروں کے دستوں پر آہنی گرفت کے بیتاب تشنج تک آ پہنچا ہے ایک بار پھر سینوں کی نامعلوم دور افتادہ گہرائیوں میں پلٹ بھی سکتا ہے ؟ ۔

لیکن جب دل کے بیقرار حوصلے نکلنے کے لئے محمد صلعم کے پروانوں نے نظروں ہی نظروں میں بصد التجا اس کی اجازت طلب کی کہ اس گستاخانہ مطالبہ کا جواب زبان کے بجائے پیاسی تلواروں کو دینے دیجئے تو وہاں کچھ اور ہی عالم نظر آیا ! وہاں انسان کے تمام انسانی جذبے ایک سب سے عظیم جذبے میں گم ہو چکے تھے ۔ خدا کا آخری پیغامبر ایک بہترین بشر کی حیثیت سے اپنے ذاتی جذبات و محسوسات کی پوری کائنات سے بلند ہو کر صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا خدا اس سے کیا چاہتا ہے ؟ آپ کی ظلمت سوز اور سحر آفریں نگاہ بادی النظر کی تہ میں اتری ہوئی تھی ــــ اور ایک پرسکون بصیرت اور ٹھنڈے دل کے ساتھ

آپ اس صلح کی ظاہری شانِ مغلوبیت میں سے اسلامی غلبۂ و تسلط کا وہ نیا سویرا طلوع ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے جو کئی ماہ و سال کے بعد تاریخ کی نظروں کے سامنے ایک ٹھوس واقعہ کی شکل میں آیا۔ اس لئے کفّار کے اس سطحی مطالبے کا تجزیہ کرنے کی پوری اہلیت و قوت آپ کے پاس تھی جس سے کام لیکر آپ نے فیصلہ کیا کہ یہ نزاع محض ایک لفظی نزاع سے زیادہ کچھ نہیں دستاویز صلح کا آغاز اسی اللہ کے نام سے بہر حال ہو رہا تھا جس کے نام سے ہر شئے کا آغاز ہونا چاہیئے۔

اس لئے ٹھیک اس وقت جب آپؐ کے جاں نثار صحابہ انتہائی بیتابیوں کے عالم میں اس مطالبہ کو مطالبہ کرنے والوں کے ناپاک خون سے دھوکر صاف کر دینا چاہتے تھے آپ نے بلا خوف و تردّد اعلان کیا۔

"منظور ہے"

یکایک صحابہؓ کے جذبات کے امنڈتے ہوئے دھاروں کو ایک جھٹکا لگا اور —— طوفان دبے پاؤں اندر ہی اندر پس منظر میں گم ہو گیا۔ محمد عربیؐ کے لبوں سے جو الفاظ نکلے —— کتنے طاقتور، کتنے فیصلہ کن اور کس قدر فاتحانہ تھے وہ الفاظ! تلواروں کے دستے پر آہنی گرفت لجلجا گئی ——۔ دل کی بیقرار دھڑکنیں معمول پر آگئیں —— خون جگر سے جلتی ہوئی سرخ آنکھیں اٹھیں اور فرش خاک پر جھکتی چلی گئیں۔ پیغمبرؐ کی جاذبیت بھلا کیسے فیل ہو سکتی تھی جب کہ اس کے ماننے والے دل کی گہرائی سے یہ

یقین رکھتے تھے کہ آپؐ کے ہونٹوں سے سوائے صدائے حق کے اور کچھ سنا ہی نہیں جا سکتا۔ چند لمحات پہلے جو لوگ آگ بگولہ ہو کر کفر کے اس مطالبہ کے پرخچے اڑا دینے کے متمنی تھے ہاں وہی سب کے سب زبان حال سے وہی بات کہہ رہے تھے جو حضورؐ نے کہی تھی۔

"ہمیں منظور ہے!!۔"

لیکن ابھی یہ دستاویز چند قدم چلکر ان الفاظ تک پہنچی تھی کہ "محمد رسول اللہؐ کی طرف سے"......... کہ اچانک کفر نے ایک اس سے بھی بڑے دھماکہ کے ساتھ اعلان کیا:۔

"رسول اللہ؟ —— ہرگز نہیں! —— یہ الفاظ فوراً مٹائے جائیں......"

"کیا؟.......!!" —— یکایک غیرت حق کی آگ میں تپتے ہوئے سینے پھٹنے لگے —— جوش و خروش کی ایک بے پناہ آندھی ان کے پورے وجود کو ہلائے ڈالتی تھی۔ دل و جگر کا تمام خون آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ زندگی کی ساری توانائیاں اس غضبناک للکار میں ڈھل گئی تھیں —— "کیا کہا؟ — کیا ہم ان الفاظ کو اپنے ہاتھ سے لکھکر حرف غلط کی طرح مٹا دیں جن کو بلند کرنے کے لئے ہم نے اپنی پوری دنیا لٹا دینے کی قسم کھائی ہے؟ کیا خودکشی کسی اور شے کا نام ہے؟ —— ہرگز نہیں! اس گستاخی کو کبھی معاف نہیں کیا جائے گا —— کبھی نہیں!! —— ہرگز نہیں! —— جان دیدیں گے ان الفاظ پر —— مگر ان کو مٹنے نہ دیں گے!"

——— مگر جب آندھی طوفان کی طرح گرجتی ہوئی یہ ایمانی طاقت رسول کے اذن و ایماء کے لئے سراپا اضطراب بن کر اُٹھی تو وہاں ایک عظیم سکون کے سوا کچھ نہ پایا! ——— ایک سکون جس میں لرزہ خیز خاموش جلال کی شان جلوہ گر تھی ——— ایک سکون جس کی طاقت کے آگے اضطراب و جوش کے آگے ہزاروں طوفاں بے بس تھے۔ ایک شانِ سکوت جو اس وقت اس کامل ترین انسان کے سوا کسی کو نصیب ہونا محال تھی جس کا لافانی عرفان حقیقت طاقتور سے طاقتور جذبات کے طوفانوں کو اپنے قدموں کے نیچے دبائے رکھتا تھا۔ انتہائی صبر و تحمل کی ٹھنڈک اور گہرائی کے ساتھ آپ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کفر کا یہ مطالبہ بھی مانا جا سکتا ہے جس نے واقعی خدا کے رسول کو ابھی تک تسلیم ہی نہیں کیا ——— ایک منکرِ رسالت کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اس کے جذبات کی صحیح پکار ہیں، اگرچہ حق و صداقت کی روشنی میں سراپا غلط ہی سہی! ———

"اچھا" ——— خدا کے رسولؐ کی آواز میں خود اعتمادی کا وقار تھا ——— تدبر اور فراست کے تیور تھے۔ مگر ساتھ ہی کفر کے ماروں کی بدبختی پر خوں چکاں درد کی محسوس چوٹ بھی "اچھا ——— یوں ہی سہی!"

آپؐ نے یہ فرمایا اور دستاویز نویس بندۂ حق سے کہا کہ وہ ان الفاظ کو کاغذ کی سطح پر سے محو کر دیں۔

اپنے جذبۂ ایمان و ادب کی بے پناہیوں کے تھپیڑے کھانے والے مسلمانوں نے پیغمبرؐ کا یہ ارشاد ——— یہ

فیصلہ ــــــ یہ فرمان سنا۔ تھوڑی سی دیر کے لئے جیسے وہ سب سکتے میں آ گئے ــــــ وہ سب سکوت و درد کی المناک تصویر بنے کھڑے تھے جن کی خاموشی سے ان کے دل کا تازہ تازہ لہو صاف ٹپک رہا تھا ــــــ ٹپک رہا تھا اور اس صلح کی پوری فضا کو خون سے تر کئے دے رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر مجال نہ تھی کہ جذبات اور ارشاد نبویؐ کے درمیان تڑپتے ہوئے دل و دماغ احتجاج کی ہلکی سے ہلکی سسکی تک نکال سکیں!۔ پیغمبر کے ہونٹوں کی جنبش نے ایک بار پھر دلوں کی دھڑکنوں کا رخ پھیر دیا تھا ــــــ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس بار اس فیصلے سے دل اندر ہی اندر کاری زخم کھا گئے تھے جن میں محمدؐ رسول اللہ کے لئے پیار اور سپردگی نے ایک حسین جنون کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جذبات کے آتش فشاں کے دہانوں پر ایک بار پھر پاس رسالت کے جذبہ سرشار نے مہر سکوت ثبت کر دی تھی۔ لیکن خاموشی ایک درد بھری کسک کے ساتھ اب بھی یہ فریاد کر رہی تھی کہ "رسولؐ اللہ! ہمیں اس پر مجبور نہ فرمایئے کہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کی اس انمول سچائی پر قلم پھیر دیں! ــــــ نہیں! ــــــ اے خدا کے رسولؐ! ــــــ آپ تو بے شک خدا کے رسول ہیں ــــــ ہمارے ہاتھ اس تحریر کو مٹانے کے لئے اٹھیں گے تو اٹھتے ہی مفلوج ہو جائیں گے ــــــ ہمارا دل پاش پاش ہو جائے گا ــــــ ہمارا دماغ ماؤف ہو جائے گا۔"

اور خدا کے سچے فرستادہ نے رسالت کے جاں نثاروں کو اطاعت اور بیچارگی کے اس دو آتشہ عالم میں دیکھا تو خود ہی اس

کو سر انجام دینے کا فیصلہ فرما لیا۔

"مجھے بتاؤ وہ الفاظ کہاں لکھے ہیں ـــــ" آپ نے اپنے جاں نثاروں کو محبت و سپردگی کی نازک گھاٹی سر کرنے کے لئے اپنا سہارا دیتے ہوئے کہا ـــــ اور جب ان جاں نواز الفاظ کی طرف تھرتھرائے ہوئے ہاتھوں نے اشارہ کر دیا تو رسولؐ نے خود اپنے ہاتھوں سے یہ تحریر مٹا دی اور اب اس کی جگہ یہ نئے الفاظ ایک دوسری حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے ابھر آئے:۔

"تیرے نام سے اے خدا! ـــــ یہ ہے جو طے پایا گیا۔ عبداللہ کے بیٹے محمدؐ اور عمرو کے بیٹے سہیل کے درمیان" مجاہدوں کا وہ جوش و خروش جس سے ٹکرانے اور جس کو روک دینے کا یارا چٹانوں اور پہاڑوں میں بھی نہ تھا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند الفاظ سے قابو میں آ چکا تھا۔ اور وہ دستاویز صلح جس کی راہ میں بظاہر انسانی جذبات کی سدِ سکندری حائل ہو چلی تھی، ایک بار پھر تحریر کی دشوار گذار منزلوں سے جوئے رواں کی طرح گذرنے لگی۔ اس معاہدے میں اس ہوش ربا دفعہ کی گھاٹی بھی آئی جس میں کہا گیا تھا کہ مکے سے جو مسلمان بھاگ کر مسلمانوں کے پاس آئے گا اُس کو کفار کے حوالے کر دیا جائے گا۔ لیکن مدینے سے اگر کوئی کافر کفار مکہ کے پاس چلا جائے گا تو اس کو مکہ کے کافر واپس کرنے پر مجبور نہ ہوں گے۔

کس قدر کڑی تھی یہ اطاعت کی گھاٹی جس کو مسلمان عشق رسالت کے بغیر ایک قدم بھی سر نہ کر سکتے تھے۔ ان کے سینوں میں جذبات کی کیسی

لرزہ خیز ہلچل تھی! ــــ ایسی ہلچل کہ عمر بن خطاب جیسا پرستارِ حق بھی بے اختیار پکار اُٹھا تھا:۔

"اے خدا کے رسول ﷺ! .... کیا .... ہم حق پر نہیں؟"

یہ آخری اظہار تھا اس آخری اضطراب کا جو جذبات کی طوفانی ہنگامہ خیزیاں حکم اور امتثالِ حکم کی راہ میں پیدا کر سکتی ہیں۔

لیکن جیسے ہی دیکھا گیا کہ محمد عربی ﷺ بدستور صلح کے موقف پر جمے ہوئے ہیں جذبات کے یہ سارے ہنگامے اس یقین اور اس پیار بھرے ایمان کے نیچے دبتے چلے گئے کہ یہ انسان کبھی باطل پر ایک پل کے لئے بھی نہیں ٹھیر سکتا ــــ جم جانا تو دور کی بات ہے۔

لیکن ابھی قدرت کو ان مومنوں، ان خدا اور رسول کے جاں نثار، چاہنے والوں سے ایک اور جذباتی قربانی طلب کرنی تھی۔ ایک عظیم ترین قربانی جس کو یہ لوگ بارگاہِ محمدی میں اپنے تمام ذاتی جذبات و خیالات ــــ آرزوؤں اور حسرتوں کو یکسر فنا کئے بغیر ہرگز ہرگز پیش نہ کر سکتے تھے۔

اور یہ آزمائش خوں آلود زنجیروں میں جکڑے ہوئے ابو جندل رضہ کی شکل میں پوری قوت سے سامنے آکر کھڑی ہو گئی! ابو جندل رضہ ــــ معاہدے کے فریقِ ثانی سہیل بن عمرو کے بیٹے جن کو ان کا باپ ایمان لانے کے "جرم" میں بدترین شکنجوں میں کھینچ رہا تھا ــــ جن کو ان کے گھر میں بیڑیاں پہنا کر ان کے اپنے گھر کو زنداں کی کالی کوٹھڑی بنا دیا گیا تھا ہاں وہی ابو جندل رضہ نہ جانے کیسے زنجیریں تڑا کر اپنے ایمانی بھائیوں کی اخوت سے داد چاہنے کے لئے سراپا فغاں بنے ہوئے اصلح

کی فضا میں آ پہنچے تھے ——

ابو جندل رضؓ کی یہ حالت زار دیکھ کر ——

ابو جندل رضؓ کی یہ دلدوز پکار سنکر ——

اخوت کی حسین ترین رقت میں جکڑے ہوئے مسلمان نیم بسمل کی طرح اٹھے کہ ان کو بڑھ کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگالیں —— اور پھر کبھی اس تاریک دنیا میں واپس نہ جانے دیں جہاں کفر کے جبڑے ان کی زندہ لاش چبائے ڈالتے تھے۔

لیکن یہاں تو خدا کا بندہ اور اس کا رسول عہد کر چکا تھا کہ مکہ سے ہر آنے والا مکہ کو لوٹا دیا جائے گا ——— کس قدر صبر آزما —— کتنی ہوش ربا —— کتنی روح فرسا تھی یہ ایفائے عہد کی گھاٹی! —— بڑے بڑے مومنوں کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے بڑے بڑے مجاہدوں کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی تھی —— —— خطاب کا بیٹا عمر فاروق رضؓ جیسا انسان بلبلا نہ آگے بڑھا اور اللہ کے رسولؐ سے بچوں کی طرح گڑگڑا کر التجا کی۔

"ابو جندل رضؓ کو بچائیے اے خدا کے رسولؐ ابو جندل رضؓ کو! ......"

لیکن اللہ کا رسولؐ ہر جذبہ و احساس بشری کی کمزوریوں سے ماوراء ہو کر اپنے خدا کی پکار پر گوش بر آواز تھا۔ آپ کی آنکھوں میں بھی دل و جگر کا لہو سمٹ آیا تھا مگر پھر بھی وہ نظر ابو جندل رضؓ پر نہیں صلح حدیبیہ کی اس آتشیں دفعہ پر جمی ہوئی تھی جس میں ابو جندل رضؓ کی قربانی دینے کے لئے ایفائے عہد کی عظیم پکار سنائی دے رہی تھی۔

ٹھیک اس فضا نے درد وگداز میں جب ابو جندل رض سلاسل کی جون آلود جھنکار کے ساتھ آنسو بہا کر پناہ طلب کر رہے تھے ---

جب ایک بندۂ مومن کی بے پناہ مظلومیت سے دلفگار ہو کر عمر بن خطاب رض کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی --- جب پورا اسلامی لشکر عمر رض کی آواز سے آواز ملا کر رحم ! --- اور امان کی بھیک ابو جندل رض کے لئے مانگ رہا تھا۔ محمد عربی صلعم نے آخری فیصلہ کر دیا کہ وہ "عہد" کی توہین کر کے اپنے خدا کو خفا نہ ہونے دیں گے۔ خواہ ساری دنیا کیوں نہ بگڑ جائے۔

آپ نے جذبات سے لبریز آواز میں ابو جندل رض کو تلقین صبر کی اور کہا کہ انھیں خود کو "اپنے صیاد" کے حوالے کر دینا چاہئے۔

"کیا" ابو جندل رض کے ہونٹوں سے پوری قوت سے چیخ نکل گئی "کیا مجھے ان مشرکوں کی طرف لوٹا دیا جائے گا تاکہ وہ مجھے بالجبر میرے دین سے پھیر دیں ؟ ! ......"

پیغمبر صلعم نے کہا ---

" اے ابو جندل رض ! صبر ! صبر ! ! --- خود پر قابو پاؤ --- ہم نے ان سے صلح کر لی ہے اور دیکھو ہم نے ایسا کرتے ہوئے خدا کا نام لیا ہے ہو نہیں سکتا کہ ان کے ساتھ اس عہد کی خلاف ورزی کی جائے ---"

اور پھر کیا ہوا ؟

کوئی آواز فغاں ہی پھر سنائی نہ دی ! --- کوئی احتجاج ہی بلند نہ ہوا --- ابو جندل رض جس جذبہ بیتاب کے ساتھ پناہ کیلئے

آئے تھے اس سے بھی زیادہ گہری سنجیدگی اور جوش کے ساتھ پلٹ پڑے تھے ـــــ پلٹ پڑے تھے تاکہ خود کو محمد عربیؐ کے فرمان پر خوشی سے بھینٹ چڑھانے میں کوتاہی نہ کریں ..

مسلمانوں کا کیا عالم تھا؟ ـــــ اس کا اندازہ کوئی کیسے کرتا؟ ـــــ ان کے اندر جذبات کی ایک قیامت برپا تھی۔ لیکن باہر تعمیل حکم اور پاس محبت کی پرسکون فضا تھی اور بس ـــــ ہاں ان کی جذباتی بیقراریوں کی ایک جھلک اس وقت نظر آئی جب واپس جاتے ہوئے ابوجندلؓ کے پیچھے پیچھے عمر بن خطابؓ نے جست کی اور چلا کر کہا۔

"صبر کرو! ـــــ اس لئے کہ وہ محض مشرک ہیں جن کا خون ایک کتے کے خون کی طرح ارزاں ہے" یہ کہا اور ابوجندلؓ کیطرف بے اختیار اپنی تلوار کو بڑھانے لگے۔ بعد میں خود انھوں نے بتایا کہ ان کا منشا تھا کہ خود ابوجندلؓ جنھوں نے کوئی معاہدہ نہ کیا تھا اس تلوار کو لے کر اپنے کافر باپ کی گردن اڑا دیں۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ابوجندلؓ نے تلوار نہیں قبول کی ـــــ وہ جان لینے کے مقابلہ میں اس طرح جان دینے میں بھلا کیسا لطف پا رہے تھے ـــــ آہ کون سمجھ سکتا ہے اس راز ایمانی کو! ـــــ انھوں نے ہر قیمت پر محمد عربیؐ کے الفاظ کو سینے سے لگا لیا تھا۔ اسلام کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے یہ اپنی قسم کا پہلا حادثہ تھا ان کے سر فرط غم سے سینوں پر ڈھلک گئے۔ دلوں پر منوں بوجھ لد گیا تھا ... سینے شدت غم سے شق ہوئے جاتے تھے

مگر کسی بھی ہونٹ سے ایک سسکی بھی تو نہ نکلی ـــــ ایک گرم نظر بھی تو نہ اٹھ سکی۔ وہ جذبات کے اس گھمسان رن میں فرمانروائے کے آگے فرش راہ ہو گئے تھے۔

ہاں، یہ کہانی بھی ہماری ہے ؟ ـــــــــ

لیکن کون کہہ سکتا ہے ؟ ـــــــــ

کون مان لے گا یہ بات !! ـــــــــ

ہم ـــــ کہ جذبات و خواہشات کی آندھی میں بے بس اور بے قابو ہو کر اسلام کے حقائق کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک گھڑی سر جھکا کر اس صورت حال پر غور ہی کر لیں۔ تاسف ندامت اور انفعال کی بات تو دور رہی۔ ـــ لیکن اسی بے حسی اور گمشدگی کو ہم سینے سے لگا لگا کر کہے چلے جاتے ہیں کہ "ہم مسلمان ہیں ؟"۔ دنیا، عقل اور انصاف جواب دیتے ہیں "تب کے جاؤ۔ کیا تم مسلمان ہو ؟"

تجلی نومبر ۶۲ء

ایمان و عزیمت کا رقصِ شرر

سولہ سال کی نوخیز عمر تھی جب زبیر بن عوام رضؓ نے اپنے خدا کے قدموں پر پہلا والہانہ سجدہ کیا۔ پہلا والہانہ سجدہ بیتاب! ــــ کتنا عظیم اور فاتحانہ تھا۔ یہ انسانی سر کا بے اختیار جھک جانا کہ اس کی پہلی جنبش پر سولہ سالہ بت پرستی چور چور ہو گئی ــ وہ سیکڑوں بت جن کے آگے سیکڑوں پیشانیاں سجدے میں پڑی تھیں زبیرؓ کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے تھے۔

خدا کے آگے جھک جانے والے کے سامنے کتنے جھوٹے خدا قدم بوس ہو جاتے ہیں!

بظاہر ایسا لگتا تھا کہ نوخیز جوانی کے جوش میں زبیرؓ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کی جڑیں زیادہ گہری نہ ہوں گی۔ کون توقع کر سکتا تھا کہ اس جذبۂ بندگی سے جب زمینی زندگی کے سیکڑوں جذبات ٹکرائیں گے تو ان کا یہ فیصلہ کتنی دیر زندہ رہ سکے گا؟ لیکن حضرت زبیر بن عوام نے اس فیصلے پر ایک فولادی چٹان کی طرح جم کر دنیا کو خوب سمجھا دیا کہ سچائی جن جذبات کو آدمی کے سینے میں ابھارتی ہے وہ ریت کے محل نہیں آہن و فولاد کے قلعے ہوتے ہیں ــ ان قلعوں سے جو چیز ٹکراتی ہے خود ہی پاش پاش ہو جاتی ہے لیکن ان کی بنیادوں کو ذرا بھی جنبش نہیں دے سکتی۔

خاندانی مذہب سے بغاوت کے "جرم" میں ا سکے

قریب ترین عزیزوں نے آنکھیں لال پیلی کیں۔ چاہت سے چھلکتے ہوئے دل نفرت کی آگ سے جھلس کر سیاہ ہوگئے۔ جذبات کی آنچ سے دہکتا ہوا خون سفید ہوگیا۔ ہاں پیار کرنے والوں نے بپھر بپھر کر حملہ کیا ـــــ سینے سے لگانے والوں نے ٹھوکریں لگائیں۔ سہارا دینے والوں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا تاکہ زبیر رض بالکل بیچارگی اور بے کسی کے عالم میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔

لیکن جہاں تمام سہارے ٹوٹ چکے تھے وہاں ایک سہارا اب بھی باقی تھا۔ وہ اکیلا سہارا جس کے بعد کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔

زبیر رض اب بھی ثابت قدم تھے ـــــ اگرچہ ان کے پاؤں تلے سے پوری زمین کھسک چکی تھی!۔

دنیا نے یہ عجیب منظر دیکھا اور جھنجھلاہٹ کے مارے اپنا سر پیٹ لیا۔ دھمکیاں گرجتی ہوئی آگے بڑھیں۔ ڈراوے بھگانے کے لئے دانت پیسنے لگے۔ اور آخر آخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ توحید کی جس نرالی آواز کو دبایا نہ جاسکا اس کو اس نوخیز مجاہد کے حلق میں گھونٹ ڈالا جائے۔ چنانچہ ان کو ایک چٹائی میں مُردار جانور کی طرح لپیٹ کر زبردست دھونی دی گئی تاکہ نوائے حق بلند کرنے والے کا دم ہی گھٹ کر رہ جائے۔

لیکن ٹھیک اسی وقت جب آدمی کو جان بچانے کی آخری فکر ہونی چاہیئے تھی یہ انسان نوائے حق بلند کرنے کے لئے زندگی کی پوری طاقت کو سمیٹ رہا تھا اس کی آواز دھوئیں کی لپیٹ

میں گھٹ جانے سے پہلے ایک بار پھر بلند ہوئی۔ اور قہرمانی طاقتوں کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ انھوں نے اپنے ستمگر حقیقی چچا کو مخاطب کر کے اعلان کیا۔ "جو چاہو کر گذرو! لیکن دوبارہ "کافر" ہونے کے مقابلے میں تم مجھے ہر بار مرجانے پر تیار پاؤ گے"! کیسی تھی وہ حق پسندی جس کو جواں مرگی کا خوف بھی ٹس سے مس نہ کر سکا! ہائے وہ سچائی جو انسان کو جان سے بھی زیادہ پیاری ہو جائے!۔

پھر کم سنی کی منزلیں طے کر کے زبیر رضؓ کی یہ حق کوشی سن وسال کی پختگی کو پہنچی۔ تو باطل کے لئے سچ مچ قیامت بن گئی! میدان میں ان کے ولولۂ جہاد کے آگے ان کی آہنی تلوار بھی بل کھا گئی اور ان کے جوش جاں نثاری کو خراج عقیدت دینے کے لئے فرشتوں کی غیبی فوج کو خدا کے رسولؐ نے ٹھیک زبیر رضؓ کے لباس میں اترتے ہوئے دیکھا! پھر اُحد کی گھاٹی آئی جہاں خوف نہیں "غم" کی چوٹ کھا کر کچھ دیر کے لئے ایمان و عمل کے بڑے بڑے جیالے سکتے میں دیکھے گئے تھے وہاں بھی زبیر رضؓ کی تلوار خوف کی طغیانیوں میں مسلسل چمکتی بجلی کی طرح لہرا رہی تھی۔ خدا کا بندہ خدا کی حسین ترین "امانت" محمدؐ کو بچانے کے لئے ـــ "آدم خوروں" کی عفریتی ڈار پر ان تھک گھونسے برسا رہا تھا آخر طوفان کا منہ پھر گیا۔ پہاڑوں پر رعشہ دوڑا۔۔ ـــ آندھیاں شل ہو گئیں ـــ بجلیوں کا منہ فق ہو گیا!

پھر یہی وہ شعلہ جوالہ تھا جو یرموک کے محاذ پر اس طرح چمکا کہ بڑے بڑے سورماؤں کی آنکھیں حیرت سے پتھرا گئیں!۔

حالانکہ اس دور میں یہ شعلہ اندر ہی اندر بجھا بجھا سا تھا خدا کے رسولؐ کی وفات سے ان کے دل پر سوگ اور افسردگی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے ـــ لیکن خود "یہ سوگ" وہی سوزِ دروں تھا جو برفیلے پہاڑوں کو چھو جائے تو پانی کر دے اور سمندروں کی تہ میں پہنچے تو کرۂ آب کو بھاپ بنا کر اڑا دے۔

جب لوگوں نے کہا ـــ

"آگے بڑھیے؟ ـــ ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں!" ـــ

تو زبیرؓ نے پلٹ کر دیکھا۔ آنکھوں سے چھلکتے ہوئے عجز اور یقین نے ملکوتی حسین جلال کی شکل اختیار کر لی۔

"نہیں! ـــ تم لوگ میرا ساتھ نہ دے سکو گے!"

اور سچ مچ کوئی ان کا ساتھ نہ دے سکا ـــ اس لئے کہ وہ بڑھتے تو بڑھتے ہی چلے گئے۔ تلواروں کی خوں چکاں گھٹاؤں کو چیرتے ہوئے ـــ تیروں کی سنسناتی ہوئی باڑھ کو کاٹتے چھانٹتے ہوئے ـــ آہن و فولاد میں ڈوبی ہوئی انسانی فوجوں میں دراڑیں ڈالتے ہوئے وہ بڑھتے ہی گئے اور وہاں تک جا پہنچے جہاں دشمن کی فوج ہی ختم ہو گئی تھی! ـــ وہ میدان جنگ کے بیچ میں آر پار نکل گئے تھے۔ پھر وہاں بھی نہ رکے ـــ وہ جوار بن کر چڑھے تھے اور بھاٹا بن کر پلٹے ـــ مجاہدانہ جذبات کا یہ مد و جزر دوست و دشمن کو حیرت سے مفلوج اور خوف سے ماؤف کرتا ہوا چڑھا اور اترا۔ اور جب وہ ایک بار اسلامی سپاہ میں واپس آئے تو ان کا جسم بے شمار زخموں کا مالا پہنے ہوئے ایک فرید و وحید تاریخی شجاعت

کا اعلان کر رہا تھا۔ کیسے گہرے تھے وہ زخم جو مندمل ہوکر بھی ان کے جسم میں "غار" ڈال گئے تھے اور یہ مندمل ہوتے ہوئے گھاؤ ان کے ساتھ ان کے کفن میں گئے۔ شاید اس لئے کہ انہیں ان کا خدا لاہوتی دنیا میں بھی دیکھنا اور دکھانا چاہتا تھا۔ تاکہ میدانِ حشر میں شہادت کے ان زخموں سے رنگ و نور کے فوارے پھوٹتے ہوئے دیکھکر وہ بدنصیب انسان فرطِ غم سے سینہ کوبی کریں جن کے ہاتھوں نے آنکھیں بند کر کے حق و صداقت کو سینہ فگار کیا تھا۔ کس قدر گہرا ہو گا وہ جذبۂ شہادت جس کے زخموں کے نشانات میں اتنی گہرائی اور اس قدر دیرپائی تھی!۔

لیکن یہی انسان جو موت سے اس قدر بے جھجک ہو کر آنکھیں چار کرتا تھا کہ اس کی تلوار کاٹتے کاٹتے جگہ جگہ سے خود بھی کٹ کر گر گئی تھی —— ہاں یہی تیغ آزما جو تلوار سے ڈرتا تھا نہ توپ سے۔ اپنے خدا سے کتنا ڈرتا تھا!۔

جب قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی کہ۔ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۔ بیشک قیامت کے دن تم اپنے پروردگار کے یہاں جھگڑ رہے ہوں گے —— تو زبیرؓ پکار اُٹھے اور ان کی آواز کانپ رہی تھی:۔

"اے خدا کے رسولؐ! کیا قیامت کے دن ہمارے جھگڑے دہرائے جائیں گے؟"

اور جب اللہ کے رسولؐ نے گہری سنجیدگی اور تشویش کے ساتھ فرمایا تھا "ہاں" —— تو وہ بندۂ جوش جس کی عبادت کی راتیں نالۂ نیم شبی میں گذرتیں اور جس کے دن خوں آشام تلواروں کی چھاؤں

میں زخم کھاتے ہوئے بسر ہوتے تھے ہاں وہ بندۂ مومن اپنی تمام عبادتوں اور جاں نثاریوں کے درمیان معاملات کے خوفناک مواخذے کے اندیشوں میں ڈوبتا چلا گیا۔۔۔ کتنی خوفناک ۔۔۔ کتنی خطرناک ہو گی معاملات کی وہ پکڑ جس کے خیال ہی سے وہ شخص لرزہ براندام تھا جس کے قدموں میں تلواروں کی دھار پر بھی کبھی جنبش تک نہ ہوئی تھی؟ درحقیقت آخرت کے ڈر کا حقیقی ذائقہ کچھ وہی جان سکتا ہے جو غیر اللہ کے لئے نڈر اور بے باک ہو چکا ہو۔ اور کتنی ٹھوس بات ہے کہ یہ دو خوف کبھی یکجا جمع نہیں ہوتے ۔۔۔ خوفِ دنیا اور خوفِ آخرت! ۔۔۔ ایک چیز ہو گی تو دوسری نہ رہے گی اور دوسری ہو گی تو پہلی چیز کا بیخ و بن سے خاتمہ ہو چکا ہو گا۔

اور ۔۔۔

کتنی عظیم ہو گی وہ خدا کی چاہ جس پر گوشت پوست کے دل کش اور جاں نواز رشتوں کو بے دریغ تج دیا گیا۔ ساری دنیا کے پیار کو اپنے لئے عتاب بنا چھوڑا مگر دل پھر بھی ایسا سیر اور ایسا غنی رہا جیسے خدا کے سوا انھیں نہ کسی کے پیار کی طلب تھی اور نہ کسی کی نفرت کی ذرہ برابر پروا! ۔۔۔

اپنے فرزند کو جب وہ بستر علالت پر لیٹے ہوئے اس بات کی وصیت کر رہے تھے کہ قرض اور قرض کی ادائیگی ان کے اموال متروکہ سے کر دی جائے تو کس قدر ناز سے یہ بات کہی تھی کہ اگر "سرمایہ پھر بھی کافی نہ ہو تو پھر میرے مولا کی طرف رجوع کرنا اے بیٹے؟"

"کون ہے آپ کا مولا ابا جی!"

بیٹے نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود پرشوق جذبات کا "رقص شرر" دیکھنے کی آرزو ظاہر کی۔ اور یہ سوال جیسے سوتے ہوئے نغموں پر بہترین مضراب کا کام کر گیا——

جذبات کی وہ ہلچل جو روح کی گہرائیوں میں برپا تھی اُبل پڑی —— رگ و ریشہ سے اُبل پڑی —— چہرے کے خدوخال اس جذبہ کی التہاب انگیزی میں ڈھل گئے آنکھوں میں وہ مقدس اشک تیر گئے جو ایک اللہ والے کی آنکھوں میں صرف اللہ کا نام لیتے ہوئے چھلک سکتے ہیں۔ جذبات کے ہمہ تن ارتعاش میں ایک انتہائی معصومانہ عشق کی وجد انگیز پکار سنائی دی۔

"میرا مولا —— میرا خدا —— میرا سب کچھ؟ —— جس نے ہر آڑے وقت میں میری دستگیری کی ہے" یہ کہتے کہتے آواز گلوگیر ہو گئی اور جہاں الفاظ بے ہوش ہو گئے تھے وہاں آنسوؤں نے داستانِ شوق مکمل کر دی۔

بولو دوستو! جس خدا کو حضرت زبیر بن عوامؓ "اپنا مولا" کہا کرتے تھے کیا وہی ہمارا بھی خدا نہیں؟ ...

کیا وہی خدا قدم قدم پر ہمارے بھی آڑے وقتوں میں کام نہیں آتا؟——

کیا اس کے بارِ احسانات سے ہماری گردنیں بھی کبھی سبکدوش ہو سکتی ہیں؟——

تو پھر آخر کیا اور کیوں ہے کہ اس کا نام ہمارے لبوں پر آتا ہے تو کوئی جذبۂ بیتاب نہ آنسو بن کر آنکھوں سے چھلکتا ہے نہ خون بن کر رگوں سے ٹپک پڑتا ہے؟ —— کیا وہ خدا —— وہ محسنِ اعظم ہمارا خدا نہیں —— یا پھر کیا ہم مسلمان ہیں؟ بے شک وہی ہمارا خدا ہے اور ہم کافر بھی نہیں ہیں لیکن یہ سوال، پھر ایک پر اسرار سوال ہے۔

"کہ کیا ہم مسلمان ہیں؟ ——

تجلی دسمبر ۶۲ء

عرفانِ حق کی وجد انگیزیاں

"ماں ـــ یا ـــ خدا ؟"

کیا قامت کا سوال تھا حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے! ـــ

ذرا دیر ہوئی تھی کہ وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چل کر مکے کے دورِ قہر و ستم کا ایک خطرناک ترین فیصلہ کئے ہوئے والہانہ جذب و جنوں کے عالم میں افتاں خیزاں گذرتے ہوئے دیکھے گئے تھے ـــ ابھی ابھی انھوں نے خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ فقر و جلال پر بیتابانہ دستک دی تھی ـــ ابھی ابھی انھوں نے پتھر کے دیوتاؤں کی طرف سے نفرت سے منھ پھیر کر اپنے حقیقی پروردگار و خالق کے قدموں پر اپنے وجود کو ایک سجدۂ تمام بنا کر گرا دیا تھا ـــ اور ابھی ابھی چیب کہ ان کا نوخیز ایمان چند گھنٹوں کی عمر طے کر سکا تھا حق و صداقت کے قانون نے ان کو قربانی کے لئے پکارتے ہوئے پوچھا تھا:

"ماں ـــ یا ـــ خدا؟ ـــ سوچ لو ان دونوں میں سے کون زیادہ پیارا ہے؟ کس کو لیتے ہو اور کس کو چھوڑتے ہو؟ ـــ"

پھر ـــ

ماں کوئی ایسی ویسی ماں نہیں تھی۔ اس نے سعد رضی اللہ عنہ کو

جس خون دل وجگر سے پالا تھا وہی خون ایک بے پناہ پیار اور انتہا جذبۂ فرزندی بن کر سعد رضؓ کی رگ رگ میں ان کے نوجوان خون کی گردش بن کر رہ گیا تھا۔ زندگی کے مکمل انیس سال اسی ماتا کی قدرومنزلت کی قسم کھاتے ہوئے بسر ہوئے تھے۔ بچپن سے لیکر اوائل شباب کی ان جذبات انگیز منزلوں تک انھوں نے خدا سے پہلے ماں ہی کو۔۔۔ صرف ماں ہی کو دل وروح کی آخری گہرائیوں سے چاہا تھا۔

لیکن۔۔۔ آج ان کی زندگی کے چند لمحات ایمانی نہ جانے کیا شے بن گئے تھے کہ چند پلوں نے انیس سالہ زندگی کی ساری بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ شاید اس لئے کہ انیس سال تک وہ صرف اس عورت کو جانتے تھے جس نے ان کو اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا۔ لیکن آج زندگی کے ان چند انقلاب آفریں ساعتوں نے ان کو اس وحدہٗ لاشریک خالق تک پہنچا دیا تھا جس کی عظیم ترین قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے رحم مادر کی تاریک تنہائیوں میں باپ کے ایک قطرہ ناپاک سے انسان جیسی مقدس مخلوق ڈھال کر دکھائی۔ وہ آج اس انتہا چاہ کے چشمۂ آب حیوان کو پا چکے تھے جس کے آگے ماں کی ساری ماتا شبنم کی ایک حقیر بو۔۔۔ سے بھی زیادہ حقیر و بے مایہ ہے۔

سعد رضؓ!۔۔۔ ہائے ہائے سعد رضؓ!!۔۔۔" سعد رضؓ نے دیکھا کہ ان کی کافرہ ماں خون دل میں نہائی ہوئی سینہ پیٹ رہی اور سر کے بال نوچے ڈالتی ہے۔ یہ چیخ رہی بلک رہی اور چلا رہی ہے۔

"سعد! ـــ ہائے سعد! ـــ تو بے دین ہو گیا! میں بھی......
...... دیکھتی ہوں...... کہ...... تو...... کیسے جاتا ہے محمدؐ کے
پاس! ـــ مجھ پر بھی کھانا پینا حرام ہے اگر تو نے اس کے نئے
دین کو نہ چھوڑا! ـــ ہاں ـــ دیکھتی ہوں تو کیسے جاتا ہے وہاں!
ـــ جائے گا تو تجھے اپنی دکھیارن ماں کی لاش کو روندتے ہوئے
جانا ہوگا ـــ جان دیدوں گی مگر تجھے یوں بے دین نہ ہونے دوں گی"

یہ منظر دیکھکر سعدؓ ابن وقاص کا دل ہل جانا چاہئے تھا ـ
لیکن دل اس طرح ہلا کہ ایمان ویقین کے پاؤں کچھ اور جم گئے! ـ
قربانی کی خوں چکاں چوٹ کھاکر ان کے سینے سے خون کا سرخ سرخ
فوارہ پھوٹا اور ایمان کے نوخیز پودے کو لہلہا اور ترو تازہ کر گیا. وہ سر
جھکائے سب کچھ سنتے رہے ـــ سر اٹھا تو آنکھیں غیرت توحید
سے سرخ گلنار آنکھیں مامتا کے وجود کو چیرتی ہوئیں سیدھی
اپنے خدا تک چلی گئیں ـــ ان آنکھوں میں آج ایک نئی ـــ
بالکل انوکھی "نظر" تھی جس کو نہ ماں جان سکی اور جو نہ ماں کو پہچان
سکی! ـــ ایک نظر ـــ سراپا نور ـــ نور ہی کی جویا ـــ ظلمت
سے متنفر ـــ تاریکیوں سے گریزاں ـــ خواہ یہ تاریکی ایک چاہنے
والی ماں کا دلدوز روپ دھار کر کیوں نہ آکھڑی ہو! ـــ

یہ نظر اُٹھی تو ایمان کی روحانی دھڑکنوں سے گوشت پوست
کا شیش محل تھر تھرا اٹھا ـــ سعدؓ کی جذبات سے بوجھل آواز
یوں سنائی دے رہی تھی ـــ

ماں! ـــ تو اس بیٹے کو تو خوب پہچانتی ہے جس کو تو نے جنا

ہے اور اتنے بڑے خالق کو ذرا انہیں پہچانتی جس نے تجھے بھی پیدا کیا اور مجھے بھی!! — میری نادان ماں! — دیکھ تو ہم دا میں نے کیسا پیارا قیمہ ملہ کیا ہے جو مجھے تجھ سے بھی زیادہ پیارا ہے — آہ تو نہیں جانتی کہ وہ انسان جس کا نام محمدؐ ہے اس کو دیکھ کر دل کیوں پکار اٹھتا ہے کہ آپ پر میری ماں نثار — میرا باپ قربان اور میری جان بھی! —"

تین دن تک خون اور ایمان کے درمیان جنگ برپا رہی — مامتا اور بندگی کے دو جذبے پوری قوت سے ٹکراتے رہے — تین دن تک سعدرضؓ کی ماں بے آب و دانہ پڑی ہوئی سعدرضؓ کو پکارتی رہی — بھوک پیاس کے جبڑوں میں پستی ہوئی مامتا کی جگر خراش پکار رہ رہ کر ڈوبتی ابھرتی رہی، لیکن — ہر بار سعدرضؓ کے ہونٹوں سے خونِ حیات میں بھیگی ہوئی اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی یہی صدائے بازگشت بلند ہوتی رہی کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں — اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں!"

کیسا ہوگا وہ آدمی جس کا دل کچھ اس طرح دھڑکا کہ اپنے خون کے دھاروں کا رخ پلٹ کر رکھ دیا — وہ اس نے رُخ پر چلا تو پیچھے ہٹنا تو کیسا پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ کیسا فلک بوس تھا یہ جذبۂ صداقت کہ اس کو خدائے کائنات نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس سینے پر وحی بنا کر اُتارا — قرآن کی آیتیں عرش کی بلندیوں سے چلیں تاکہ فرش زمین پر اتر کر خون اور

ایمان کے جہاد میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے سعدؓ کی پشت پناہی کریں۔

"وَاِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا! — اگر وہ دونوں (ماں باپ) یہ کوشش کریں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائے جس کا تجھ کو کوئی علم نہیں تو مت مان ان کا کہا!"

سعدؓ کے جذبۂ حق کی پذیرائی میں یہ اُسی قرآن پاک کی آواز تھی جس نے انسان کو خدا کے شکر کے متوازی شکرِ والدین پر اُبھارا ہے۔

سعدؓ کے پائے ثبات کو لڑکھڑانے میں ناکام دیکھ کر ماں کی بے رحمی آگے بڑھی۔ اپنائیت کے بجائے بیگانگی نے وار کیا۔ آنسوؤں کی بارش رکی تو پتھراؤ شروع ہو گئے — کانٹے برسے — شعلوں کی بوچھار ہوئی۔ لیکن جوان سعدؓ کا جذبۂ حق جوان ہی رہا! — اس پر تو جیسے کچھ اور نشہ سا چھا گیا — اس کے جوشِ عمل کے ولولے کچھ اور امنڈ پڑے۔ خود نوچے جانے کے بجائے تیر و نشتر کی زد پر اس نے صداقت سینہ ہی نہیں کھول دیا بلکہ اس نے تو اس وقت بھی آستینیں چڑھا رکھی تھیں جب کہ [illegible] نبوت پوری بستی میں حق پسندوں کے گرد [illegible] تنگ کر رہی تھی [illegible] اللہ والے محض آنسو پی رہے تھے کفر کا خون پی رہا تھا [illegible] سعدؓ کے نوجوان خون میں شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔ جب پہاڑ کی ایک خاموش گھاٹی میں چھپے ہوئے خدا کے چند بندے اپنے

خدا کو یاد کر رہے تھے ـــ جب کافروں کی ایک خرمست ٹولی ادھر آنکلی اور کفر نے اسلام کی جاں بازی پر جرم ضعیفی کا دھوکہ کھاکر حق وصداقت پر قہقہہ لگایا تو سعد رضؓ ابن وقاص ہی تو تھے جنھوں نے بے تحاشا آگے بڑھ کر ایک ہڈی کے بھرپور وار سے کفر کی سرکوبی کا پہلا تاریخی آغاز کیا تھا۔

ظلم وستم کی آتشیں باڑھ کچھ اور تیز ہوئی ـــ جب تک صرف جان خطرے میں تھی خدا کے بندے جان کی بازی لگائے ہوئے حق کا پیغام بلند کرتے رہے۔ لیکن جوں ہی جان سے بھی زیادہ پیارا ایمان خطرے میں پڑا تو یہ لوگ اس آخری قربانی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کا چھوٹا سا نام ترک وطن اور ہجرت فی سبیل اللہ ہے، جنت خداوندی کے یہ ارضی شہری ـــ دنیا بھر کو پردیس اور محض حسن رہگذر قرار دینے والے اٹھے اور گھر بار سے دامن جھاڑ کر خانہ ویرانی کی سمت چل نکلے ـــ مکہ چھوڑا اور مدینے کی دور افتادہ بستی میں خانہ بدوشی کا پڑاؤ ڈالا ـــ خطرہ اب بھی قائم تھا ـــ خطرہ تھا کہ ایمان کے مکی دشمن اس قربانی کو دیکھ کر چین سے نہ بیٹھیں گے اس لئے قریش کی نقل وحرکت کی تفتیش کے لئے مجاہدوں کا ایک سرفروش رسالہ روانہ کیا گیا تو خدا کا یہ بندۂ بے باک بھی پروانہ وار ساتھ ہولیا ـــ وہ تو ہر لمحہ اس لمحے کے لئے بیتاب تھا، جہاں وہ حق کو باطل سے ٹکرا ڈالے۔ خدا کے قدموں کو چھو لینے والا سر بےچین تھا کہ خدا کی گلی میں کٹ کر گر پڑے ـــ یہ رسالہ ساحل سمندر تک ریگستان کی خاک چھانتا چلا گیا تو وہاں قریشیوں کی ایک ٹولی دور

سے دکھائی دی۔ سعدرضؓ کے لئے یہ منظر صرف دیکھنے کی چیز نہ تھا۔ رگ و پے میں دوڑنے والا خون جذبہ جہاد بن کر اس کے ہاتھوں تک آپہنچا اور جس دُور افتادہ دشمن خدا کی ٹولی پر لوگوں کی نظر مرکوز تھی اس پر سعدرضؓ کے ترکش توحید کے تیر نے اپنا پہلا نشانہ لگا کر دم لیا!۔ اسلام کی کمان کا یہ وہ پہلا تیر تھا جس نے باطل کے سینے میں پیوست ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کے معنی سمجھائے۔

یہ مہم سعدرضؓ کے جذبہ اقبال و جہاد کیلئے تیر نیم کش ثابت ہوئی اس لئے وہ جیسے ہی اس مہم سے تشنہ کامانہ پلٹے تو ایک اس سے بھی بڑی مہم پر بیتابانہ روانہ ہو گئے۔ ان کے سینے میں شہادتِ حق کی جو پرسوز آگ روشن ہو چکی تھی اس نے ان کو مدینہ کے گوشۂ عافیت میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا ـــــ وہ تو رہ رہ کر بیتاب اٹھتے۔ اٹھتے اور ان فداکاروں کے دوش بدوش جدوجہد کرتے ہوئے نکلتے جو اللہ والوں کو ہر خطرے سے بچانے کے لئے ہر خطرے کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اس بار اس خطرکوش مہم کی منزل مقصود مکہ اور طائف کا وہ درمیانی نخلستان تھا جہاں کفر و شرک کے بدترین زہریلے ناگ فضا میں زہرناک پھنکاریں چھوڑ رہے تھے موت اور ہلاکت کے عفریتی بن میں داخل ہونے سے پہلے سرخیل مہم حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان خانہ بدوشانِ حق کی طرف رخ کر کے بھرپور سوال کیا۔

"کون آگے جانا چاہتا ہے اور کون پلٹ جانے کا خواہاں ہے؟

ـــــ آگے وہی آئے جس کو شہادت اپنی جان عزیز سے پیاری ہو۔ مختلف چہروں سے جذبۂ شہادت کی چمک نمایاں ہوئی۔ سعدرضؓ

کا چہرہ جذبہ کے درمیان میں بے پناہ تمتماہٹ کے لحاظ سے اپنا جواب آپ تھا۔ جیسے تمام مجاہدوں کا گرم گرم خون اس ایک چہرے میں سمٹ کر شعلۂ جوالا بن گیا ہو ـــ ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک ابھر آئی جو ایک بہترین آرزو کی روحانی انگڑائی سے انسان کے وجود میں آتشِ سیال دوڑا دیتی ہے ـــ ان کے دل کی ولولہ خیز دھڑکنیں جنبشِ لب تک آ گئیں اور ایک زبردست نعرۂ تکبیر میں ڈھل کر زمین سے آسمان تک گونجتی چلی گئیں "ہمارے ـــ اے سرخیل ہم! ہمیں شہادت جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ خدا کی قسم! اسی مرنے کی آرزو میں جیتے ہیں ہم دیوانے! ـــ آپ ہمیں خطرات کا احساس دلا کر ڈرا رہے ہیں کہ اس جذب و جنوں کی آگ کو بھڑکائے دے رہے ہیں ـــ بڑھئے! ـــ کہ ہمارا خون ہماری رگ و پے سے پھوٹ نکلنے کے لئے بیتاب ہے! ـــ"

سعد رضی کا جوشِ جہاد آج اس آخری حد پر آ پہنچا تھا جہاں مجاہد نے یا مار ڈالنے کے لئے یا مر جانے کو کوئی تیسری راہ ممکن ہی نہیں رہتی لیکن ابھی مجاہدینِ خدا کو کئی بڑے بڑے کام لینے باقی تھے بھلا وہ کیسی ایسی ویسی گلی میں کھینچ کر کام آ جاتا ـــ حسنِ اتفاق یہ ہوا کہ جب یہ چھوٹا سا دستہ وادی خوف و خطر کی طرف پھیلتا بڑھتا چلا جا رہا تو ان کا اور ان کے ساتھی عتبہ بن غزوان کا اونٹ راہ میں بھٹک کر گم ہو گیا ـــ اور شہادت کے متوالے کا اپنے دستے سے ایسا ساتھ چھوٹا کہ پھر مدینہ ہی میں ان سے ان کی ملاقات ہو سکی!

تب بدر کا پہلا وہ تاریخی دن پڑا جہاں اللہ والوں کی ننگی گردنیں ننگی آبدار تلواروں سے لپٹ لپٹ کر یہ بتا رہی تھیں کہ حق وصداقت کی راہ میں موت زندگی سے کہیں زیادہ لذیذ ہوجاتی ہے تو جیسے سعد رضؓ کے اندر تیرہ سال سے سویا ہوا شیر جاگ اٹھا۔ جب پہلی بار نہتے اسلام کے روبرو کفر و شرک کے اسلحہ خانے کھڑے تھے ۔۔۔ جب پتھروں اور مزاروں کے بےحس پجاریوں کا خون انسانی طاقت ۔۔۔ سرمائے کی طاقت ۔۔۔ ہتھیاروں کی طاقت ۔۔۔ وحشت و خونخواری کی طاقت کو یکجا کئے ہوئے ان مٹھی بھر انسانوں کو پیس ڈالنے کی قسم کھاتا ہوا مرگ انبوہ کی طرح ٹوٹا پڑتا تھا تو سعد رضؓ نے اسلامی صفوں کے بھوکے پیاسے چہروں اور پھٹے پرانے چیتھڑوں کے درمیان سے جست کی اور کفر کے پتھریلے سینے پر اس ایک نعرۂ تکبیر سے خراشیں ڈال دیں ۔۔۔

"سن لو اے دیوانو! کہ اللہ سب سے بڑا ہے!" ۔۔۔ وہ جذبہ بیتاب جو گذشتہ تیرہ سال سے ان کے لہو میں ڈوبا رہا اور جاں نثار آنکھوں ہی آنکھوں میں تیر رہا تھا آج اُمنڈ کر ان کے بیتاب ہاتھوں کی راہ سے تلوار کے دستے پر آپہنچا تو انسان نے جیسے جہاد کی شکل اختیار کرلی۔ وہ بڑھے تو کفر کی آہنی صفوں کو چیرتے چلے گئے، فولاد کی دیواریں کاغذ کی طرح پھاڑ ڈالیں اور کفر کی بھری فوج میں گھس کر اس کے ایک تاج زرنگار پر نفرت سے ٹھوکر ماردی۔ خدا کے آگے سرکشی کی جرأت کرنے والا ایک مردود ترین سر کٹ کر گرا ۔۔۔ یہ سعید بن العاص کا سر تھا ۔۔۔ یہ سر گردن سے اتار کر سعد رضؓ جب

مقتول سردار کفر کی ذوالکتیفہ نامی وہ مشہور کتاب چھین کر اسلامی صفوں میں پلٹ کر آئے جس کو اس کافر نے اسلام کی نفرت میں زہر میں بجھا بجھا کر بڑے حوصلوں سے سان پر چڑھایا تھا — وہ یہ تلوار لئے ہوئے چلے تو راستے میں ان کے اپنے مسلم حقیقی بھائی حضرت عمیر رضؓ کی خون میں نہائی ہوئی لاش نے ان کا استقبال کیا۔ لیکن سعد رضؓ یہ منظر دیکھ کر بھی ایمانی سرمستی سے وجد کرتے ہوئے چلتے رہے، نہ رُکے نہ لرزے۔ وہ والہانہ انداز میں بڑھتے ہوئے خدا کے رسول ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور کہا " میں یہ تلوار لینا چاہتا ہوں جس کو میں نے بڑے چاؤ سے لوٹا۔ اور جس کو چلانے کی حسرت ابھی میرے دل میں موجزن ہے"۔ اور جب رسول خدا نے ابھی تک مال غنیمت کے باب میں کوئی خدائی حکم موجود نہ ہونے کی بنا پر سعد رضؓ کی فرمائش پوری کرنے سے انکار کر دیا — جب سعد رضؓ کا جذبہ جہاد و قتال مایوسی کی چوٹ کھا کر پلٹا تو ایک بار پھر سعد رضؓ کا خدا سعد رضؓ کے پیچھے پیچھے پکارتا ہوا آیا — قرآن تلواروں کی چھاؤں میں نازل ہوا اور مال غنیمت کے احکام عرش سے فرش پر سعد رضؓ کی دل جوئی کے لئے اترتے چلے آئے خدا کے رسول ﷺ نے سعد رضؓ کو فوراً بلا کر ان کی محبوب تلوار عطا فرما دی۔

جنگ احد کی بساط جب کفر کے دوسرے حملے سے نہیں — بلکہ درحقیقت خود کچھ مسلمانوں کی کوتاہ اگن چوک سے اسلام کے خلاف الٹ گئی اور میدان کارزار اچھا خاصا میدان حشر بن گیا — جب خدا کو پہچاننے والی تابناک نظریں تھوڑی دیر کو اس طرح ماؤف و معطل ہوئیں

کہ انسان تک کو پہچاننا دوبھر ہو گیا ـــــ جب حق پسندوں کی تلواروں سے حق پسندوں کی کتنی ہی گردنیں کٹ گئیں ـــــ ہاں اس وقت اگر طلحہ رض جیسا مجاہد آفتابِ رسالت ؐ کے لئے سینہ سپر ہو کر باطل کیشوں کے تیر پر تیر کھا رہا تھا تو سعد رض ابن وقاص جیسا نبرد آزما لئے حق محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان گرامی کو اپنی گھائل جان کی آڑ میں لئے ہوئے محمد ؐ کے دشمنوں پر اس بے جگری سے ترکش خالی کر رہا تھا جیسے بتا رہا ہو کہ "میری پشت پر تم جس "محمد ؐ" کو دیکھ رہے ہو وہ تنہا نہیں خود خدا بھی اس کے ساتھ ہے۔ میری کمک پر ہے۔ پھر کون ہے جو مجھے اس وقت شکست دے سکے؟"

حملوں کی باڑھ جوں جوں تیز سے تیز تر ہو رہی تھی سعد رض کا ترکش خالی ہو رہا تھا ـــــ لیکن جیسے جیسے ترکش خالی ہو رہا تھا سعد رض کے جذب و جنوں کے تیور کچھ اور زلزلہ انگیز ہوتے جا رہے تھے ـــــ اور ان کا یہ یقین ٹھاٹیں مارتا ہوا بڑھ رہا تھا کہ تیر ختم ہو سکتے ہیں اور ختم ہو جائیں گے لیکن میرے خدا کی غیبی طاقت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

اس فضا میں جب کفر کی سات سو فولادی زرہوں کا سیاہ بادل ـــــ تین ہزار اونٹوں کا امنڈتا چڑھتا ہوا جھنڈ ـــــ دو سو گھوڑوں کی آندھیاں اڑاتی ہوئیں ہولناک ٹاپیں ـــــ اور پانچ ہزار خونخواروں کا کف اڑاتا اور خون تھوکتا ہوا وحشی غول ایک ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پر تول کر ٹوٹا پڑتا تھا ـــــ جب ایک ہزار حق پسند مجاہدوں کی روح

رواں — خدا کا آخری پیغمبر ﷺ اپنے ایک ہزار دست و بازو مجاہدوں سے بچھڑ کر اس طوفانی چڑھائی کے نشانے پر کھڑا تھا اس وقت سعد رض کی خطرناک تیر اندازی قادر اندازی کے وہ جوہر دکھا رہی تھی کہ کافروں کی زبانیں تیر کھا کھا کر کتوں کی طرح باہر لٹک پڑتی تھیں — اکیلے خدا کی بیکراں طاقت پر بھرپور بھروسہ کرنے والے انسان کامل — حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں سے سعد رض کو داد پہ داد مل رہی تھی :-

یا سعد ارم — فداک ابی و امی !! — اے سعد! تیر مارا — تیرے ماں باپ تجھ پر نثار! — یہ حضور ﷺ کی آواز تھی! — یہ سعد رض کی للہیت کی بلندیوں کو مس کر رہی تھی کر خدا کا رسول ﷺ اس طرح پکار اٹھا! — اور یہ پکار سن کر سعد رض کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے پورے وجود میں ساری کائنات کی طاقت اُبل اُبل کر سمٹ آئی ہے — خون کے ایک ایک قطرے سے جذبات کے سیکڑوں جوالا مکھی پھٹ پڑنے کے لئے بیتاب تھے۔ سعد رض نے اس آواز پر ترکش میں ہاتھ ڈالا تو اس کا آخری تیر — بے پھل کا شکستہ تیر ہاتھ آیا — سعد رض کی ساری زندگی گویا اسی ایک تیر میں جذب ہو گئی اور یہ تیر کچھ اس طرح چلایا کہ پانچ ہزار خونخوار سواروں کے ہجوم میں آگے بڑھنے والا دشمن تیر کھا کر اس طرح بوکھلایا کہ بے سدھ ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا — موت اور ہلاکت کے منجدھار میں مجاہد حق کی یہ قادر اندازی دیکھ کر حضور ﷺ اس قدر مسکرائے — اس قدر مسکرائے کہ آبدار دانتوں کے کھرہائے

شاہوار دکھائی دینے لگے۔

ہائے مولا — کیسا تھا وہ تیرا بندہ — تیرا پیارا رسول ؐ جس کا پر یقین تبسم خطرہ و خوف کی گھٹاٹوپ اندھیاری میں چاند سورج کو شرمائے دیتا تھا! — اور — کیسے تھے اس پر وہ ایمان لانے والے جو اس کے تبسم کی روشنی میں اپنی زندگی کے ایک عظیم جنون سے موت کے لشکر کو بدحواس کئے ڈالتے تھے! — ہاں جن کو خدا کے سوا کسی کا بھی تو ڈر نہ تھا!!۔

سعد رض ابن ابی وقاص کی جاں نثاریاں یوں ہی جہاد سے جہاد تک گرجتی کڑکتی بڑھتی ہی رہیں — بدر و احد کے محاذوں سے نکلے تو فتح مکہ تک یہ بجلی چمکتی چلی گئی — فتح مکہ سے آگے بڑھے تو غزوہ حنین میں تیروں کی ہولناک آندھی پر عقابی نظریں جمائے ہوئے وہ اس وقت بھی پہاڑ کی طرح ڈٹے ہوئے تھے جب ہزاروں کو وہ لگن قدم یکبارگی اکھڑتے چلے گئے تھے غزوۂ حنین سے پھرے تو غزوہ طائف میں گھن گرج بن کر لپکے، اور وہاں سے پلٹے تو دیکھا گیا کہ تبوک کی راہ پرخار — شعلوں کی سڑک پر پاؤں میں چھالے ہی چھالے ڈالے ہوئے اس طرح بڑھ رہے ہیں جیسے کوئی فرش لالہ و گل پر نازک خرامی کے مزے لوٹ رہا ہو!۔

لیکن ۲۳ سال تک آبلہ پائی اور جاں نثاری کے ہفت خوان سر کرنے کے بعد بھی ان کو یہی محسوس ہوا کرتا جیسا ابھی تو وہ کچھ چلے ہی نہیں! — کیسی ہوتی ہوگی رضائے الٰہی کی وہ روحانی پیاس جس نے بندوں کے خون کو اس طرح سیماب بنا دیا تھا کہ جب تک جسم میں

ہو کی ایک چھینٹ بھی باقی رہی ان کے دلوں کو قرار نہ آیا!

سنہ ۱۰ھ میں ــــ حجۃ الوداع میں شرکت سے محرومی پر سینہ فگار جب سعد رضؓ مکہ المکرمہ میں بستر علالت کی شکن بنے پڑے تھے ـ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس آکر ان کی بالیں پر تشریف لاکر ان کا حال پوچھا تو تشنہ غرض بندگی سعد رضؓ کے ہونٹوں سے بیماری کے دکھ درد کی کوئی کراہ نکلنے کے بجائے کسی اور ہی حسرت کے آنسوؤں سے آنکھیں چھلک گئیں ـ

" زندگی شاید ختم ہوا چاہتی ہے اے خدا کے رسولؐ! ـــ اور آپ کے سعد رضؓ کا فرض ابھی تک جوں کا توں باقی ہے ـــ خدارا اجازت دیجئے کہ وہ بیکس بندہ جو اب جان سے جہاد نہیں کر سکتا اپنے مال ہی سے جہاد کا حوصلہ نکالے ـــ "

" کیا چاہتے ہو ـــ اے سعد رضؓ! " حضورؐ ایک لطیف ترین مسرت کے ساتھ کچھ اور قریب آگئے اور اس انسان پر اپنی مقناطیسی نگاہیں جما دیں جس کی آنکھوں میں اس کا دل کسمسا کر آگیا تھا ـ

" حضورؐ! ـــ میری کوئی اولاد نرینہ نہیں ـ تو پھر میں کیوں نہ دو تہائی مال و دولت راہ مولا میں لٹا تا جاؤں ـ "

" نہیں نہیں اے سعد رضؓ! " حد سے بڑھی ہوئی جاں نثاری کو حضورؐ نے شفقت و حکمت سے تھپکی دیتے ہوئے روکا لیکن اس دلاسے کے بعد بھی سب کچھ لٹا دینے کا جذبہ سرشار سرد و مطمئن نہ ہوا ـــ بچوں کی طرح گڑگڑانے لگے بیمار سعد رضؓ " اچھا ـــ اے خدا کے رسولؐ! ـــ بس آدھا مال لٹانے دیجئے ـــ

—صرف آدھا! —"

"نہیں" حضورؐ کے الفاظ میں سعدرضؓ کے دردمندگی کی اشک آلود اور تبسم آمیز پذیرائی تھی "دیکھو سعدؓ! اپنے پسماندگان کو مفلس و لاچار چھوڑ جانے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ تم انھیں مالا مال چھوڑ کر خدا کے پاس جاؤ تاکہ وہ در در کی بھیک مانگتے نہ پھریں — اچھا اچھا! — جاؤ ایک تہائی مال اپنے مولا کی راہ میں لٹا دو تم! — مت سوچو کہ بیوی بچوں کا خیال رکھنے سے تم رضائے الٰہی کا کوئی حصہ کھو بیٹھو گے — جانتے ہو؟ — بیوی کے منہ میں جانے والا ہر نوالہ تمھارے لئے ایک حسین توشۂ آخرت ہے —"

یوں سعدرضؓ کے دل بیقرار کو دولت کی طرف سے سکون ملا تو وطن کی قربانی کا مسئلہ جاگ اٹھا۔ وہ مکے میں بیمار پڑے تھے — وہی مکہ — ہاں وہی پیارا وطن جس کو وہ ایک بار اور ہمیشہ کے لئے ادائے مشیت پر نثار کر چکے تھے یہ سوچ کر وطن عزیز کی سہانی فضائیں ان کو پردیس سے زیادہ ڈسنے اور کاٹ کھانے کو دوڑنے لگیں — بیماری بڑھ رہی تھی اور یہ امید دم توڑ رہی تھی کہ شاید وہ ایک بار پھر اسی مدینے میں جا کر جینے اور مرنے کی دلی حسرت دل ہی میں لے جائیں گے جو ان کا جسمانی نہیں روحانی وطن بن چکا تھا۔

ضبط کے بند اس وقت پارہ پارہ ہی ہو گئے جب اس عالم میں حضورؐ ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔ حضورؐ کو دیکھنا تھا کہ شدت ضبط سے ان کی گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی اور وہ تکیے میں منہ دیکر سسکیاں لینے لگے "اب...... اب کیا ہو گا اے خدا کے

رسولؐ! کیا اسی سرزمین کی مٹی لکھی ہے جسکو خدا اور رسولؐ کی محبت میں قربان کر کے میں کیسا خوش ہوا کرتا تھا۔“

یہ ہچکیوں اور سسکیوں میں ابھرتے، کلپتے اور ٹوٹتے ہوئے الفاظ سُنکر حضورؐ کا دل بھر آیا اور آپ نے سچ مچ بیتاب ہو کر اپنا مقدس ترین ہاتھ سعدؓ کے پھڑپھڑاتے ہوئے سینے پر رکھ کر بے اختیار خدا کو پکارا ـــــ

”میرے اللہ! سعدؓ کو شفا دے ـــــ میرے اللہ! سعدؓ کو شفا دے ـــــ میرے اللہ! سعدؓ کو شفا دے!!“

سعدؓ کو محسوس ہوا جیسے اس مقدس ہاتھ کے لمس سے رحمتِ خداوندی کا ٹھنڈا ٹھنڈا امرت ان کی نیم جاں دھڑکنوں پر شبنم افشانی کر رہا ہے ـــــ دل و جگر میں دعائیہ ہوک سے ٹھنڈک سی بڑھتی چلی گئی اور پھر حضورؐ کی اس بشارت نے تو جیسے ان کے سہمے ہوئے دل کو پھر سے شیر کر دیا ـــــ ”نہیں اے سعدؓ! ـــــ تم اس وقت تک نہ مروگے جب تک تم سے ایک قوم کو نقصان اور دوسری قوم کو نفع نہ پہنچ لے۔“

اس وقت سعدؓ کچھ نہ سمجھے تھے کہ اس بشارت کی تفصیل کیا ہے؟ ـــــ لیکن عراق اور قادسیہ کی فوج کشی کی کمان ان کو عطا ہوئی، اور عرب نے عجم کو شکست فاش دی تو ان کو پتہ چلا کہ حضورؐ نے کیا اشارہ فرمایا تھا۔

عراق کی وہی عظیم مہم جہاں حضرت ابو عبیدہؓ جیسے مجاہد کام آچکے تھے ـــــ جہاں مثنیٰ شیبانی کے آٹھ ہزار جیالوں کو فتح

وکامرانی کا کچھ سراغ نہ ملا تھا ۔۔۔ سوال تھا کہ کون اس محاذِ خوف وخطر پر جست لگانے کا اہل ہو سکتا ہے آخر؟ حضرت عمر بن خطاب کی بارگاہِ خلافت میں اُمت کے بڑے بڑے دل و دماغ اسی سوال کی اُدھیڑ بن میں گم تھے کہ اچانک حضرت عبداللہ ابن عوفؓ کی ولولہ انگیز آواز نے فکر میں ڈوبے ہوئے سروں کو چونکا دیا۔

"پالیا! ۔۔۔ پالیا!! ۔۔۔ میں نے پالیا!!!"

"کون؟ ۔۔۔ کس کو پالیا آخر؟" ایک ساتھ کئی زبانوں پر بے چینی سے بھرا سوال آگیا "کون ہے وہ جوانِ باز جو اس کوہِ گراں کو اٹھا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے؟"

"سعدؓ ابن ابی وقاص!" حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف چلائے اور حسنِ انتخاب پر فخر و مسرت کی ایک نشیلی چمک سے انکی آنکھوں کے کٹورے جیسے جل اُٹھے ۔۔۔ یکایک سننے والوں کے سینے میں ولولہ و خروش کا تلاطم سا اٹھ کھڑا ہوا اور نعرۂ تکبیر کی فلک شگاف گونج میں کتنی ہی زبانوں پر تائید مچل اُٹھی "بے شک! ۔۔۔ تم نے سچ پالیا عبدالرحمنؓ! ۔۔۔ سعدؓ کے شانوں ہی [illegible] اتنا [illegible] ہے کہ وہ [illegible] اس ذمہ داری سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکتا ہے ۔۔۔"

یوں اس مجاہد کی مجاہدانہ سپہ سالاری کا آغاز ہوا اور [illegible]
ہوا ۔۔۔ تیس ہزار مجاہدوں کے ٹڈی دل [illegible] نظر [illegible]

ہوئے یہ بندۂ حق آگاہ چلا تو اس کے عجز بندگی سے مس ہو کر جنگ کی یہ پتھریلی وادی پانی پانی ہو گئی۔ ٹھیک اس وقت جب عرق النساء کا ہڈی توڑ دینے والا درد ان کی جان کو پھوڑے ڈالتا تھا وہ فوجوں کی صفیں درست کر رہے تھے ۔۔۔ جنگ کے خطرناک نقشوں پر جھکے ہوئے خونِ دل و جگر سے جہاد کے ایک عظیم ترین خاکے میں رنگ بھر رہے تھے۔ جسم کا درد روح کی کسک میں دب کر گم ہو چکا تھا ۔۔۔ رسولِ خدا کی امت کا درد عرق النساء کے درد پر چھایا ہوا تھا ۔۔۔ نہیں! وہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے دلِ دردمند لئے ہوئے نہیں تھا ۔۔۔ اس کو تو خدا کے سارے کنبے۔ ساری انسانیت کا غم ستا رہا تھا۔ وہ گردنیں کاٹنے سے پہلے بے چین تھا کہ انسانوں کی جیتی جاگتی گردنوں کو اس سنگِ آستاں پر جھکا ڈالے جس کے سوا کوئی آستان انسان کی سجدہ ریزی کے لائق ہی نہیں ہے ۔۔۔ اس نے بار بار یہ کوشش کی کہ حق و باطل کی جنگ کا فیصلہ تلواروں کے بجائے دل کی دھڑکنیں کر سکیں ۔۔۔ بار بار اس نے تبلیغی وفد ایرانی حکومت کے پاس روانہ کئے ۔۔۔ وہ بار بار پکار اٹھا کہ "اے لوگو! خدا کی قسم ہم تمہارے ملک کے بھوکے نہیں ۔۔۔ خود تمہارے لئے آسمانی جنت کی کنجیاں لیکر تمہارے پاس آنے کے لئے بیتاب ہیں"

لیکن جب صدائے حق نے پتھریلے دلوں پر اثر نہ کیا اور اس ایمانی سوز کے جواب میں رستم کی یہ حیوانی چنگھاڑ سنائی دی کہ کل تمہاری فوجوں کو تہ و بالا کر ڈالوں گا ۔۔۔ تو دردِ انسانیت سے سلگتے

ہوئے سعدرضؓ میں غیرت توحید کا ولولہ جاگ اٹھا اور نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف جوش کے ساتھ سعدرضؓ نے جنگ کی للکار قبول کرتے ہوئے مجاہدوں سے کہا۔

"اے اسلام کے جیالو! ۔ اٹھ کھڑے ہو اور حق کے دشمنوں پر ہوش اور جوش کی حجت تمام کر دو۔"

جہاد کا سیلاب تیز و تند لئے ہوئے سعدرضؓ کچھ اس طرح بڑھے کہ ایرانی سلطنت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ قادسیہ کا سقوط ہوا۔ بابل قدموں پر گرا ۔۔۔ کوثی کی وہ تاریخی بستی ختم ہوئی جہاں نمرود نے کبھی ابراہیم علیہ السلام کو راکھ میں جلانے کی کوشش کی تھی ۔۔۔ مدائن کی طرف رخ کیا اور ایرانیوں نے دجلہ کے پل اڑا دیئے تو سعدرضؓ مجاہدانہ للکار اٹھے "کود پڑو دریا میں اے خدا کے جواں بازو! ۔ کود پڑو" یہ کہا اور سمندر میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس طرح آگے بڑھے کہ ایرانی سپاہی سراسیمہ حیرت کے عالم میں چیخ اٹھے "دیوہا آمدند ۔۔۔ دیوہا آمدند! ۔۔۔ جن آگئے! ۔۔۔ جنات آگئے!" لیکن وہی انسان جس کی کمان میں گرجتے چمکتے مجاہدوں پر دیووں اور جنوں کا شبہ ہوتا تھا ۔۔۔ ہائے وہ کتنا بڑا انسان تھا! ۔ ٹھیک اس وقت جب اس کے ہاتھوں میں پہاڑوں کی صلابت نظر آرہی تھی اس کی آنکھوں میں خداشناسی کے عرفان اور عبرت کے سلیقے نے سوز و گداز بھرے آنسوؤں سے چراغاں کر دیا تھا ۔۔۔ شکست خوردہ مدائن کی سجدہ ریز بستی کو خاموش و دم بخود دیکھ کر اس کو ایک لمحے

لئے بھی زور بازو پر گھمنڈ کرنے کی مہلت نہ دی اس کی خداشناسی نے اسے۔ یہ قرآنی آیات ان کے لبوں پر آگئیں "کس قدر باغ، چشمے کھیتیاں اور گوناگوں نفیس و عمدہ محلات چھوڑ کر (اگلی قومیں) چل دیں جن میں وہ خوش باش زندگی بسر کرتی تھیں اور ہم نے ان چیزوں کا مالک دوسری قوموں کو بنا دیا۔"

دنیا صرف یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ سعدؓ کی تلوار کسریٰ کے سنہرے محلات اور تاج و تخت پر کوندتی لہراتی خلافتِ اسلامیہ کے نقشے میں نت نئے شہروں کا اضافہ کر رہی ہے۔ دولت کا سیلاب عجم سے عرب کی طرف رواں دواں ہے۔ لیکن سعدؓ خود اپنے اندر جھانک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ جوں جوں جہاد کے فرائض کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا ہے ان کا وجود فقر و استغنا کی ایک نرالی تڑپ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ دولت کے خزانے ان کے قدموں میں ڈھیر ہو رہے ہیں۔ محلات اور قلعوں کے آہنی دروازے ان کے سامنے کھل رہے ہیں۔ اقتدار و شکوہ کے پرچم ان کی شخصیت پر لہرا رہے ہیں، لیکن ان تمام فاتحانہ کارناموں کے ساتھ ساتھ خدا کا خوف اور آخرت کی درد بھری یاد ان کی پوری زندگی کو دنیا سے دور۔ بہت دور تیزی سے کھینچے لئے جا رہی ہے۔ یہی تھا وہ سوز دروں جس نے شمشیر و سناں سے بھی بڑا کام کیا۔ ہتھیاروں نے صرف عجم کی زمین جیتی تھی اور اس سوز نے آتش پرستوں کے سینوں میں توحید کی آگ کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ زمین فتح ہو جانے کے بعد دلوں کی دنیا پر فتح پائی سعدؓ نے۔ ہتھیاروں کی گھن گرج دیکھ کر عجمی سپاہ نے ہتھیار ڈالے

تھے اور سعد رض کے مومنانہ سوز وگداز کو دیکھکر ان لوگوں نے خدائے واحد کے قدموں پر بیتابانہ سر ڈالدیئے —— بڑے بڑے سردار حق کی شہادت دیتے ہوئے اسلام کی طرف والہانہ جوش سے بڑھے —— دیلم کی چار ہزار کی سپاہ نے یکایک ایک ساتھ اسلام کی عظمت کے سامنے سر جھکا دیا۔

سعد رض کی روح میں دولت دنیا سے بے پروائی اور دولت دل کی بڑھتی ہوئی تڑپ اس طرح بڑھی کر ان کے رگ و پے سے پھوٹ نکلی —— ماحول میں سرایت کر گئی —— آنکھوں سے نظر آنے لگی۔ دنیا نے ایک دن یہ حیرت ناک منظر بھی دیکھ لیا کہ امیر المومنین حضرت عمر رض کا ایک فرستادہ کوفہ میں داخل ہوا اور سعد رض کے قصر کی بیرونی ڈیوڑھی کو آگ لگا کر چلا گیا۔ اور سعد رض —— وہی سعد رض اطاعت و عجز کے ساتھ ٹھنڈے دل اور کھلی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے جنھوں نے ایرانی سلطنت کی بساط الٹی تھی اور جنھوں نے اس کوفہ کو آباد کر کے قصر کے آگے یہ ڈیوڑھی محض اس لئے تعمیر کی تھی کہ بازار کے شور و غل سے محفوظ و مامون رہ سکیں —— لیکن جس کو امیر المومنین رض نے محض اس دور اندیشانہ مصلحت سے نذر آتش کرا دینا ضروری سمجھا کہ کہیں یہ ڈیوڑھی حاکم اور محکوم قوم کے درمیان انصاف و عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔ حق و انصاف کی ہر ہلکی سے ہلکی بعید سے بعید مصلحت سعد رض کو اپنی فاتحانہ، مجاہدانہ جد و جہد کی پوری عمر سے بھی زیادہ پیاری تھی —— انھوں نے خندہ پیشانی سے اس مصلحت کو سینے سے لگالیا اور ذاتی عزت و جاہ کے ہر جائز

سے جائز مطالبہ سے کنارہ کش ہو گئے ـــــ یہی نہیں ہوا بلکہ یہ بھی ہوا کہ کوفہ کے کچھ ذاتی مخالفوں نے محض بر بنائے اختلاف بارگاہ خلافت میں حضرت سعدؓ کے خلاف یہ شکایت بھیجی کہ " وہ نماز ٹھیک طریقہ سے نہیں پڑھاتے !" ـــــ سعدؓ نے اس شکایت کو کمال صبر و تحمل سے سُنا - بارگاہ خلافت سے اس شکایت کی چھان بین کے لئے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کوفہ میں آئے اور گھر گھر مسجد مسجد اس شکایت کے ذیل میں عوام کے بیانات قلمبند کرتے رہے - سعدؓ نے عدل و انصاف کی اس تمام کارروائی کو بھی خدا کے ایک بندۂ عاجز کی شان سے دیکھا اور سُنا ـــــ پھر بارگاہ خلافت کے صرف ایک اشارے پر انہوں نے ان تمام علاقوں کی حکمرانی سے دست برداری دیدی جن کو انھوں نے خون دل و جگر سے جیتا اور آباد کیا تھا ـــــ وہی مجاہد جو اپنے حیرتناک عزم و عمل کے ساتھ سپاہ سالاری اور حکمرانی کی بلندیوں تک پہنچا تھا جب خدا نے چاہا کہ وہ ان بلندیوں کو قربان کر دے - تو دنیا نے دیکھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی اسلام کے قدموں پر ڈالدی اور سلطنت و حکومت کے تخت سے اُٹھ کر فقر و غنا کے گوشے میں سمٹ گیا - ان کی زندگی میں جہاد اور جہادِ نفس کی یہ بے پناہ عظمت وہ شئے تھی جس کو حضرت عمرؓ ابن خطاب نے اس وقت خراج عقیدت پیش کیا جب وہ قاتلانہ گھاؤ کھائے ہوئے بستر شہادت پر لہو میں نہائے ہوئے لیٹے تھے - اُنہوں نے اعلان فرمایا کہ " میں نے سعدؓ کو ہرگز کسی بد دیانتی کے شاخسانے میں معطل نہیں کیا تھا " یہ کہا اور خلافت کے لائق صحابہؓ کی فہرست میں حضرت

سعدرضؓ ابن ابی وقاص کا نام نامی شامل کر کے دنیا کو بتایا کہ یہ ہستی صرف کوفہ کی حکمرانی ہی نہیں، بلکہ پوری خلافتِ اسلامیہ پر راج کرنے کے قابل تھی۔

لیکن حضرت سعدرضؓ نے جب زمانے کے یہ تیور دیکھے کہ اسلام کے ہر افق سے خطرناک فتنوں کی طغیانی سر اٹھا رہی ہے اور خطرہ ہے کہ مسلمانوں کا خون ان اختلافات کی بھینٹ نہ چڑھ جائے تو وہ تاج و تخت کی پیش کش سے دامن بچا کر فقر و غنا کی تنہائیوں میں سمٹتے چلے گئے ــــ سمٹتے چلے گئے یہاں تک کہ خود ان کے صاحب زادے پکار اُٹھے۔

"ابا جان! ــــ یہ کیا ہو رہا ہے آپ کو! ــــ آپ جنگل میں اونٹ چرائیں اور ــــ لوگ تاج و تخت کے لئے قسمت آزمائیں!"

"خاموش!" جوش کے ساتھ حضرت سعدؓ نے بیٹے کے سینے پر ہاتھ مارا "میں نے خدا کے رسولؐ سے سُنا ہے کہ خدا مستغنی اور پرہیزگار بندے کو پیار کرتا ہے" ــــ پھر کسی نے چھیڑا تو خلوت گزینی کے راز پہ سے یوں نقاب اٹھایا کہ "میں نے رسولِ خدا سے سُنا ہے کہ عنقریب میرے بعد ایک فتنہ برپا ہوگا جس میں سونے والا بیٹھنے والے سے بیٹھنے والا کھڑے ہونیوالے سے اور کھڑا ہونیوالا چلنے والے سے اچھا ہوگا۔"

اس طرح وہ تلوار جس نے عرب و عجم کی خونریز لڑائیوں میں کفر و شرک کے سر قلم کئے تھے خونِ مومن کے تصور سے

لرزہ براندام ہو کر ہمیشہ کے لیئے نیام میں چلی گئی اور وہ عظیم مجاہد جس کی ستر سال سے زیادہ طویل زندگی کا ہر سانس جنگ و جہاد کے معرکہ زاروں میں بیتا تھا آخر دنیا کے دارالامتحان سے کامیابی کے ساتھ دور نکل کر قبر کی راہ سے گزرتا ہوا اپنے خالق و پروردگار سے اس طرح جا ملا کہ اس کے جسم پر جنگ بدر کا وہ بوسیدہ اونی کپڑا کفن کی شکل میں لپٹا ہوا تھا جو اللہ کے رسول ؐ نے تبرک کے طور پر ان کو عطا کیا تھا۔ ان کے وہ ہاتھ رحمت خداوندی کے لیئے پھیلے ہوئے تھے جنھوں نے دولت دنیا کے خزانوں کو جیتے جی لٹا دیا تھا اور ان کے دل میں خدا اور خدا کے رسول ؐ کے سوا کسی کے لیئے کوئی جگہ نہ تھی۔

ہم سے تاریخ کہتی ہے کہ یہ جہاد و ایثار کی داستانیں تمہاری ہیں۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ اب یہ داستانیں لکھنا تو کیا ان کو پڑھنا بھی ہمیں نہیں آتا۔ پڑھ کر سوچنا اور تڑپنا بھی یاد نہیں رہا ہم کو!۔ اپنے مستقبل کی تاریکی میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے ہم خود اپنے ماضی کی اس روشنی سے دور سے دور تک ہوتے جا رہے ہیں۔ بجھے ہوئے دل، بے نور آنکھیں اور چکرائے ہوئے دماغ لیئے ہوئے آخر ہم کدھر بہتے چلے جا رہے ہیں؟۔ تاریکیوں کے طوفانی تھپیڑے حملہ کرتے ہوئے پوچھتے ہیں "کیا تم مسلمان ہو؟"۔ دنیا ہماری تباہی پر قہقہہ لگا کر پوچھتی ہے "کیا یہ مسلمان ہیں؟" لیکن وائے برحال! کہ ہم خود اب بھی یہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ "کیا ہم مسلمان ہیں؟"۔

تجلی مارچ و اپریل ۱۳

سورج چھپ گیا... روشنی باقی ہے!

بغداد میں وہ غیر معمولی انسان موت کی میٹھی نیند سو رہا ہے، جو کبھی کوفہ کا محض ایک بزاز تھا مگر پھر علم و عمل کی بے پناہ برکت سے اس کی ابدی خواب گاہ پر دنیا کے کج کلاہ سلاطین فرطِ ادب و عقیدت سے سر جھکائے ہوئے دیکھے گئے۔ وہ علم و عمل کے افق سے کیسی شان سے ابھرا تھا! وہ جب کپڑوں کا ایک تاجر تھا تو آس پاس کی بستیوں ہی سے اس کے تھانوں کے خریدار آیا کرتے تھے مگر جب اس نے علم دین کا حلقہ قائم کیا تو خلافتِ عباسیہ اور خود اس کی علمی سلطنت کی سرحدیں ایک ہو کر رہ گئیں۔ اس کے حلقۂ درس میں مکہ، مدینہ، دمشق، بصرہ، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، اصفہان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، رے، قومس، طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، بخارا، سمرقند، ہرات، ترمذ، خوارزم، سیستان، مدائن، موصل اور حمص جیسے بے شمار علمی مرکزوں کے روشن ترین چہرے اس کی آواز پر سراپا گوش دیکھے گئے۔ وہ ایک بہت بڑا آدمی تھا جس کی پذیرائی بھی ایک عظیم الشان پیمانے پر کی گئی اور مخالفت بھی لیکن اس نقطے پر اس کے دوست اور دشمن دونوں ہمنوا ہو جاتے تھے کہ وہ ایک بہت بڑا انسان ہے۔ وہ جدھر سے گذرتا تھا دنیا اُس کے

قدموں میں گری پڑتی تھی اور مخلوقِ خدا پروانہ وار نثار ہوتی نظر آتی تھی۔ دیدہ و دل فرشِ راہ کیے جاتے تھے۔ علمی حلقے اور فکر و نظر کے اسکول ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے آستانہ علمی میں جذب ہو رہے تھے۔ اس کی علمی محفلوں میں وقت کے چیدہ چیدہ دل و دماغ ہجوم کر کے آتے تھے تو سچ مچ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ شانے سے شانہ چھلا کرتے تھے وہ جب اس دنیا سے رخصت ہو کر آخرت کے بڑے سفر پر روانہ ہوا تو محسوس ہوتا تھا کہ انسانی آبادیوں نے ایک سیلِ رواں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا بغداد امنڈ آیا تھا اس کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہنے والوں کا جو پہلا ہجوم پہلی نمازِ جنازہ میں صف بستہ نظر آیا اس میں تقریباً پچاس ہزار انسانی سر شمار کیے گئے۔ یہ ہجوم برابر بڑھ رہا تھا۔ ایک نماز جنازہ ختم نہ ہوتی تھی کہ دوسری کے لئے لوگ جوق در جوق آگے بڑھ آتے چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی مگر آنے والوں کا سلسلہ تھا کہ جاری رہا تھا۔ میت سپردِ خاک کر دی گئی اور اس کے بعد بھی بیس دن تک لوگ آتے رہے اور نماز جنازہ ادا کرتے رہے اس نے وصیت کی تھی کہ میری لاش کو خیزران کے گورستان میں دفن کیا جائے کیونکہ یہی وہ قطعۂ زمین تھا جس کے متعلق اس کو یقین تھا کہ وہ غصب کردہ جاگیر نہیں ہے۔ جس نے عمر بھر دیانت پر جان نثار کی تھی۔ اس کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اس کی لاش کسی ایسی زمین کے حوالے ہو جس پر ظلم و سفاکی کے سیاسی ہاتھوں نے چھاپہ مارا ہو۔ ۱۵۰ھ کی ایک شام کو یہ علم و عمل اور اخلاق و دیانت کا

روشن سورج زمین کے اندر جا چھپا۔ مگر اس کی روشنی آج تک شرق و غرب اور شمال و جنوب میں چراغاں کئے ہوئے ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس کی میت کو غسل دیتے ہوئے ائمۂ وقت نے یہ نوائے شوق بلند کی تھی :۔

"خدا کی قسم! تم سب سے بڑے فقیہہ ـــ بڑے عابد بڑے زاہد تھے۔ تم میں ساری کی ساری خوبیاں جمع تھیں۔ تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں۔

ہزار سال سے بھی زیادہ بیت گئے۔ مگر یہ نوائے شوق چار دانگ عالم میں کروڑوں سینوں سے گونجتی ہوئی بلند ہو رہی ہے اے امام ابو حنیفہ رح! ـــ اے امام اعظم رح! آپ کی خاک کے ہر ذرّہ پر رحمت الٰہی کے آفتاب ضو فگن رہیں کہ آپ نے ہمیں بتایا کہ علم دین ہوتا کیا ہے اور اس کی قیمت کس طرح ادا کی جا سکتی ہے۔

یہ امام ابو حنیفہ رح کوفہ کے وہی نوجوان نعمانؒ ہی تو تھے جن کی پیشانی سے کوفہ کے جلیل القدر امام شعبی رح نے علم و فضل کا نور ٹپکتا ہوا دیکھ کر پوچھا تھا :

"اے نوجوان کہاں جا رہے ہو ؟"

امام صاحب نے جواب میں بتایا تھا کہ فلاں سوداگر کے یہاں جا رہا ہوں۔

"نہیں نہیں!" امام شعبی رح نے فرمایا تھا "میرا مطلب یہ ہے کہ تم

پڑھتے کس سے ہو ؟"
"کسی سے بھی نہیں!" امام ابو حنیفہؒ نے یاس و تأسف کی ملی جلی آواز میں جواب دیا تھا۔ اس پر امام شعبیؒ نے کوفہ کے اس نوجوان کی شخصیت پر گہری نظر ڈالی تھی اور کہا تھا "مجھ کو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں ـــــ علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو"
لیکن جب علماء کی صحبت میں بیٹھ کر یہ سعادت و صلاحیت کی پہلی کرن سورج بن کر چمک اٹھی تو علم کے احترام نے اپنے استاذِ جلیل حمادؒ کی زندگی بھر اتنی بات کو بھی سوءِ ادب سمجھا کہ وہ اپنے طور پر حلقۂ علمی قائم کرے۔ جب تک استاد بقید حیات رہے مستقبل کے اس آفاقی امام نے خود کو طالب علم بنائے رکھا۔ استاد کی وفات کے بعد بھی ان کے صاحبزادے اور پھر ایک استاذ بھائی کے علمی حلقہ ہی میں امام ابو حنیفہؒ زانوئے ادب تہ کئے بیٹھے رہے۔ جانشین استاذ نے سفر حج کیا اور مستقل طور پر امام ابو حنیفہؒ کو استاد مرحوم کی گدی پر بٹھایا گیا تو علم و فضل کا یہ پہاڑ اس علوئے مرتبت اور ذاتی عجز و انکسار کے درمیان ایک برگِ کاہ کی طرح تھرتھرا رہا تھا ـــــ اسی زمانے میں انھوں نے یہ خواب دیکھا کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھود رہا ہوں ـــــ دماغ و دل پر چھایا ہوا احساسِ عجز خوف و خشیت کے زلزلے میں تبدیل ہو گیا اور محسوس کیا کہ یہ خواب میری علمی بے مائگی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن جب ماہرینِ رویا نے تعبیر دی کہ تم علم دین میں حیات تازہ کی روح پھونکو گے تو ان کے دل کو تسکین

ہوئی اور وہ اس تعبیر کو حقیقت بنانے کے لئے سراپا علم و عمل بن کر آگے بڑھے۔ تاریخ نے گواہی دی کہ یہ تعبیر برحق تھی اور امام ابو حنیفہ رح کا نام اور کام علم دین کی تاریخ میں ایک نقش دوام ثبت کر گیا۔ ایسا نقش جو وقت کی کسی آندھی کسی طوفان سے مٹنے والا نہیں۔

بات بظاہر معمولی نظر آتی ہے مگر حق یہ ہے کہ بہت بڑی بات ہے کہ بڑا ہو جانے کے بعد بھی انسان کو اپنی بڑائی کا احساس تک نہ ہو اور اپنے بزرگوں کے سامنے ہمیشہ خود کو چھوٹا بنائے رکھے عمر بھر حضرت امام کا یہ اصول رہا کہ خانوادۂ علم و فضل کے بزرگوں کو وہ اپنے خاندان اور گھرانے پر ترجیح دیتے رہے۔

یہ وہی اسوہ تھا جو حضرت عمرؓ نے اختیار فرمایا تھا کہ اپنی سگی اولاد تک پر اُن صحابہ رضؓ کو ترجیح اور فوقیت دی جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں خصوصیت حاصل تھی یا جنھوں نے دین حق کی راہ میں بیش از بیش قربانیاں دی تھیں۔ موسم کی اگر کوئی بھی خاص چیز گھر میں آتی تو ابو حنیفہ رح کی طرف سے پہلے شہر کے علماء اور فضلاء کے یہاں پہنچائی جاتی تب کہیں جاکر اپنے گھر والوں کو اس سے لطف اندوزی کی اجازت ملتی تھی۔ علم نوازی جیسے ان کی زندگی کا سب سے محبوب مشغلہ تھی اور اس کے لئے وہ بہانے ڈھونڈا کرتے تھے ان کے صاحب زادے نے سورہ فاتحہ ختم کی تو امام نے ان کے استاد کے قدموں پر پانچ درہم کی تھیلی رکھ دی ان کے ایمان و شعور پر علم و اخلاق کی سربلندیوں کی چھاپ اس قدر گہری پڑ چکی تھی کہ علم کے احترام کو قائم رکھنے کے لئے وہ دولت دنیا

اور عز وجاہ کی بڑی سے بڑی جاذبیت کو بے دریغ ٹھکرا دیتے تھے۔ اُمیّہ خاندان کے ایک حاکم یزید نے جب سیاسی مصالح کے تحت علمائے وقت کو دربار میں گھسیٹ لانا چاہا اور امام ابو حنیفہ رح کو افسر خزانہ کی جگمگاتی ہوئی پیش کش کی تو امام رح نے علم دین کی عظیم ذمہ داریوں کو خطرے میں ڈالنے کے بجائے خود کو عقوبت کے خطرے میں ڈال دیا۔ اقتدارِ وقت ان کے اسی موقف پر چراغ پا ہوگیا اور ان کی مقدس پشت پر روزانہ دس کوڑے برستے رہے لیکن علم وفضل کی شان وشوکت کا پرچم بلند کئے ہوئے وہ کمال استقلال کے ساتھ اپنے موقف پر جمے رہے۔ کمر تازیانوں کی مار سے خوں چکاں ہوگئی مگر قدموں میں ذرا جنبش نہ ہونے پائی۔ بنو اُمیّہ کے زوال کے بعد خلافت عباسیہ کا دور آیا تو منصور نے اسی علمی ودینی آزمائش کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔۔۔ اس کے عہد میں امام ابو حنیفہ رح کی علمی واخلاقی زندگی کو خرید لینے کیلئے سلطنت کا عہدہ قضا پیش کیا گیا۔۔۔ مگر امام رح نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی ایسے اعزاز کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے لئے بھی تیار نہیں جس کی پاداش میں علم کی ساکھ کو دھکا لگ جائے اور آخرت کی رسوائی حصہ میں آئے۔ قوت واقتدار کے طوفانی نشے میں منصور نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ تمہیں یہ عہدہ قبول کرنا ہی ہوگا۔ علم واخلاق کی قلمرو کے متدین ترین حاکم نے کہا "خدا کی قسم! مجھے یہ منظور نہیں"۔۔۔ یہ صورت حال دیکھ کر درباری علماء اور امراء پر حیرت و خوف سے سکتہ طاری ہوگیا اور لوگوں نے امام رح کو انکار وسرتابی کی ہولناکیوں کا احساس دلا کر موقف تبدیل کرنے کا مشورہ دیا

مگر ان کے الفاظ پتھر کی لکیر ثابت ہوئے۔ آخر انہیں پا بجولاں کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور جس دنیا کو مخبر صادق ؐ نے مومن کے لیئے قید خانہ قرار دیا ہے امام ابو حنیفہؒ نے اس میں سچ مچ ایک قیدی کی زندگی گزاری ـــــ اعزاز و عظمت کی عظیم پیش کش ان کا منہ دیکھتی رہ گئی اور انھوں نے اس کی طرف ایک نظر اٹھانے کے بجائے یہ پسند کیا کہ وہ زندگی کے بقیہ دن قید و بند کی تاریک تنہائیوں میں بسر کریں ـــــ وہ زندہ قید میں ڈالے گئے تھے اور وہاں سے ان کی لاش ہی خدا کے آگے سجدہ کی حالت میں باہر نکالی گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہی تھا وہ انسان جس نے اپنے تلمیذ رشید قاضی ابو یوسفؒ کو ایک بار لکھا تھا کہ "تحصیل علم کو ہر شے پر مقدم رکھنا ـــــ اس سے فراغت پا لو تو جائز ذریعوں سے دولت حاصل کرنا کیونکہ ایک وقت میں علم و دولت دونوں کی تحصیل نہیں ہو سکتی" خدا گواہ ہے کہ انھوں نے شاگرد کو جو مشورہ دیا تھا اس کے مطابق خود بھی عملی زندگی کی سنگین قربانگاہ میں علم پر اپنا سب کچھ بھینٹ چڑھا کر دکھا دیا ـــــ انہوں نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا کہ :- جو شخص علم کو دولت دنیا کیلئے سیکھتا ہے علم اس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا۔ انھوں نے کامل ہوش و حواس کے عالم میں علم کے مقابلے میں دولت دنیا کی ہر گوہر بار پیش کش پر لات ماردی اور خدا نے اس کے انعام میں ان کی زندگی کے رگ و پے میں اس علم حقیقی کی جڑیں پھیلا دیں جس کی عظمت کے آگے ملائکہ کو

سجدہ میں گر جانا پڑتا تھا۔ کسی کو اگر یہ دیکھنا ہو کہ وہ زندگی کتنی بلند اور کیسی عقیدت انگیز ہو جاتی ہے جس میں علم دین خون کی جاندار رو اور روح رواں بن کر جذب ہو گیا ہو تو وہ آئے اور تاریخ کے دریچے سے امام ابو حنیفہ رح کی زندگی کی مخصوص جھلکیاں دیکھے — وہ دیکھے کہ زندگی کے جس نشیب میں انسانی کمزوریوں کا پانی مرتا ہے علم دین کی برکت سے کیسی سربلندیاں اور کیسی سدابہار رعنائیاں وہاں کروٹیں لیتیں اور سر اٹھاتی ہیں۔

"کچھ ابو حنیفہ رح کے اوصاف بیان کیجئے"

ہارون الرشید نے ایک بار قاضی ابو یوسف رح سے کہا:

ابو یوسف امام ابو حنیفہ رح کے ممتاز شاگردوں میں تھے سوال سنکر ان کے ذہنی افق پر وہ عظیم الشان شخصیت کوندنے لگی جس میں علم دین عمل بن گیا تھا اور عمل ایک جیتا جاگتا علمی پیغام — عمر بھر کی عقیدت میں ڈوبے ہوئے تاثرات نے قاضی صاحب کے ہونٹوں سے بے ساختہ ابلنا شروع کیا:

"جہاں تک میں جانتا ہوں ابو حنیفہ رح کے اخلاق و عادات یہ تھے کہ نہایت پرہیزگار تھے — شریعت نے جن جن باتوں سے روکا ہے اس سے رکے ہوئے تھے۔ اکثر خاموش اور غور و فکر میں غرق رہتے تھے، کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا اور ان کو معلوم ہوتا تو جواب دیتے ورنہ خاموشی ان کا دیانتدارانہ جواب ہوتی — نہایت سخاوت کیش اور فیاض تھے کسی کے

اُٹھ گئے اپنی حاجت نہ لے جاتے۔ اہل دنیا سے دامن کشاں
تھے۔ دنیا کے منصب وجاہ کو نظر حقارت سے دیکھتے
تھے غیبت سے بہت بچتے تھے۔ جب کسی کا ذکر کرتے تو
ذکر خیر کے طور پر کرتے تھے۔ عالم بہت بڑے تھے اور
مال و دولت کی طرح علم کو خرچ کرتے میں بھی دریا دل تھے!!

انسانی اخلاق کا یہ ذکر جمیل سنکر دربار میں سناٹا چھا گیا۔ علم و عظمت سے ایک انسان تاج و تخت والوں سے خراج عقیدت وصول کر رہا تھا۔ اس پر شوق خاموشی کو توڑتی ہوئی شاہی آواز ہارون الرشید کے دل کی گہرائیوں سے بلند ہوئی:۔

"بے شک صالحین اور پاکبازوں کے اخلاق یہی
ہوتے ہیں"

ابو حنیفہ رح کی باطنی صلاحیت کی طرح ان کا ظاہر بھی نہایت صاف ستھرا تھا۔ نفاست ذوق اور خوش پوشاکی ان کے صفائے قلب و ضمیر کا ایک شاندار مظہر تھی۔ وہ روح کے بھی اجلے تھے اور تن کے بھی لیکن اس خوش پوشاکی کے اندر دھڑکتا ہوا دل جانے کون سی بے مثال دولت کے خزانے چھپائے ہوئے تھا کہ تاج و تخت ان کو حقیر نظر آتے تھے۔

کوفہ کے گورنر نے کیسی لجاجت اور نیاز مندی کے ساتھ کہا تھا:۔

"آپ تو کبھی تشریف ارزانی فرماتے ہی نہیں۔۔۔۔!"

انسانی نفس کے لئے اس انداز کرم میں کتنی اپیل چھپی ہوئی تھی — اس کو محسوس کر کے اس کی پذیرائی کے بجائے فقر و غنا کا موقف وہی شخص اختیار کر سکتا تھا جس کے رگ و ریشہ میں خشوع بندگی کا سوز پیوست ہو چکا ہو۔ امام رح نے ٹھیک یہی موقف اختیار کیا۔

"تم سے مل کر کیا کروں گا؟" انتہائی بے نیازی اور بیباکی کے ساتھ امام رح نے کہا "مہربانی سے پیش آؤ گے تو خطرہ ہے کہ زیر دام نہ آجاؤں — اور عتاب کرو گے تو سراسر رسوائی ہے تمہارے پاس جو مال و دولت ہے مجھے اسکی حاجت نہیں اور میرے پاس جو دولت ہے اس کو کوئی چھین نہیں سکتا"

عباسی سلطنت کے حرم میں خلیفہ منصور اور اس کی بیوی حرّہ خاتون میں گرما گرم بحث چل رہی تھی۔ خاتون کہتی تھی کہ خلیفہ شوہر کی حیثیت سے عدل و انصاف نہیں کر رہا ہے۔ منصور کو یہ بات تسلیم نہیں تھی — آخر منصور نے ثالث کی تجویز سامنے رکھی اور خاتون نے چھوٹتے ہی اس کے لئے امام صاحب رح کا انتخاب کیا۔ اس کو قوی توقع تھی کہ حق کے مقابلے میں سونے چاندی اور قوت و اقتدار کی دھاک اس عظیم انسان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ امام صاحب رح تشریف لائے اور خاتون ورائے حجاب گفتگو سننے کے لئے سراپا گوش ہو گئی۔

"از روئے شریعت" خلیفہ نے نہایت چالاکی سے گفتگو کو اس زاویہ سے اٹھایا "ایک مرد کو کتنے نکاح کرنے کی اجازت ہے؟"

"چار" امام صاحبؒ کا مختصر اور سیدھا سادہ جواب تھا۔
یہ سنتے ہی منصور کا چہرہ مرد کے حقوق کے فاتحانہ احساس سے چمک اٹھا اور اس نے پردے کی طرف رخ کر کے خاتون سے کہا "سنتی ہو!...."

"جی ہاں سنا!" خاتون نے کہا اور اس کی آواز میں نسوانی موقف کے سلسلے میں دبی دبی پکار تھی۔ امام صاحبؒ نے یہ آواز سنی اور حساس ترین انسان نے فوراً سمجھ لیا کہ صورت حال کیا ہے۔ گفتگو اصولاً ختم ہو چکی تھی مگر عورت کی کمزور سسکی نے چونکا دیا تھا کہ اگر عورت کے حقوق کا اعلان نہ کیا گیا تو حقیقت پر ظلم ہوگا۔ امام صاحبؒ فوراً بیتاب ہو گئے اور جرأت کے ساتھ خلیفہ کی طرف رخ کر کے کہا "لیکن یہ اجازت اس شخص کے لئے خاص ہے جو عدل و انصاف پر قادر ہو۔ ورنہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" خلیفہ کے موقف کے علی الرغم یہ اعلائے کلمۃ الحق پوری جرأت و قوت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ خلیفہ نے احساس شکست سے سر جھکا لیا۔ پس پردہ خدا کی کمزور مخلوق عورت اپنا مقدمہ جیت چکی تھی۔ امام صاحبؒ مکان واپس چلے آئے۔

امام صاحبؒ جیسے ہی گھر پہنچے ایک شاہی غلام خاتون کی طرف سے پچاس ہزار کی مالیت کا خراجِ عقیدت اور یہ پیغام لئے ہوئے پہنچا کہ "آپ کی کنیز سلام عرض کرتی ہے اور آپ کی حق گوئی کی دل سے سپاس گزار ہے۔"

امام صاحبؒ نے اس بیش قیمت عطیہ کو قبول کرنے سے انکار

کرتے ہوئے کہلا دیا:۔

میں نے محض اپنا فرض ادا کیا ہے جس کے پیچھے میری کوئی ذاتی خواہش اور غرض نہیں تھی "

تجارت امام صاحب کا ذریعہ معاش تھی ۔۔۔ لیکن اس کاروباری زندگی میں بھی ان کی مومنانہ زندگی کا یہ پہلو مینارۂ نور کی طرح روشن تھا کہ انھوں نے اپنا سب کچھ اپنے خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے ۔ ایک بار انھوں نے اپنے ایجنٹ کو کپڑوں کے کچھ تھان بھیجے اور کہلا دیا کہ فلاں فلاں تھان میں کچھ عیب ہے جس کی اطلاع خریدار کو سودا طے کرتے وقت لازماً کر دیجائے ایجنٹ یہ بات بھول گیا اور کپڑے کے تھان یہ عیب بتلائے بغیر فروخت ہو گئے ۔ امام صاحب رح نے اپنے طور پر اگرچہ اتمام حجت کر چکے تھے لیکن اس کے باوجود یہ صورت حال معلوم ہوئی تو تھانوں کی یہ قیمت ان کے ضمیر کے لئے تیر نیم کش بن کر رہ گئی ۔ فرط تاسف سے ہاتھ ملتے تھے اور اضطراب کے عالم میں سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہو؟ ۔۔۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ تمام رقم خدا کی راہ میں لٹا دی جائے ۔۔۔ یہ تیس ہزار کی رقم جب تک پائی پائی کر کے صدقہ نہ کر دی گئی ان کا ضمیر مطمئن نہیں ہوا۔

دیانت اور ایمان کو متاعِ حیات اور حاصل زندگی سمجھنے کا یہ بے پناہ عقیدہ نت نئے پہلو دکھاتا تھا ۔۔۔ ایک بار ایک عورت ایک قیمتی تھان فروخت کرنے کے لئے آئی ۔

"کیا قیمت لوگی؟" امام صاحب رح نے پوچھا:۔

"سو روپیہ" عورت نے کہا اور امام صاحب کے جواب کا انتظار کرتے ہوئے سوچنے لگی کہ دیکھو منظور کرتے ہیں کہ نہیں۔

"یہ تو کم ہیں" امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غور و فکر کے عالم میں فرمایا اور عورت اس انداز تجارت پر ٹھٹک گئی۔

"اچھا تو دو سو روپیہ" عورت نے امید و بیم کے عالم میں کہا۔

"یہ تھان پانچ سو سے کم قیمت کا نہیں" بندۂ مومن کی دلنشیں، معصوم آواز آئی۔ لیکن کاروبار کا یہ انداز کاروباری دنیا کی تاریخ کا نرالا واقعہ تھا۔ اس لئے عورت کو یقین نہ آتا تھا کہ اس کے کان دھوکہ نہیں کھا رہے ہیں۔

"کیا...... آپ ہنسی کر رہے ہیں......" عورت نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کے جواب میں ایک حرف کہے بغیر پانچ سو کی رقم عورت کے سامنے رکھدی اور تھان اٹھا لیا۔ — عورت حیران اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ —

ایک بار کچھ لوگ ملنے کے لئے آئے۔ ان میں ایک شخص کی خستہ حالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ جب یہ سب لوگ اُٹھ کر جانے لگے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مفلوک الحال شخص کو روک لیا اور جائے نماز کی طرف اشارہ کرکے اس کے نیچے سے دس ہزار درہم کی تھیلی اُٹھا لینے کو کہا۔

"میں ...... میں ..... تو دولت مند ہوں" اس شخص نے گھبرا کر جواب دیا "مجھے اس کی ضرورت نہیں" حساس ترین اور فیاض ترین امام رحؒ نے قدرے ناخوشگواری کے ساتھ فرمایا "تو صورت ایسی نہ بنانی چاہئے کہ دوسروں کو افلاس کا شبہ ہو"

ایک مرتبہ کسی بیمار کی مزاج پرسی کو تشریف لے جا رہے تھے کہ راہ میں اپنا ایک مقروض نظر آیا جو کترا کر نکلا جا رہا تھا۔ امام صاحبؒ نے اس کو آواز دی اور اس طرح کترا جانے کی وجہ پوچھی "میں آپ کا دس ہزار درہم کا مقروض ہوں" اس شخص نے ندامت سے کہا "آپ کو دیکھ کر شرم کے بوجھ سے آنکھیں نہیں اٹھتی تھی اس لئے ......"

اس شرم و حیا اور ضمیر کی ٹیس کو محسوس کرتے ہی امام صاحبؒ کانپ اٹھے اور اعلان کیا:۔

"میں نے وہ رقم معاف کر دی ۔ جاؤ اب تمہیں اس کی ادائیگی کی کوئی فکر نہ کرنی چاہئے۔"

درس کے درمیان میں کسی نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب رحؒ نے مناسب جواب دیا۔ سائل نے کہا کہ "حسن بصری نے تو اس مسئلے میں کچھ اور کہا ہے" امام صاحبؒ نے نہایت متانت کے ساتھ فرمایا "ہاں حسن نے غلطی کی" اس حلقہ میں کوئی شخص حسن بصریؒ کا عقیدت مند بھی بیٹھا ہوا تھا۔ امام صاحب کی یہ بات سن کر اس کو

فرطِ عقیدت میں طرارہ آگیا اور جامے سے باہر ہو کر بولا "او ابن الفاحشہ! تو حسن کو خطا کار ٹھیراتا ہے" امام رح کی شان میں یہ فحش گالی سن کر تمام مجلس میں ہلچل سی پڑ گئی چہرے تمتما گئے اور جذبات کے پیمانے چھلکنے لگے۔ مگر سامنے وقت کا یہ جلیل القدر امام صبر و سکون کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا۔ آخر جب فضا پر سکون ہوئی تو صبر و استقلال اور علم و تحمل کے پہاڑ سے یہ دلنشین، متین اور پُرسوز آواز آئی" ہاں حسن سے اس معاملے میں غلطی کی۔ عبداللہ ابن مسعودؓ سے جو روایت کی ہے وہ اقرب الی الصواب ہے"۔

یزید بن کمیت نے ایک بار کا یہ آنکھوں دیکھا حال بیان کیا کہ میں امام رح کے درس میں خود موجود تھا جب کہ ایک شخص نے امام سے بے ادبی اور دریدہ دہنی کے ساتھ بات چیت شروع کی۔ اس شخص کے تیور جوں جوں بگڑ رہے تھے امام صاحب رح کی متانت اور نرم گفتاری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بات بڑھتی گئی اور آخر اس شخص نے امام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کو "زندیق" کے ہولناک خطاب سے گھائل کر دیا۔ یہ بات اس شخص سے کہی گئی تھی جس نے زبان سے کبھی کسی کی آبرو پر حملہ نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ زخم کھانے کے بعد بھی امام رح نے اس سے زیادہ کچھ بھی تو نہ کہا "خدا تمہاری مغفرت کرے ـــ وہ خوب جانتا ہے کہ میری نسبت تم نے جو لفظ کہا ہے وہ صحیح نہیں ہے"۔

امام صاحب رح خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے کسی پر لعنت

نہیں بھیجی۔ کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کسی مسلمان یا ذمی کو نہیں ستایا کسی سے فریب اور بدعہدی نہیں کی۔"

ایک بار حلقہ درس میں ایک نوعمر لڑکے نے امام صاحب رح کے جواب کو سُنا اور کہہ بیٹھا "ابو حنیفہ رح! تم نے غلط جواب دیا" بڑے بڑے علماء اس درس میں شریک تھے۔ لڑکے کی اس شوخی پر بھڑک اٹھے۔ ابوالخطاب جرجانی نے جلال کے عالم میں پوری مجلس کو للکارتے ہوئے کہا۔۔۔ "تمہاری بے غیرتی کی حد ہو گئی!۔۔۔ ایک لونڈا امام کی شان میں جو منہ میں آتا ہے بک دیتا ہے مگر تمہاری رگِ حمیت نہیں پھڑکتی!"

وہی ابو حنیفہ رح جنھوں نے لڑکے کی اس گستاخی کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سنا تھا اور کچھ نہ کہا تھا جرجانی کے اس طرزِ گفتگو پر برہم ہو گئے اور کہا "ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں آتا۔۔۔ میں اس جگہ بیٹھا ہوں تو اسی لئے بیٹھا ہوں کہ لوگ آزادانہ میری غلطیاں ثابت کریں اور میں تحمل کے ساتھ ان کو سنوں بھی۔۔۔"

امام صاحب رح کے مکان سے متصل ایک رند منش موچی کا گھر تھا رات ہوتی تو وہ اپنے راگ رنگ سے آسمان سر پر اٹھا لیتا اور اکثر یہ شعر لہرایا کرتا:

"لوگوں نے مجھ کو ہاتھ سے کھو دیا۔۔۔ اور کیسے بڑے شخص کو کھو دیا جو جنگ اور رخنہ بندی کے دن کام آتا۔۔۔"

امام صاحب رح کی راتیں اس ہمسائے کی رندانہ ہاؤ ہو سے بُری طرح درہم برہم ہوا کرتیں ۔ لیکن وہ صبر کرتے مسلسل صبر کرتے رہے ۔ موچی نے ذرا احساس نہ کیا کہ وہ امام رح کی عملی مصروفیات اور عبادت نیم شبی میں کس بُری طرح خلل انداز ہو رہا ہے ۔ لیکن اتفاقاً وہ پڑوسی جب ایک رات شراب نوشی کے الزام میں دھر لیا گیا اور دوسری شب اس کی سماعت خراش ہاؤ ہو امام صاحب رح کو سنائی نہ دی تو وہ بے چین ہو گئے فوراً صورتِ حال معلوم کی ۔ موچی کی گرفتاری کی خبر معلوم ہوتے ہی حقوقِ ہمسائگی کا مومنانہ جذبہ بیدار ہوا اور وہی شاہی دربار جہاں بُلایا جانا اپنے لئے عار سمجھتے تھے ازخود وہاں تشریف لے گئے ۔۔۔ بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ امام کا خیر مقدم کیا گیا ۔ امام صاحب رح نے فرمایا " میرے محلّے میں جو موچی رہتا تھا کوتوال نے اس غریب کو گرفتار کر لیا ہے میں اس کی رہائی کی سفارش کے لئے حاضر ہوا ہوں "

یہ سنتے ہی حاکم وقت نے داروغہ جیل کو موچی کی رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور امام صاحب رح اپنے پڑوسی کو قید و بند سے نکال کر اپنے ساتھ لیکر خوش خوش روانہ ہوئے ۔

" دیکھو بھئی " امام صاحب رح نے موچی کو اس کے مخصوص شعر کی یاد دلاتے ہوئے کہا " دیکھو ! ہم نے تمہیں ضائع نہیں ہونے دیا ! "

" نہیں " موچی نے احسان و تشکر کی تمناکیوں کے ساتھ کہا " نہیں ! ۔۔۔ آپ نے تو حق ہمسائگی ادا کر دیا " اخلاقِ

ہو ممانعت کا یہ تیر نیم کش ہوچی کے دل میں ترازو ہوگیا اور اس نے مے پرستی سے توبہ کر کے علمی وعملی زندگی کو سینے سے لگا لیا۔

پرانے زمانے کی مخصوص بڑی بوڑھیوں کی طرح امام صاحبؒ کی والدہ کو شہر کے واعظوں سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ دینی مسئلہ میں کوئی تحقیق کرنا چاہتیں تو امام صاحب سے پوچھنے کے بجائے ان کو شہر کے مشہور واعظ عمرو بن زرقہؒ کے پاس دوڑایا کرتی تھیں اور وقت کا جلیل القدر امام اپنی ماں کے حکم کی تعمیل میں ایک طالب علم کی طرح واعظ شہر کی خدمت میں حاضر ہوتا تو خود عمرو بن زرقہؒ پکار اٹھتے "ارے بھئی! آپ کے سامنے میں کیا منہ کھول سکتا ہوں امام صاحب!"

"نہیں" امام صاحبؒ بوڑھی والدہ کے سعادت مند بیٹے کے انداز میں عجز و انکسار کے ساتھ اصرار کرتے "نہیں آپ ہی فرمایئے۔ اماں جی نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔"

"اچھا تو آپ مجھے یہ مسئلہ بتا دیجئے" واعظ شہر لاچار ہو کر کہتے "میں اس کو آپ کے سامنے دہرا دوں گا۔"

کبھی کبھی والدہ کے شک و شبہ سے نوبت یہاں تک آتی کہ وہ حکم دیتیں "مجھے خود واعظ کے پاس لیکر چلو، میں خود مسئلہ معلوم کروں گی ـــــ اور فوراً امام صاحبؒ اپنی محترم ماں کو خچر پر سوار کراتے لگام ہاتھ میں لیکر پیادہ پا ساتھ ساتھ دوڑتے اور ماں کی تسلی کرا کے ان کے دل و روح کو سکون ہوتا تھا۔

دوسروں کے لئے رقت قلب کا تو یہ عالم تھا کہ کسی کی تکلیف دیکھتا تو کیسا سکون سے بھی نہ ملکتے تھے۔ ایک دفعہ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ کسی نے خبر سنادی کہ فلاں شخص کوٹھے پر سے نیچے گر پڑا۔ امام صاحب رح کے دل پر بجلی سی گری اور وہ دہشت اور درد سے چیخ اٹھے کہ مسجد میں تہلکہ پڑ گیا۔ حلقہ درس چھوڑ چھاڑ کر ننگے پاؤں اس شخص کے گھر دوڑے ہوئے آئے اور بہت کچھ دلاسہ دیکر واپس ہوئے اور جب تک وہ شفا یاب نہ ہو گیا امام صاحب رح نے اسکی عیادت کو ناغہ نہ ہونے دیا۔

دوسری طرف خود اپنے لئے اس قدر مستقل مزاج اور خطرے میں حد تک جری تھے کہ مسجد میں درس دے رہے تھے اور ایک سیاہ سانپ چھت سے گر کر امام رح کی گود میں آ پڑا۔ تمام لوگ بے اختیار گھبرا کر بھاگے اور امام صاحب رح؟ ---- وہ تو اطمنان سے ویسے ہی بیٹھے ہوئے تھے!

"امام صاحب!" ایک بار کسی نے حیرت کا اظہار کیا "لوگ آپ کی شان میں کیا کچھ نہیں کہتے مگر آپ ہیں کہ آپ کی زبان سے کبھی کسی کی برائی سننے کو کان ترستے ہیں!"

"ہاں بھائی!" امام صاحب نے سکون اور احساس نعمت کا ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا "یہ خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔"

امام سفیان ثوری رح کے سامنے ایک بار ذکر آیا کہ ابو حنیفہ رح کی

زبان سے کبھی کسی کی غیبت نہیں سُنی گئی۔ امام ثوری رح نے کہا: "ابو حنیفہ رح ایسے بے وقوف نہیں کہ اپنے اعمال صالحہ کو برباد کرتے پھریں۔"

انسانوں کے درمیان جس شخص کی شرافت و پاکبازی کا یہ عالم تھا وہ جب خدا کے سامنے جاتا تھا تو اس کا عالم دیدنی ہوتا۔ نماز میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے کرتے ان کی آواز کانپ اٹھتی، گریہ طاری ہوتا اور پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتے تھے۔ ابراہیم بصری رح نے دیکھا کہ نمازِ فجر میں امام صاحب رح نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ "خدا کو ظلم کرنے والوں کی چال سے بے خبر نہ سمجھ لینا" امام صاحب رح پر خشیت کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ کھڑے کھڑے پورے جسم پر لرزہ پڑ گیا اور ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ دوسرے شخص زائدہ کا کہنا ہے کہ میں ایک بار نماز عشاء میں امام صاحب رح کے ساتھ شریک ہوا اور منتظر بیٹھا رہا کہ وہ نوافل سے فارغ ہوں تو فلاں مسئلہ دریافت کروں۔ مگر امام صاحب رح قرآن پڑھتے پڑھتے وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ کے ٹکڑے پر پہنچے تو جیسے اس آیت کی زہرہ گدازیوں نے ان کو خوفِ عذاب سے بیقرار کر دیا۔ رات بھر وہ یہی آیت پڑھتے رہے اور روتے رہے ــــ یہاں تک کہ سپیدہ سحر نمودار ہو گیا۔

مشہور ہم عصر عابد یزید بن کمیت نے کہا کہ ایک بار نماز عشاء میں امام صاحب رح نے "اِذَا زُلْزِلَت" پڑھی لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے۔ میں ٹھیرا رہا۔ دیکھا کہ امام ابو حنیفہ رح سر جھکائے استغراق میں

بیٹھے ہیں اور رہ رہ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے کی آواز ان کے سینے سے نکلتی ہے اور ڈوب جاتی ہے۔ ان کی اس غمناک کیفیت میں خلل انداز ہونے کے بجائے میں چپکے سے اُٹھ کر چلا آیا۔ صبح کی نماز کو پہنچا تو دیکھا کہ امام صاحب رح اسی عالم میں اسی جگہ بیٹھے ہیں اور داڑھی ہاتھ میں ہے اور سسکیاں بھرتے ہوئے خدا سے کہہ رہے ہیں" اے وہ جو ذرّہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی کا بدلہ دے گا اپنے غلام نعمان کو آگ سے بچائیو۔ آگ سے بچائیو!"

ایک دن بازار میں چلے جا رہے تھے کہ کسی لڑکے کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا وہ چیخ اٹھا اور کہا:

"تو خدا سے نہیں ڈرتا؟"

یہ سنتے ہی امام صاحب رح سڑک پر غش کھا کر گر پڑے — ہوش آنے پر جب پوچھا گیا کہ ایک لڑکے کی بات پر اس قدر متاثر ہونے کی کیا ضرورت تھی تو فرمایا "کیا عجب کہ اس کی زبان سے غیبی آواز نے مجھے تنبیہ کی ہو!"

ایک دفعہ کسی کو مسئلہ بتا رہے تھے کہ وہ شخص کہہ اُٹھا:

"ابو حنیفہ رح! خدا سے ڈر کر فتویٰ دیا کرو" یہ الفاظ سنتے ہی امام صاحب رح خوف و خشیّت سے پیلے پڑ گئے۔ تھرتھراتی ہوئی آواز میں فرمایا "بھائی خدا تمہارا بھلا کرے اگر مجھ کو یہ یقین نہ ہوتا کہ خدا مجھ سے مواخذہ کرے گا کہ تو نے جان بوجھ کر علم کو کیوں چھپایا تو میں ہرگز زبان نہ کھولتا!"

مشہور بزرگ حضرت فضیل بن عیاض رضؓ نے جب یہ سُنا کہ امام صاحب رحؒ کو اگر کسی مسئلہ میں ذرا دشواری پیش آتی تو یہ سوچ کر رونے لگتے کہ ضرور کسی گناہ کی شامت میں پکڑ ہو گئی ہے فوراً وضو کرتے ۔۔۔ خدا کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے اور رو رو کر توبہ کرتے تھے یہ معلوم کر کے حضرت فضیلؒ پکار اُٹھے کہ :۔ " ابو حنیفہ کے گناہ بہت کم تھے اس لئے ان کو یہ خیال دامنگیر ہوتا تھا جو لوگ گناہوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں ان پر ہزار آفتیں آتی ہیں اور مطلق احساس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی غیبی تنبیہ بھی ہو سکتی ہے

ہاں یہ اسی بندۂ مومن ہی کا تو واقعہ ہے کہ ایک دن ان کے ملازم نے دوکان کھولی اور بطور فال نیک کے یہ کہدیا :۔ " خدا ہمیں جنت دے " امام صاحب نے یہ الفاظ سُنے اور خشوع بندگی کی شدت سے آب دیدہ ہو گئے ۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی ۔ دوکان پر بیٹھنا دوبھر ہو گیا ۔ دوکان بند کرائی اور کسی جنگل کی طرف روتے ہوئے نکل گئے واپس آئے اور قدرے سکون ہوا تو ملازم سے کہا ہم اس قابل کہاں ہیں کہ ایسی بڑی بات منہ سے نکالیں ۔۔۔ ارے ہماری جان عذاب سے ہی بچ جائے تو بڑی خیریت ہو گی ۔ یہ کہہ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد دلایا جو فرمایا کرتے تھے کہ اگر حساب برابر سرابر بھی ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ سستا چھوٹا ۔

ایسے ہوتے تھے وہ لوگ جو " مسلمان " کہلائے ۔۔۔ اور ایک ہم بھی ہیں ۔ خدا کے حسین آستانے سے بھاگ بھاگ کر ذلیل ہوا

کے قدموں پر ناک رگڑنے والے ہیں — اور ہم مسلمان ہیں! ہائے یہ احسان عظیم کہ خدا نے ہمیں مسلمان پیدا کیا — اور ہائے یہ جانگداز مسئلہ کہ ابھی ہمیں مسلمان بھی بننا باقی ہے — لیکن ..... بس ......

وائے بر حال ما !!

تجمل فروری ۶۳ء

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات

امام شافعیؒ، جن کا نام محمد اور کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ — نہ صرف ایک صحابی زادے تھے بلکہ ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون ساتویں پشت میں اُس ہاشمی قبیلے اور عبد المطلبی خانوادے سے جا ملتا تھا جس کے آغوشِ مادری کو دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مقدس انسان محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ کا شرفِ عظیم حاصل ہوا تھا۔

لیکن بعد کے امام شافعیؒ اور بچپن کے ابو عبد اللہ نے اللہ کے اس انعام پر غرور بیجا کا علم بلند کرنے کے عوض بس یہ سوچا کہ میرے مولا نے مجھ پر جو عظیم احسان فرمایا ہے اس کا شکرِ نعمت آخر میں کس طرح ادا کروں — میں کیسے ثابت کروں کہ خالقِ اکبر کے احسان تلے دبا ہوا بندہ ابو عبد اللہ ناشکرا نہیں ہے۔ یہ سوچ یہ احساس لطیف یقیناً ایک غیر شعوری گونج تھی اُس آواز کی جو حجۃ الوداع کی تاریخی بلندیوں پر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں سے بلند ہوئی تو خون اور نسل کی بنیادوں پر اُٹھے ہوئے محلوں کو ڈھاتی اور جغرافیائی پہاڑوں کو مسمار کرتی ہوئی دلوں کی گہرائیوں میں ہمیشہ کیلئے جذب ہو گئی۔

"کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل نہیں اور نہ ہی کسی

عجمی کو کسی عربی پر ــــ سب آدم کی اولاد ہیں اور
آدم مٹی سے بنائے گئے تھے ــــ خدا کی نظر میں
سب سے زیادہ اچھا وہ ہے جو خدا سے سب سے
زیادہ ڈرتا ہو"

اخلاق کو انسان کا سب سے وزنی عمل اور تقوے کو انسانیت کا معیار شرف قرار دینے والی یہی وہ حقیقت افروز پکار تھی جس نے حضرت امام شافعیؒ کو اسلاف کی ہڈیوں کا کاروبار کہ نیکی بجائے خدا کے ساتھ اس تجارت کا شوق اور سلیقہ سکھایا جو دردناک عذاب سے نجات کی طرف لے جاتی ہے ــــ جہاں کائنات کا فیاض ترین خریدار خود خدائے یگانہ ہوتا ہے جو انسان کے فانی جسم و جاں ــــ خود اپنے ہی دئیے ہوئے جسم و جاں کی اعلیٰ ترین قیمت لگاتا ہے ــــ یہاں تو مٹھی بھر مٹی کے اس ڈھیر کے وہ نصیب جاگتے ہیں کہ رنگ و نور کی ایک سدا بہار جنت عطا کرنے کے بعد خدا اپنے حقیر بندوں کو تسلی دیتا ہے کہ درحقیقت تیرا آخری انعام تو ہم خود ہیں! ــــ

زندگی کا یہی وہ انتہائی درخشاں تصور تھا جس کی روشنی شعور کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی امامؒ کے ذہنی افق پر جھلملا رہی تھی، انھوں نے سات سال کی معصوم عمر میں خدا کی آخری کتاب اپنے سینے میں اتار لی ــــ اور ابھی دس ہی سال کے بچے تھے کہ اس چھوٹے سے حافظ قرآن نے امام مالکؒ کا شاہکار فقہ "موطا" حفظ کر ڈالا ــــ گویا ایک بچہ جس عمر میں ابھر کے

کھلونوں اور مٹی کے گھروندوں سے کچھ ہی آگے بڑھ جاتا ہے یہ مضافات مدینہ کی ایک بیوہ کا لال قرآن و سنت کے نورانی سمندر میں غوطہ زنی کا وہ کارنامہ انجام دینے چلا تھا جس کا حسین خواب دیکھتے دیکھتے کتنے ہی بڑے بوڑھے قبروں میں جا سوئے اور جانے کتنے ہی ایسے بدنصیب ہیں جن کی نظر بھی ادھر نہ گئی اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند ہو گئیں!...... اور کیسی ہوگی وہ بہترین "ماں" جس کا سہاگ لٹ جانے کا زخم ابھی شدت سے رس رہا تھا مگر اس نے اپنے اس "دریتیم" کو دکھتے ہوئے سینے سے لگا کر یہ خواب دیکھنا شروع کیا کہ اس کا یہ بیٹا ایک عالم دین بنے اور پل صراط پر کام آئے۔ یہی وہ ایمان افروز خوابوں کی وادی تھی جہاں ننھے سے امام شافعیؒ نے دو ایسے قیمتی خواب دیکھے جن کی تعبیر تلاش کرنے کی والہانہ دھن میں انھوں نے زندگی کے ۵۴ سال اور عیش و نشاط کی پوری دنیا تج ڈالی اور آخر خود اپنے آپ کو ان خوابوں کی لافانی تعبیر بنا کر آخری سانس لیا۔ پہلے خواب میں اُنھیں اُسی ہستیؐ کی پہلی بار زیارت ہوئی جس کو کھلی آنکھوں ایک نظر دیکھ لینے پر ہزاروں سال کی عبادتیں قربان!......

ہائے وہ رات!!

جس کی تنہائیوں میں چھوٹے سے امام شافعیؒ نے وہ "سورج" نکلتا دیکھا جس کی چند کرنیں ان کے اپنے وجود کو چھو گئی تھیں تو انھیں لازوال ستارہ بنا دیا تھا اور پھر صحابی کے پوتے اور صحابی کے ہی اس بیٹے نے ایک ایسی مدبھری آواز سنی جس کو کانوں نے پہلے دن

سکتا تھا۔ آواز آ رہی تھی یا کوئی پھولوں کے نازک ہونٹوں سے روح و دل کو لوریاں دے رہا تھا:۔

"اے بچے! ـــ تو کس خاندان سے ہے؟ ـــ

"حضورؐ!" احساس عجز اور تحدیث نعمت کے شدید سے اس بچے کی آواز دو آتشہ ہو گئی "حضورؐ! میں آپ ہی کے خاندان سے تو ہوں ......"

اور پھر مستقبل کے اس امام نے وجد کے عالم میں دیکھا کہ حضورؐ ان کو اپنے قریب سے قریب تر فرما رہے ہیں اور ان کی زبان اور ہونٹوں پر وہ لعاب دہن ڈال رہے ہیں جس کو خدا نے اس دنیا میں "امرت" سے قیمتی اور شاید آخرت میں "جام کوثر" بنا دیا ہے ـــ کوئی اس آب حیات کی قیمت اصحاب رسولؐ کے دل سے پوچھے یا اُن غیر مسلم سلطنتوں کے شاہی نمائندوں سے جن کی آنکھوں نے جذب و جنون کا یہ تحیر انگیز منظر دیکھا تھا کہ محمدؐ کا یہی "لعاب دہن" ابھی زمین پر گرنے نہ پاتا کہ محمدؐ اور ان کی عظمت و صداقت کے سیکڑوں دیوانے بھکاریوں کی طرح دامن پھیلائے ہوئے بیقرار پروانوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ـــ اس امرت کو آنکھوں اور چہرے پہ ملنے کے لئے طلب و شوق میں کیسی کیسی لڑائی ہوتی جیسے بھکاریوں کی فوج پر کسی شہنشاہ نے سونے چاندی کی بارش کر دی ہو ـــ یا اس لعاب دہن کی جاں نوازیاں کوئی صدیق اکبرؓ کے ان ماڑ گزیدہ پاؤں سے پوچھے جس کو غار ثور کے ناگ نے جی بھر کے ڈسا تھا مگر

محمدؐ کا لعاب دہن ٹپکتے ہی زہر قاتل کا ہر ایک درد کافور ہو گیا اور فرط درد سے رو دینے والا بے اختیار مسکرا دیا۔

—— اور آج امام شافعیؒ خواب کی تاریکیوں میں اسی "آب حیواں" کا جام پی رہے تھے اور پھر امام کی روح کو کیف و سرور کے عالم میں چھوڑ کر یہ خواب ختم ہونے لگا تو امام نے سنا کہ حضورؐ ان کو یہ دعا دیتے ہوئے پس منظر میں چھپتے جا رہے ہیں۔

"بچا —— خدا تجھ پر برکتیں نازل فرمائے ......"

ابھی اس خواب حسین کی حیات انگیز یاد بالکل تازہ ہی تھی کہ دوسری بار حضرت امامؒ نے حضورؐ کو خواب میں دیکھا۔ یہ خواب ان کو اس مقدس ترین فضا میں لے اڑا تھا جہاں خانہ کعبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ خدا کے قدموں پر سے سر اٹھایا تو خدا کے بندوں کی طرف ایمان افروز نظر ڈالی اور دیر تک فانی انسانوں کو بقا و دوام کے راز سمجھاتے رہے۔ درس کا یہ پرکیف سلسلہ ختم ہوا تو حضرت امامؒ کے سینے میں علم دین کی ایک زبردست پیاس بھڑک اٹھی —— وہ لرزیدہ قدموں کے ساتھ آگے بڑھے اور عرض کیا

"اے خدا کے رسولؐ! —— مجھے بھی کچھ سکھائیے ......!"

—— پھر اسی ہستی کی ایک نگاہ خاص ان کی طرف اٹھی اور آستین مبارک میں سے ایک "میزان" نکال کر بطور خاص عطا فرماتے ہوئے کہا:۔

"تیرے لئے یہ میرا عطیہ ہے!"

اگلے دن جب امام شافعیؒ اس خواب کی تعبیر ماہرین رویا سے پوچھتے پھر رہے تھے تو بڑے یقین و اذعان کے ساتھ ایک مرد کامل نے انھیں یہ تعبیر سنا کر فرط خوشی اور زبردست ذمہ داری کے احساس سے چونکا دیا کہ :-

دنیا میں سنتِ رسول ﷺ کی نشر و اشاعت کا عظیم شرف تمہارے حصے میں آنے والا ہے

کوئی ان دو بمراسرار خوابوں کے متعلق جو رائے چاہے قائم کرے مگر ان کی تعبیر کے سلسلہ میں تاریخ کی ایک ہی رائے ہے کہ یہ محمد ابن ادریسؒ سچ مچ فقہ کے "امام شافعیؒ" کہلائے۔

مکے میں پہلے تو عربوں کے دستور کے مطابق ان کی ہوشمند ماں نے انھیں "حسب و نسب کا علم" حاصل کرنے بھیجا ــــ اس کی تحصیل کے فوراً ہی بعد ماں کی بہترین مامتا نے حکم دیا کہ "جاؤ اب علم دین کی خوشہ چینی کرو" ـــــ چنانچہ حضرت امامؒ نے مکے کے شہرہ آفاق مفتیوں کی مجلس میں زانوئے ادب تہ کیا ـــــ بچپن اور لڑکپن کے زمانے ہی سے عالموں کی باتوں کو ہڈیوں پر لکھ لکھ کر ہیرے جواہرات کی طرح محفوظ رکھنے والا ان عظیم علمی مجلسوں میں پہنچا تو دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے۔

مکے کے بڑے ہی جوہر شناس فقیہ مسلم بن خالد زنجیؒ نے پہلی ہی نظر میں امام شافعیؒ کے جوہر پرکھ لئے تھے ــــ چنانچہ مسلسل تین سال تک اس زرخیز مٹی پر علمی فیوض کی بارش کرنے

کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ امام مالک رح کی مجلس اسے مل گئی تو اس قیمتی جوہر کو کندن بنا دے گی۔ ادہر خود امام شافعیؒ امام مالک رح کے لئے بے چین تھے۔ اُستاد کی زبان سے ان کے کمالات کے تذکرے سن سنکر انھیں امام صاحب کی ذات سے غائبانہ عقیدت ہو چکی تھی۔ استاد کا حکم پاتے ہی وہ مدینے کی طرف چلے تو چاہنے والے استاد نے ایک غیر معمولی سفارشی خط بھی ساتھ کر دیا

شوق کی فراوانیوں میں انھوں نے ڈرتے ڈرتے حضرت امامؒ کے دروازے پر دستک دی :۔

" آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں ؟ " ایک مہذب خادمہ نے دروازے پر آکر پوچھا اور نام وغیرہ معلوم کر کے گھر میں واپس چلی گئی۔ اس کے جواب میں امام مالک رح باہر تشریف لائے ان کی بزرگانہ شفقت اور حسن اخلاق کی سنجیدہ اداؤں نے امام شافعیؒ کے دل پر بلا کا اثر کیا۔ اب انھوں نے وہ تعارفی خط نکالا جس میں استاد نے اپنے شاگرد رشید کی صلاحیتوں کا بڑی اہمیت سے ذکر کر کے لکھا تھا کہ :۔

" یہ آپ کی علمی برکات سے مستفید ہونے کا واقعی مستحق ہے "

مگر یہ دیکھ کر امام شافعی رح چکرائے اور سہم گئے کہ یہ خط پڑھتے پڑھتے امام مالکؒ کے چہرے پر خوشی اور قدر شناسی کے بجائے غم وغصہ اور روحانی کبیدگی کے دردناک آثار نماہر ہو رہے ہیں خط ختم کرتے کرتے ان کے جذبات کی یہ کیفیت ہو گئی کہ یہ خط زمین

پر پھینک دیا اور درویشی کی شدید کیفیت میں رو دینے کے انداز سے فرمایا:۔

"اللہ اللہ! کیا...... اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس قابل ہوگیا ہے کہ اسے سفارشوں کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔

پہلے ہی قدم پر اس طرح امام مالکؒ کی بارگاہ میں پہنچکر امام شافعیؒ نے علم دین کے آخری آداب سیکھے۔ موقع کی اس نزاکت کو سنبھالنے کے لئے اپنی بینوائی اور علمی تڑپ کا اظہار کر کے اتنے حسین انداز میں معذرت چاہی کہ امام مالکؒ اپنے غم و غصہ کو بھول گئے اور قدر شناسی کی بے لوث تڑپ کے ساتھ ان پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا:۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"محمد بن ادریس!" امام شافعیؒ نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

ایک لمحہ کے لئے دونوں طرف گہری خاموشی چھاگئی اور پھر حضرت امام کی یہ دلنشین آواز سنائی دی جو زندگی کا پہلا بنیادی درس بھی تھی اور کامیابی کی آخری دعا بھی۔

"اتق اللہ! ـــ فسیکون لک شان ـــ خدا سے ڈرتے رہنا! ـــ تاکہ عنقریب تمہیں خاص درجہ عطا ہو"

علم دین کے احترام کے لئے اُستاد کی بھی وہ ذکاوت حس تھی جس نے امام شافعیؒ کو کتاب و سنّت کے سامنے

سراپا ادب و نیاز بنا چھوڑا تھا - حد یہ ہے کہ درس کے دوران میں وہ کتابوں کے ورق الٹتے تو اس کا پورا خیال رکھتے کہ ان کی ہلکی سے ہلکی سرسراہٹ بھی اس گہری خاموشی میں خلل انداز نہ ہونے پائے - آخر " با ادب - بانصیب " ہونے کی وہ منزل بہت جلد آگئی جہاں امام مالک رحہ جیسے محتاط فقیہہ نے شاگرد کو افتاء کا کلیدی مقام عطا کر دیا

واقعہ یوں پیش آیا ـــــ

امام مالک رحہ کے حلقۂ درس میں کسی نے آکر یہ مسئلہ پیش کیا کہ :-

" میں قمریوں کا تاجر ہوں ـــــ ایک شخص کے ہاتھ ایک قمری فروخت کی اور یہ بھی کہا کہ قمری خوب بولتی ہے " تھوڑی دیر بعد وہ خریدار واپس آیا اور شکایت کی کہ قمری نہیں بولتی ـــــ بات گرما گرم بحث و مباحثہ تک پہنچ گئی اور جوش کے عالم میں میرے منہ سے یہ نکل گیا " میری قمری کبھی خاموش نہیں رہتی اگر رہے تو میری بیوی کو طلاق ہے ـــ "

تمام اہل مجلس نے یہ واقعہ گہری دلچسپی اور قلبی تشویش کے ساتھ سنا - یہاں تک کہنے کے بعد اس نے بیچارگی کے دکھ بھرے انداز میں امام سے پوچھا :-

" فرمائیے میری بیوی کو طلاق تو نہیں ہو گئی .....؟ "

" تمہاری بیوی کو طلاق ہو گئی " امام صاحب رحہ نے سائل کو یہ دردناک خبر سنائی اور پھر افسوس کے ساتھ سر جھکا لیا - تمام مجلس پر سناٹا چھا گیا - یہ صورت حال دیکھ کر سائل کا منہ ذرا سا نکل

آیا اور وہ کفِ افسوس ملتا ہوا واپس ہو گیا

امام شافعی رح بھی شریک درس تھے — مسئلہ اور اس کا جواب سننے کے بعد ان کے ذہن میں ایک خلش باقی رہ گئی تھی وہ استاد کے علم اور ان کی عقل و رائے پر بے حد اعتماد کرتے تھے انھیں استاد کے فقہی فیصلے کا احترام بھی آخری حد تک تھا۔ لیکن اس احترام اور اعتماد کی جڑیں شخصیت پرستی میں نہیں حقیقت شناسی اور اصول پسندی میں تھیں۔

یہ خالص علمی و دینی تقاضوں کا وہ عظیم دور تھا جب شریعت کے مسائل زر و پیسے کی روشنائی سے نہیں خونِ دل و جگر سے تحریر کئے جاتے تھے۔ جب مفتی کی نظریں دار الافتاء کی مسند پر بیٹھنا ایسا ہی نازک کام تھا جیسا خدا کے آگے جائے نماز پر دست بستہ کھڑا ہونا — جب شخصیت پرستی کی آنکھیں اندھی نہیں ہو چکی تھیں بلکہ دیدہ و دل کی روشنی میں اصول و حقائق کا جائزہ لیا جاتا تھا چنانچہ استاد کے جواب سے امام شافعیؒ کی تسلی نہ ہوئی تو علم دین کے آداب نے انھیں اطمینان سے بیٹھے رہنے کا مشورہ نہیں دیا وہ بےچینی کے ساتھ چپکے سے اٹھے اور جانے والے سائل کو کچھ دور پر جا لیا تو آہستہ سے سوال کیا:۔

تمہاری قمری کا صحیح حال کیا ہے؟ — یعنی وہ اکثر بولتی ہے یا بیشتر چپ رہتی ہے؟"

دل شکستہ اور مایوس شخص نے ایک نوجوان عالم کی یہ بات سنی اور امام مالک رح کے فتوے کے بعد اس نوجوان کو کوئی اہمیت دیئے

بغیر روا روی میں جواب دیا :۔

" وہ اکثر بولتی ہے ــــ ہاں کبھی کبھی چپ بھی رہتی ہے ۔"

" پھر تو مطمئن رہو " امام شافعیؒ کا چہرہ خوشی سے کھل گیا " تمہاری بیوی کو طلاق نہیں ہوئی ــ "

" اچھا ! " سائل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ــ لیکن امام شافعیؒ اس کے بعد ایک منٹ کے لئے رُکے بغیر پھر اسی جگہ درس میں آکر بیٹھ گئے ۔ وہ شخص کشاں کشاں ان کے پیچھے آیا اور امام مالکؒ کے پاس آکر تشویش اور امید کے انداز میں عرض کیا :۔

جناب والا ! ــ میرے معاملے پر پھر سے غور فرمائیے ۔"

امام مالکؒ اس کی واپسی کا کوئی خاص مطلب اس کے سوا نہ سمجھے کہ یہ ذہنی پریشانی میں اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے اس لئے اس کی اس خلل اندازی پر خفا ہونے کے بجائے پوری پوری دردمندانہ توجہ کی گئی اور مسئلے کا وہی جواب دُہرا دیا گیا۔

" لیکن حضرت ! " سائل نے حیرت اور دبی دبی شکایت کے انداز میں امام شافعیؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " یہ نوجوان شخص جو آپ کے درس میں شریک ہے ابھی ابھی میرے پیچھے آیا تھا اور مجھ سے پوچھا تھا کہ میری قمری اکثر بولتی ہے یا اکثر چپ رہتی ہے اور پھر میرا جواب سُنکر اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی ...... "

شاگرد کی اس قطعاً غیر متوقع جرأت کو سُنا تو امام مالکؒ چونک اٹھے ــ قمری کے بولنے کے سلسلے میں یہ قلت وکثرت کا

نکتہ سمجھ میں نہ آیا تو علم دین کے سلسلہ میں ان کی مخصوص نازک مزاجی کو ٹھیس لگی اور کسی قدر برہمی کے ساتھ فرمایا :۔

"آخر اس میں یہ کثرت و قلت کی کیا بحث ہے ..... ؟"

ذہین اور انتہائی حساس شاگرد نے موقعے کی نزاکت محسوس کی اور فوراً ایسا جواب عرض کیا کہ سچی بات کہدی گئی اور اُستاد کی قدر و منزلت میں بھی ذرا فرق نہ آنے دیا ـــ عرض کیا :۔

"آنجناب ہی نے مجھے عبداللہ بن زیاد کے حوالے سے یہ روایت تلقین فرمائی تھی کہ فاطمہ بنت قیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ معاویہؓ اور ابو جہم نے مجھے شادی کا پیام بھیجا ہے۔ فرمائیے کس کا انتخاب کروں ؟ ـــ حضورؐ نے فرمایا کہ معاویہؓ تنگ دست ہے اور ابو جہم کبھی کاندھے سے لکڑی نہیں اتارتا ـــ" حالانکہ حضورؐ جانتے تھے کہ ابو جہم سوتا بھی ہے اور دیگر ضرورتوں میں بھی مصروف ہوتا ہے۔ بس اسی کی روشنی میں میں نے یہ فتویٰ دیا کہ چونکہ قمری اکثر بولتی ہے اس لئے نہ غلط بیانی ہوئی اور نہ طلاق واقع ہوئی ۔"

مسند امامت پر بیٹھے ہوئے امام مالکؒ ایک شاگرد کے اس حق کو شاہ تفقہ پر خوشی اور فخر سے جھوم اُٹھے ـــ احقاقِ حق کا خیر مقدم کرنے کے لئے وہ کس خوشی سے شاگرد کے سامنے بھری محفل میں ہتھیار ڈال رہے تھے ـــ

"ہاں بھائی" انھوں نے سائل کی طرف رخ کیا "ہاں بھائی! جاؤ طلاق نہیں ہوئی۔ شافعیؒ کا استدلال صحیح ہے ۔"

شاگردِ رشید کی حق کوشی اور دقیقہ سنجی کی اتنی ہی پذیرائی پر بس نہ کیا بلکہ اعلان فرما دیا کہ آئندہ بھی اس شخص کو افتاء کی مخصوص اجازت دی گئی۔

تفقہ اور افتاء کی اس منزل پر پہنچ کر اب امام شافعی رح چین سے نہیں بیٹھ گئے۔ ان کی نظر میں ایک مؤمن کی شخصیت محض قرطاس و قلم تک محدود نہ تھی، بلکہ قلم اور تلوار دونوں کا یہ مجاہد مختلف علوم اور زندگی کی مختلف راہوں کا امام ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف تیراندازی سیکھی تو دوسری طرف لغت، تاریخ، نحو و عروض اور علم فراست وغیرہ میں دستگاہ کامل حاصل کی۔ وہ جس طرح باکمال علماء کے قلم کی حرکت پر وجد کرتے تھے ٹھیک اسی طرح ایک تیرانداز کا کمال تیر افگنی ان کی مجاہدانہ عقیدتوں کو بیدار کر دیتا تھا۔ چنانچہ ایک بار وہ کہیں جا رہے تھے تو اثنائے راہ میں کسی کو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہا ہے۔ اچانک اس کا تیر ٹھیک ٹھیک نشانے پر لگا تو امام شافعیؒ جھوم اٹھے — بے اختیار جیب میں ہاتھ ڈالا مگر وہاں صرف تین دینار پائے۔ لجاجت اور عقیدت سے لبریز آواز میں فرمایا:۔

"یہ تین دینار انعام میں دیتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے — مگر کیا کروں اس وقت میرے پاس اور کچھ ہے نہیں ۔ ۔ ۔"

علم و فراست جیسے خالص عقلی علم کو انھوں نے خالص مومنانہ نقطۂ نظر سے سیکھا تو سچ مچ اس حدیث رسولؐ کا مصداق بن گئے۔

"مومن کی فراست سے بچو! ــ وہ خدا کی روشنی میں دیکھتا ہے!!"

اس ذیل میں متعدد حیران کن واقعات میں ایک یہی واقعہ ایسا ہے جس سے اس علم میں ان کی دستگاہ کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

امام بیہقی مزنیؒ کے ذریعہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ میں جامع مسجد میں امام شافعیؒ کے ساتھ تھا ناگاہ ایک شخص آیا اور سوتے ہوئے آدمیوں میں کسی کو تلاش کرنے لگا۔ امام شافعیؒ نے بیک نظر سمجھ لیا کہ ڈھونڈنے والا کسی ایسے حبشی غلام کو ڈھونڈ رہا ہے جس کی آنکھ میں کوئی نقص ہے چنانچہ شخص مذکور نے اس بات کی حرف بحرف تصدیق کی۔ اس کے بعد امام شافعیؒ نے حیرت انگیز انکشاف کیا کہ "جس کی تمہیں تلاش ہے وہ قید خانے میں ہے"۔ اور واقعی وہ قید خانے میں ملا۔ بعد میں امام صاحبؒ نے بتایا:۔

اس کے اس طرح ڈھونڈنے کے انداز سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی مفرور کی تلاش میں ہے ــ جب وہ مسجد کے اس حصے میں گیا جہاں سیاہ فام سو رہے تھے اور میں نے پھر غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ بائیں آنکھ والوں پر وہ گہری نظر ڈال رہا ہے ــ چنانچہ میں نے نتیجہ نکالا کہ اس کا کوئی آنکھ کا عیبی حبشی غلام بھاگ گیا ہے اور میرا تجربہ ہے کہ غلام جب بھوکا ہوتا ہے تو چوری کرتا ہے اور پیٹ بھرا ہوتا ہے تو زنا کرتا ہے ــ میں نے سوچا کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک نہ ایک بات ضرور ہوگی اور اس کے نتیجے میں غلام قید ہوگیا ہوگا"

——— علم ہئیت و نجوم میں اس بلا کا درک ہو چکا تھا کہ کسی دوست کا زائچہ دیکھکر پیشین گوئی کی :۔

"۲۷ دن کے بعد تمہارے یہاں ایک بچہ پیدا ہوگا، جس کی بائیں ران میں سیاہ تل ہوگا ——— ۲۴ گھنٹہ زندہ رہ کر دفعتاً مرجائے گا

چنانچہ لفظ بہ لفظ پیشین گوئی پوری ہوئی تو اپنے کمال پر خوش ہونے کے بجائے اسی دن علم نجوم کی ساری کتابیں جلا ڈالیں اور آئندہ کسی کے سوال کا جواب نہ دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے دینی عقائد میں فساد رونما ہو جائے تو دنیا میں یہ تعریفوں کی بھرمار تو کل "حشر کے دن وبال جان بنکر سامنے آئے! ——— اس ایک دن" کے خوف سے جس کا نام "قیامت" ہے سالہا سال کی عرق ریز کاوشوں کو اپنے ہاتھ سے سوختت کر دینا خدا کی قسم ایک سچے مومن کی سوا کسی کے بس کا کام ہی نہیں

اس دنیا کی ہر چیز کی طرح شہرت و قابلیت بھی ایک نازک آزمائش ہے۔ جب حکومت نے امام شافعیؒ کا شہرہ سنا اور قدر افزائی کے طور پر انھیں نجران کا والی بنا دیا گیا تو وہاں جا کر حضرت امامؒ نے دیکھا کہ مقدمات کے فیصلے رشوت سے ہو رہے ہیں۔ امام صاحب نے جاتے ہی اس فتنے پر بند لگائے اور حق پسندی کے آزاد فیصلوں سے رشوت ستانوں کی کمر توڑ دی۔ نتیجہ اسی قدر شناسی کی شکل میں نکلا جو اس دنیا نے دی

کا خاصہ ہے۔ امام صاحب رح کے خلاف ناپاک سازشیں شروع ہوئیں اور حکومت کے مرکزی ایوان میں جاکر یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ امام صاحب رح یمن والوں میں بے حد مقبول ہیں اور اسی مقبولیت سے فائدہ اٹھاکر حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتے ہیں!۔

بس پھر کیا تھا۔ اقتدار و حکومت کی نازک مزاجی شعلہ جوالہ بن کر اٹھی اور پابجولاں کرکے حضرت امام قتل کے لئے لائے گئے۔ لیکن ٹھیک اس وقت جب جلاد کی بیرحم تلوار سر پر سرنوشتی ہوئی مقتولین کی صف میں امام شافعی رح تک پہنچی تو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی زبردست علمی عظمتوں اور عقل و فراست کی مجاہدانہ صلاحیتوں نے حق کا اعلان اس شان سے کیا کہ جھوٹ اور سازش کے پرخچے فضا میں اڑتے نظر آئے اور ہارون رشید نے تڑپ کر یہ اعلان کیا تو عقیدت سے آواز کانپ رہی تھی:۔

"اس شخص کے قتل کا فیصلہ منسوخ!۔ صرف حراست میں ڈالدیا جائے اور بس....."

اور پھر اس حراست کے در و دیوار بھی امام شافعی رح کی عظمت علمی کی دوسری دھمک سے زمین پر آرہے!۔ انہوں نے دربار کے ایک زبردست علمی مباحثے پر ایسی وقیع رائے دی کہ ہارون رشید فرط عقیدت سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پکار اٹھا:۔

"اس ہستی کو آزاد کردو اور اسی وقت اس کے قدموں پر پانچ سو دینار لٹا دیئے جائیں....."

لیکن امام کے یہ علمی جوہر کھلنے کے بعد جب ہارون رشید

نے سلطنت کا عہدۂ قضا پیش کرنا چاہا تو وہی امام شافعیؒ جو سیاست
کو دینی زندگی کا حرام گوشت نہ سمجھتے تھے اور اسی لئے نجران کا والی
ہونا منظور فرمالیا تھا اور سیاست کی تلوار سے اصلاح وانقلاب کا وہی
کارنامہ انجام دیا تھا جس کے لئے ان کے علمی وجود کے زبان وقلم
وقف تھے ـــ عہدۂ قضا کا نام سُن کر تھرا گئے کہ شاہی تلواروں کے
سائے میں بیٹھکر اس مذہبی عہدے کا حق ادا کرنا جیتے جی ناممکن ہے اور نہ یہ
بات کسی طرح ممکن ہے کہ جینے کے لئے حق کو موت کی نیند سلا دیا جائے
ـــ چنانچہ اس عظیم پیش کش کی طرف لپکنے کے بجائے اُسے دُور ہی
دُور سے ٹھکراتے ہوئے بڑی نفرت وبیزاری کے ساتھ صاف
کہا:۔

"مجھے تو اس عہدے سے معاف ہی رکھیئے!"

دل تڑپ اُٹھتا ہے کہ کیا یہ اسی دنیا کا واقعہ ہے؟ ـــ جہاں
ہم پھٹی پھٹی آنکھوں سے آج یہ منظرِ خوں چکاں دیکھ رہے ہیں کہ سرکاری
امداد کی چند چھوٹی کوڑیاں اور سرکاری خطابات کے چند کھوکھلے
لفظ پاکر علماء اپنا علم بے تکلف بیچ ڈالتے ہیں اور سود خواروں کی ایک
لذیذ دعوت کھانے کے لئے زہّاد زہد وپارسائی کا خون کر ڈالتے
ہیں؟ ـــ سچ بتا اے تاریخ! کیا کبھی اس دنیا کے مومنوں
کو وہ عظیم وزرنگار "عہدہ قضا" بھی منظور نہ تھا جو حق کے خطرے
میں پڑجانے کا دور دراز اندیشہ یاد دلائے تو خوفِ آخرت
سے لرزتے ہوئے دل پر موت کا سا کرب طاری ہوجائے؟
پھر آخرت کے لئے دنیا کی قربانی کا یہ منظر ان امام شافعیؒ

کی زندگی پیش کر رہی تھی جن کی ابتدائی عمر کے سینے پر افلاس و ناداری کے گہرے گھرے زخم تھے۔ لیکن حصولِ کمال کی ایک طویل عمر جب خون پسینہ ایک کر چکی اور ایوانِ حکومت سے لے کر عوام و خواص کی گذرگاہوں تک اس شخصیت پر سونے چاندی کی بارش کی گئی تو دنیائے فانی کی اس سنہری گرد سے وہ فقر کا دامن جھاڑ کر اٹھا اور خدا کے قدموں میں گر کر دولتِ دل کے لئے رو پڑا :۔

میرے مالک !— اپنے خونِ جگر کی یہ قیمت مجھے منظور نہیں جو تیرے بندوں کے ہاتھ سے ملے میری مزدوری تو تیرے پاس ہے جو میں قیامت کے ہوشربا دن تیرے دستِ خاص سے چاہتا ہوں۔ میں اس دنیا میں جینے کا آرزومند نہیں جس کا آخری تحفہ موت ہے — موت !"

ایک بار ہارون رشید نے پچاس ہزار دینار بھیجے تو یہ مردِ مومن — امام شافعیؒ اس رقم سے غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کے آنسو پونچھتا ہوا ٹھنڈے چولھے روشن کراتا اور تاریک گھروں میں دیئے جلاتا اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھوں میں صرف دس ہزار دینار بچے رہ گئے تھے انفاق و خیرات کا یہ راز افشا ہوا اور رعایا اور رعیت دونوں نے اس کے جواب میں ہزاروں دینار اور بھیجے تو امام شافعیؒ نے اپنے اس درد بھرے جذبے پر رات کی تاریکی کے ہزاروں پردے گرا دیئے — جب نیند کے نرم و گرم بستر پر لیٹ کر دنیا والے آنکھیں بند کر کے پاؤں پھیلا کر گہری نیند کے مزے

لیتے" خدا۔ اکیلا تھا دیکھتا کہ اس کا یہ پرستار بےچین ہو کر اٹھا۔۔
دبے دبے پاؤں گھر سے نکلا اور بے نواؤں کی پکار سننے کے لئے
در در مارا پھرا اور جب دنیا کے غمزدوں پر دولت دنیا لٹا کر خالی
ہاتھ واپس ہوا تو رہ رہ کر اس کے بیقرار ہاتھ دعا کیلئے پھیلتے گئے۔
الٰہی ۔۔۔ مجھے حرص دنیا سے ہمیشہ محفوظ رکھنا۔"

"ایک بار عید کی رات تھی" امام مزنی" یہ پاکیزہ واقعہ
سناتے ہیں" میں امام صاحب" کے ساتھ مسجد سے گھر تک آیا۔
ایک دینی مسئلے پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی اور حضرت امام رح علم و
حکمت کے موتی سرراہ لٹاتے جا رہے تھے۔ دروازے پر
پہنچے تو وہاں ایک شخص کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے آگے بڑھ کر
سلام کیا اور عرض کیا:۔

"یہ تھیلی میرے آقا نے خدمت عالی میں نذر کی ہے۔"
امام صاحب رح نے شکریئے کے ساتھ یہ تھیلی قبول فرمائی۔
وہ شخص رخصت ہوا ہی تھا کہ ایک اور شخص گرتا پڑتا امام کیطرف
چلا آرہا تھا:۔

"امام صاحب! ....." نوواردنے ہانپتے کانپتے ہوئے
دکھڑا سنایا" گھر میں بچے کی ولادت ہوئی ہے اور میرے پاس
ایک پیسہ تک نہیں ....."

یہ سننا تھا کہ امام صاحب بیقرار ہو گئے۔ وہی تھیلی جوں
کی توں اس شخص کے ہاتھ میں دے دی اور مسکراتے ہوئے گھر میں
تشریف لے گئے۔"

ایسے ہی عید کی ایک رات کا واقعہ ہے۔

آسمان پر ہلال عید کو دیکھ کر نیک دل بیوی نے ٹھنڈے پڑے ہوئے چولھے کی طرف دیکھا اور بے قابو ہو گئیں

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا" انھوں نے آبدیدہ ہو کر امام صاحب سے عرض کیا "کہ کچھ رقم کہیں سے ادھار منگا لیجئے .....؟"

سفر آخرت کی ساتھی کو یوں دلگیر ہوتے ہوئے دیکھ امام صاحب پر بھی رقت سی طاری ہو گئی۔ ایک بیقرار نظران کے اداس چہرے پر ڈالی اور بھیگی ہوئی پلکوں نے کوئی خاموش پیغام دیا جیسے کہہ رہے ہوں:۔

تم روتی ہو؟ —— حالانکہ خوش ہونا چاہئے۔ بیشک یہ کانٹے ہیں جو آج دل و جگر میں چبھ رہے ہیں لیکن ..... خدا کی قسم اخدا کی جنت کانٹوں ہی سے تو ڈھکی ہوئی ہے ....."

پھر اُٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ستر دینار بطور قرض اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے واپس آ رہے تھے —— دل بیچین تھا کہ جس چہرے کو اُداس اور مغموم چھوڑ کر آئے ہیں اس چہرے کو خوشی سے مسکراتا ہوا بھی دیکھ لیں! —— لیکن راستے میں فقراء و مساکین اپنا اپنا درد سنانے کے لئے ہر طرف سے آ پہنچے تھے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کی پکار سُنی اور قرض لی ہوئی رقم کا بڑا حصہ بے نواؤں کی اشک شوئی میں صرف ہو گیا —— گھر میں پہنچے تو بیس دینا بچے تھے۔ ابھی وہ بیوی کے ہاتھ میں رکھنے نہ پائے تھے کہ ایک قریشی کی فریاد دروازے پر سُنائی دی۔ اُلٹے پاؤں واپس ہوئے۔ اس کا حال سنا اور یہ بیس کے

بیس دینار اس کے سامنے رکھتے ہوئے صرف اتنا کہا :-

بھائی ! — ان میں سے اپنی ضرورت بھر تم بھی لے لو.....“

اس نے بیس کے بیس دینار اُٹھاتے ہوئے کہا :-

” سچ کہتا ہوں اے امامؒ ! ابھی میری ضرورت پوری نہیں ہوئی، ابھی تو اور چاہئیں .....“

اور امام صاحبؒ نے ایک حرف منہ سے نہ نکالا — خاموشی سے جا کر بیوی کے سامنے خالی ہاتھ کھڑے رہ گئے۔

” آپ تو یہی کرتے رہتے ہیں ....“ بیوی کی آواز بھرا گئی — اور امام صاحبؒ اپنے اور بیوی کے غم کو سینے سے لگائے ہوئے خاموش کھڑے رہے — آزمائش کی یہ گھاٹی طے ہوئی تھی کہ خدا کی رحمت کو جوش آ گیا — ہارون رشید کے وزیر جعفر نے ہاتف غیبی کی آواز سے یہ واقعہ سُنا اور ایک ہزار دینار کی نذر لئے ہوئے صبح سویرے ہرکارہ آ پہنچا اور عرض کیا ” وزیرِ مملکت کا عاجزانہ اصرار ہے کہ یہ حقیر نذر قبول ہی فرما لیجئے۔“

یہ وہ لوگ تھے جن کے بارے میں خدا کا ارشاد ہے :-

اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانوں اور ان کے
اموال کو خرید لیا ہے جس کے عوض میں ان کے لئے
جنت ہے —“

امام صاحبؒ کا یہ اصول تھا کہ ہزاروں درہم و دینار کے

خزانے حکومت اور جمہور کی طرف سے ان کے قدموں میں ڈالے جاتے مگر یہ سارا خراجِ عقیدت ان کی نظر میں اللہ کی امانت تھا ـــ نذرانوں کا تین چوتھائی حصہ بہرحال صدقہ و خیرات میں لگا دیا جاتا اور اس طرح عالمِ باقی کے خزانوں میں جمع کر دیا جاتا اور بمشکل ایک چوتھائی رقم دنیائے فانی میں خود جیسے اور ان کے عیال کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی ذات پر روا رکھی جاتی ـــ ٹھیک اسی طرح زندگی کے صبح و شام کو خدا کی "امانت" کے طور پر تقسیم کر رکھا تھا ـــ ان کا بہت بڑا غالب ترین حصہ اُس سفرِ آخرت کی تیاریوں میں صرف ہوتا جو دم توڑتے ہی شروع ہونے والا ہے اور ہزاروں سالہ برزخ اور پچاس ہزار سالہ عرصۂ قیامت طے کرتا ہوا جو ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا ـــ جس کی راہ میں میزانِ عمل کی وہ گھاٹی ہے جہاں ذروں کی کمی ترازو میں تولی جا رہی ہوگی ـــ حساب ہی حساب ہوگا اور ختم ہو چکے گا ـــ جس کا ایک مرحلہ وہ خطرناک ترین پل صراط بھی ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز تر ہے ـــ جس کے ایک کنارے پر عرصۂ قیامت ـــ نیچے بھڑکتی ہوئی آتشِ جہنم اور اُس پار خدا کی جنت ہوگی۔

امام شافعیؒ کتنے ہوشمند تھے کہ چار دن کی دنیا میں گم ہو کر اس بڑے بھاری سفر کی تیاریوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوئے ـــ نمازِ فجر سے سرِ نیاز اٹھاتا تو سیکڑوں طالبوں کے قافلے کو سفرِ آخرت کی تیاریاں سکھائی جاتیں ـــ سب سے پہلے فقہ کا درس ہوتا ـــ پھر حدیثِ رسول ﷺ کے آئینے میں انسان کے لئے بہترین اُسوے کی دل نواز جھلکیاں دکھائی جاتیں۔

قلب و روح میں یہ اُسوۂ حسنہ بٹھانے کے بعد مجلس وعظ کے ذریعہ ایمان افروز تاثرات دئیے جاتے ـــ اس کے بعد علمی مذاکرات کی محفل گرم ہوتی تاکہ مختلف سینوں کی حرارت ایمان اور دل کی روشنی کا اندازہ ہو جائے ـــ کھانے پینے کے لئے ایک مختصر وقفہ کے بعد نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر پھر یہ مجلس ہوتی اور اس وقت دنیا کے حسین ترین حصّہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے خالص، ادبی اور لسانی علوم گفتگو کا موضوع بنتے ـــ اس طرح سفر آخرت کے راہی تھک تھکا کر گھروں کو چلے جاتے اور "میر کارواں" امام شافعیؒ بھی عصر تک آرام فرماتے تاکہ پھر تازہ دم ہو کر جہادِ علم و عمل کے محاذ پر رونق افروز ہوں۔ عصر کی نماز ختم ہو جاتی مگر امام شافعیؒ آخرت کی گہری سوچ میں سرور گریباں بیٹھے رہ جاتے اس محویت سے وہ اس وقت چونکتے جب مؤذن خدا کے گھر میں کھڑا ہو کر نمازِ مغرب کے "شاہی دربار" کا اعلان کرتا۔ اب جبکہ رات ہو چکی ہوتی اور چرند، پرند تک بسیرا لینے کے لئے اپنے اپنے کونوں میں پہنچ چکے ہوتے تو حضرت امام بھی نمازِ عشا پڑھ کر یہ دعا پڑھتے ہوئے شب خوابی کے بستر پر پاؤں رکھتے :-

میرے اللہ! تیرے ہی نام سے میرے پہلو ڈں کو یہ بستر چھوتا ہے اور تیرے ہی نام سے میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں ـــ اگر تو میری روح قبض کرلے تو جان بخشی فرما دینا اور اگر میری روح کو واپس بھیجدے تو اس جان کی اس

طرح حفاظت فرمانا جس طرح تو اپنے پاکباز بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔"

لیکن ابھی ایک تہائی رات گذرتی کہ خوفِ آخرت اور امید مغفرت کی ادھیڑ بن قلب و روح سے بیدار ہوتی اور پھر سے آنکھ کھل جاتی اور حضرت امامؒ حیات و کائنات کے خالق کو پکارتے ہوئے بستر سے اٹھ جاتے۔

"پاک ہے اللہ اور تعریف ہے اس کی اور پاک ہے خدائے عظیم ۔۔۔ اے اللہ تو سچا ۔۔۔ تیرا وعدہ سچا ۔۔۔۔۔۔

رات کی میٹھی نیندیں چھوڑ کر وہ کتاب و سنت کی علمی اور تحقیقی خدمت میں تن من سے منہمک ہو جاتے۔ علم کی لطیف آنچ سے قلب میں سوز اور روح میں اضطراب بڑھتا جاتا۔ اور آخر آخری تہائی رات سجدہ گاہ شوق پر اس حال میں بسر ہوتی کہ سینہ سوزِ ایمانی سے جلنے لگتا اور آنکھیں گرم گرم آنسوؤں سے سجدہ گاہ کو تر کر دیتیں۔ خدا کی کتاب اس طرح پڑھتے جیسے وہی ان کا درد ہے اور وہی اس درد کا درماں بھی۔ آیات الٰہی کو دیکھ کر دل میں میٹھا میٹھا درد سا ہوتا ۔۔۔ اور آنکھوں میں موتی سے آنسو چمک اٹھتے۔

سینے کا یہ درد آواز کو اتنا دردناک بنا چکا تھا کہ امام صاحب نماز پڑھاتے وقت ابھی چند آیات ہی تلاوت کر پاتے کہ ان کے کانوں میں پیچھے صف بستہ نمازیوں کی سسکیاں سنائی دینے لگتیں۔ تلاوت جوں جوں آگے بڑھتی یہ سسکیاں تیز سے تیز تر ہوتیں

اور کبھی کبھی تو یہ کیفیت ہو جاتی کہ جیسے شدتِ درد سے سینے پھٹ جائیں گے ـــــ ایسے عالم میں امام صاحبؒ فوراً تلاوت کا سلسلہ روک دیتے اور اس بیقرار و نیم بسمل جماعت کو ساتھ لئے ہوئے رکوع و سجود کی لطیف گہرائیوں میں موجِ تہ نشیں کی طرح گم ہو جاتے تھے۔

ایک بار صفا پر چڑھتے ہوئے کسی کو یہ آیت قرآنی پڑھتے ہوئے سُنا:-

> یہ ہے دن (آدمیوں کی) چھٹائی کا! ـــــ سمیٹ لائے ہیں
> ہم تمہیں اور تم سے پہلوں کو......"

دل سے ایسی ہوک اُٹھی کہ خود کو سنبھال ہی نہ سکے ـ ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں اور دل ایسا بھر آیا تھا کہ بس روئے چلے جا رہے تھے۔ امام مزنیؒ کا غلام صالح جو یہ دردناک منظر آنکھوں سے دیکھ رہا تھا گھبرا گیا تو آقا کو یہ قصہ سنایا۔ امام مزنیؒ نے آہ سرد بھرتے ہوئے بس اتنا کہا:-

> بھائی یہ کوئی نئی بات نہیں ـــ امام شافعیؒ پر
> تو خدا کا خوف مستولی ہی رہتا ہے......"

ربیع بن سلیمانؒ ایک بار حج کے موقعہ پر امام شافعیؒ کے ہمراہ تھے ـــــ ان کا کہنا ہے کہ ہر ہر نشیب و فراز پر امام صاحبؒ نغمہ و نالہ کے وجد انگیز عالم میں اتر رہے تھے اور چڑھ رہے تھے روتے جاتے اور جذب و جنوں میں ڈوبے ہوئے اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

عشق رسولؐ کا سوز تو خدا نے ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر ہی دیا تھا۔ تعلق بلّٰہ سپردگی اور سپردگی نے فدائیت و فنائیت کی وہ شکل اختیار کر لی تھی جہاں حسن و عشق کے درمیان اپنے وجود کا ہلکے سے ہلکا احساس بھی حجاب درمیان محسوس ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ خاص کیفیت میں فرمایا کرتے :۔

کوئی بھی مسئلہ میری کتابوں میں اگر خلاف کتاب و سنت ہو تو تم اس کو دیکھو خوب سمجھ لینا کہ میں نے یقیناً اس سے رجوع کر لیا ہے ——— دیکھو یہ بات یاد رہے کہ اگر صحیح حدیث مجھ تک پہنچے اور پھر میں اس پر عمل نہ کروں تو .... تو میری عقل میں فتور آچکا ہوگا ——

اللہ اکبر! ——

کیسے تھے وہ لوگ جو احادیث کے پائے نار پر اس طرح آنکھیں ملتے اور کہتے تھے :۔

اگر حدیث رسول ہم تک پہنچی اور ہم نے پھر بھی اس پر عمل نہ کیا تو سمجھ لینا کہ ہم پاگل اور سودائی ہو چکے ہوں گے ——"

——— اور ——— کیا وقت آیا ہے آج غریب الدیار" اسلام پر کہ پرلے سرے کے وہ " دیوانے "، خود کو " دیوانے "، تو کیا ماننے " بہتری فرزانے "، قرار دینے کی جسارت دکھا رہے ہیں جن کے ذہنی فساد کا یہ عالم ہے کہ انھیں " حدیث " سے " عجمی سازش "

کی بو آتی ہے اور جو "حدیث بیزاری" کی مکروہ ترین بنیاد پہ یہ دعوی پیش کرتے ہیں کہ "دیکھو ہمیں ـــ ہم کہ قرآن کے عاشق ہیں!"

ـــ جی ہاں! اور وہ بھی "مسلمان" ہیں۔ بلکہ ان کی ضد ہے کہ "وہی مسلمان ہیں" ـــ کیونکہ انہوں نے ائمہ و اسلاف کی روحوں پر "تاریک خیالی" کا حملہ کیا ہے اور تاریخ میں پہلی بار حدیث کے خون سے قرآن لکھنے کی کوشش کی ہے!

ـــ مگر یہ تھے امام شافعیؒ!

کل کے "بندۂ مومن" ـــ آج کے "دانش ور" ہیں! ـــ

وہ کتاب وسنت پہ یوں جان نثار کرتے تھے کہ قرآن وحدیث کا ہر خادم ان کو اپنا "مخدوم" نظر آتا تھا! ـــ سچ یہ ہے کہ بڑا ہوتا ہی وہ شخص ہے جس کو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس عجز تڑپاتا ہے جو شکر نعمت سے کبر و نخوت کا سبق لینے کے بجائے حق کی بڑائی اور اہل حق کی عظمت کو اپنی آبرو کی طرح عزیز رکھتا ہو

ایک بار کسی نے امام ابو حنیفہؒ کے متعلق ان کی رائے دریافت کی۔ امام صاحبؒ کا نام سنتے ہی ان کا جوش عقیدت بھڑک اٹھا

"امام ابو حنیفہؒ ؟ ـــ سن لو کہ لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کی اولاد ہیں ـــ"

کسی نے امام سفیان ثوریؒ اور امام مالکؒ کا ذکر خیر سنا پایا تو خاص درد بھرے انداز میں ان کی عظمت کی یوں قسم کھائی:

"اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو حجاز سے علم حدیث

نا پید ہو جاتا ۔"

امام مالکؒ کی کوئی بات نقل فرماتے تو کیا مجال ہے کہ اپنی شاگردانہ حیثیت فراموش کر جائیں ۔۔۔ ہمیشہ یوں ہی آغاز فرماتے :۔

" یہ ہے قول ہمارے استاد امام مالکؒ کا ....."

کیا چیز ہے خدا کا حقیقی خوف بھی کہ جس دل کو یہ خوف چھو گیا پھر اس کی " ہیں " کبھی سنائی نہ دی ۔ حضرت امامؒ نے حق کو اپنایا بھی اور پھیلایا بھی اور ساتھ ہی بحث و مناظرے کے اس محاذ پر باطل سے ٹکرائے بھی جہاں اعلائے کلمۃ الحق کو بھول کر خود اپنی ذات کی " ہار جیت " کے جوش میں بڑی بڑی شخصیتیں بھی " کٹ حجتی " کی دلدل میں جا گرتی ہیں ۔۔۔ مگر امام شافعیؒ کیسے خوش نصیب تھے کہ کبھی اس حادثہ، فاجعہ کا شکار نہ ہوئے ۔۔۔ تحدیث نعمت کے جوش میں ایک بار کہہ اُٹھے :۔

اپنی بڑائی یا اظہار فضیلت کے لئے میں نے کبھی کسی سے مباحثہ نہ کیا ۔ ہمیشہ کلمہ حق کو سربلند کرنے کا مقصد سامنے رہا ۔ لیکن ۵۴ سالہ زندگی کا خون دل و جگر اس شان تجبر سے خدمت دین اور اعلائے کلمۃ الحق میں نچوڑ دینے کے بعد بھی وہ کیسے ڈرتے تھے کہ میں اپنے خدا کی مزدوری کا حق ادا نہ کر سکا ۔۔۔ ہر ہر سانس میں خوف و امید کی جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی " دم واپسیں " میں جیسے وہ سارا سوز و کرب سمٹ آیا تھا ۔

امام صاحب "خونی بواسیر" کے مستقل مریض تھے۔ اور عمر بھر اسی عالم میں انہوں نے خدمتِ دین کے دشت و صحرا کی خاک چھانی تھی کہ اکثر سواری کی حالت میں خون جاری ہو جاتا تو ایسی ٹپک چھوٹتی کہ پائجامہ اور موزے تک خون سے تر ہو جاتے۔۔۔ لیکن اس کے باوجود یہ سفر شوق تھا کہ جاری ہی رہتا۔

کسی ایسے ہی سفر شوق میں وہ احقاق حق کی تڑپ لیے ہوئے ایک مناظرے میں پہنچے فریق ثانی کو شکست ہوئی تو وہ انتقام کے درپے ہو گیا۔۔۔ اور ایک اندھیری رات میں موقعہ پا کر حضرت امام" کے سر پر گرز سے قاتلانہ وار کر دیا۔۔۔ ۲۰ رجب ۲۰۸ھ کو عصر کے وقت طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔۔۔ امام مزنیؒ جو پاس بیٹھے تھے گھبرا گئے اور دلگیر آواز میں عرض کیا:

"اے استادوں کے استاد!۔ کیسا مزاج ہے؟"

آج میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں "مومن ضعیف کی پرسوز آواز آئی" اور اپنے بھائیوں سے جدا ہونے والا ہوں اور اپنے برے اعمال کی سزا پانے والا ہوں۔ خدا کی بارگاہ میں میری پیشی ہوا چاہتی ہے اور...... خدا کی قسم! مجھے یہ خبر نہیں کہ میری روح جنت میں جائے گی اور میں اُسے مبارک باد دوں گا یا دوزخ میں جائے گی جہاں مجھے اس کی تعزیت کرنی پڑے گی۔"

اس کے بعد نماز مغرب پڑھی۔۔۔ اُدھر ایک سورج چھپ چکا تھا اور ادھر یہ دوسرا آفتاب نماز مغرب کے بعد آہستہ آہستہ ہزاروں اشک آلود چہروں اور ترستی ہوئی نظروں کے سامنے غروب

ہو رہا تھا۔۔۔ زندگی کے ۵۴ سال اور ان کے تمام کارنامے جس کی پشت پر ایک دنیا کو جگمگا رہے تھے وہ خود کس بیچارگی کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز میں یہ التجائیں پیش کر رہا تھا:۔

"مشہور عابد ادریس ہیں ۔۔۔ کوئی ہے جو ان سے جا کر کہدے کہ اللہ! شافعی کی مغفرت کی دعا فرمائیں ۔۔۔۔۔"

اور پھر ۔۔۔ ۵۴ سالہ جہاد زندگی سے نظر ہٹاتے ہوئے ۔۔۔ ہزارہا عقیدت مندوں کی کربناک عقیدتوں سے بے خبر، طنز، تعریض کے ہر خوف اور تحسین و ستائش کی ہر خواہش سے بلند ۔۔۔ مرد مومن خوف سے پتھرائی اور امید سے للچائی ہوئی آنکھوں سے صرف اپنے خدا ۔۔۔ اپنے مالک یوم الدین کی طرف دیکھ رہا تھا ۔۔۔ اور تھرتھراتے ہوئے ہونٹ اس طرح اپنے مولا سے درد بھری سرگوشی کر رہے تھے:۔

"الٰہی! ۔۔۔ اگر تو میری لغزشیں معاف فرما دے تو ایک بڑے سرکش و ظالم و نافرمان کو معاف فرمائے گا اگر تو انتقام لے پھر بھی تیری ہستی سے میری آس تو نہ ٹوٹے گی ہاں خواہ میں اپنے اعمال کی بدولت جہنم ہی میں کیوں نہ داخل کر دیا جاؤں ۔۔۔ میری خطائیں شروع سے آخر تک بہت بڑی ہیں، لیکن اے بخشنے والے ۔۔۔ اے معاف کرنے اور ترس کھانے والے! تیرا کرم اور تیری بخشش تو اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔"

امید و بیم کی یہی کیفیت تھی جو مغرب سے عشاء تک جاری رہی ــــ یہ نماز عشاء، اس زندگی کی سچ مچ آخری نماز تھی جس نے ہر ہر نماز کو اس طرح پڑھا تھا جیسے وہی زندگی کی آخری نماز ہو ــــ نماز پڑھی اور پھر وہ عظیم "نمازی" اپنے خدا سے جا ملا جس کی نماز نے فواحش و منکرات سے اس طرح باز رکھا تھا کہ اس کی ساری زندگی ایک مسلسل نماز بن گئی تھی اور اس سے پُرشوق مصافحہ کرنے کے لئے ملک الموت رحمت کے فرشتوں کے جلو میں عمر بھر اس انتظار میں کھڑا رہا کہ نمازی کب اس نماز سے فارغ ہو کر دم واپسیں پر سلام پھیرتا ہے!

آج بھی مسلم ممالک کی سرزمین پر مساجد کا ایک زبردست جال بچھا ہوا ہے ــــ آج بھی مسجدیں دن میں پانچ بار نمازیوں کو نماز کیلئے پکارتی ہیں ــــ اذانیں بھی ہو رہی ہیں ــــ نمازی بھی آ رہے ہیں ــــ لیکن "نماز"؟ ــــ آہ وہ کہاں! آنکھیں ترستی ہیں کہ اس "نماز" کو ایک نظر دیکھ سکیں، جو اندر نفس کو بیڑیاں پہناتی ہے تو باہر طاغوت کو پابجولاں کر دیتی ہے ــــ میرے مولا! کیا نماز اُٹھائی جا رہی ہے؟ ــــ حالانکہ ہم سب "مسلمان" ہیں!

ایک دو ــــ سو دو سو نہیں ــــ تین سو تیرہ نہیں ــــ پورے ستر کروڑ مسلمان!! بلکہ اس سے بھی زیادہ!!!

تجلی مئی ۶۱ء

منجدھار سے ساحل تک

مکے میں قریش کے ایک صادق و امین شخص نے اعلان کیا ہے کہ انسانوں کی حقیقی فلاح کے لئے میں خدا کا آخری پیغام لایا ہوں" تیزی سے گشت کرتی ہوئی یہ سنسنی خیز خبر قبیلہ غفار کے ایک جویائے حق انسان حضرت ابوذر غفاریؓ کے کانوں تک بھی پہنچی ۔ یہ خبر سنتے ہی وہ چونک اٹھے!۔

چاروں طرف پھیلی ہوئی گھٹا ٹوپ تاریکی میں جیسے کوئی حسین ترین جگنو چمک اٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کا معصوم دل کیسا کیسا کڑھتا تھا کہ جھوٹ، گناہ اور ظلم نے انسانی بستیوں میں خوفناک جنگلوں کی سی فضا پیدا کر دی ہے۔ درندگی ہے کہ آدمی کی صورت سے ٹپکی پڑتی ہے ـــ جیسے آگ اور خون کا ایک زبردست طوفان امنڈ پڑا ہے جس کے وحشی تھپیڑوں نے تمام سفینوں کو توڑ پھوڑ ڈالا ہے اور جو لوگ ابھی تک اس طوفان میں غرق نہیں ہوئے وہ سب ٹوٹے ہوئے خستہ حال تختوں سے لپٹے ہوئے ایک ایک کر کے منجدھار میں چکرا رہے ہیں اور کنارے کی حسرت میں تڑپ رہے ہیں ـــ مگر کوئی نہیں جانتا کہ کنارا کہاں ہے اور وہاں کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟

"کیا عجب ہے کہ یہ خبر درست ہو! حضرت ابوذر غفاریؓ نے دل کی گہرائیوں میں [illegible] کیا عجب ہے کہ جو بن سے خود اپنی

جانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ڈالتے ہیں ان بدنصیبوں پر ان کے حقیقی خدا نے ترس کھایا ہو۔۔۔۔“

”حقیقی خدا“ کے تصور سے ہی ان کے بیقرار و بیتاب سینے سے ایک زبردست ہوک سی اٹھی ـــــ ”خدا“ جس کو بھول کر جس سے دور بھٹک کر آدمی سوائے جہنم کے اور کہیں نہیں پہنچ سکتا۔ ”خدا“ جس کے بغیر سونے چاندی کے خزانے بھی سکون دل کو ڈسنے کے لئے منہ کھولتے ہیں ـــــ ”خدا“ جس کا یقین سینے پر جھیلتے ہوئے انسان کفن اوڑھ کر اور خود اپنے خون میں غسل کرکے بھی بے اختیار مسکرا دیتا ہے!

وہ نہ جانے کتنی دیر تک کیا کیا سوچا کئے ـــــ اور جتنا انھوں نے اس خبر پر غور و فکر کیا یہ خبر ان کے لئے اتنی ہی دلکش اور جاں نواز اور پر معنی ہوتی چلی گئی۔

”میرے بھائی!“ آخر انھوں نے ایک عملی فیصلہ کرتے ہوئے اپنے بھائی سے سرگوشی کی ”تمھیں ابھی اور اسی وقت مکے جانا ہوگا اور اس آدمی کے متعلق سب کچھ معلوم کرکے بہت جلد آنا ہوگا جس نے اعلان کیا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے“

اور ایک بھائی کی اس مقدس خواہش کے احترام میں دوسرا بھائی تلاش حقیقت کے اس حسین سفر پر روانہ ہو گیا۔ بھائی کے جانے کے بعد ان کی بیتابی انتظار امید و بیم کی قیامت سے دوچار تھی۔ ہر شے کی طرف سے نظر ہٹا کر اب وہ صرف مکے کی طرف اپنے زندگی دوا کے لئے چشم براہ تھے ـــــ ان کا دل بیتاب تھا کہ

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تیزی سے ان کے قریب آئے اور ان کی ایک ایک دھڑکن میں پیوست ہو جائے۔

آخر آخر ....

انتظار کی جانکاہ گھڑیاں بیت گئیں ۔۔۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے بھائی مکے کی طرف سے قبیلۂ غفّار میں واپس چلے آ رہے ہیں۔ دور ہی سے انھوں نے آنے والے کے چہرے کا بغور مطالعہ کیا اور سفر کے تاثرات کا بیتابانہ جائزہ لینے کی کوشش کی۔ یہ محسوس کر کے ان کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں کہ ان کے بھائی کے چہرے پر ایک حسین ترین امید کی جاں نواز روشنی دکھائی دے رہی ہے!

"کیا پتہ چلا ......؟" امید اور خوف کے دو آتشہ جذبات نے حضرت ابوذرؓ کے الفاظ میں تھرتھری دوڑا دی تھی۔

"گھبرائیے نہیں" ان کے بھائی نے ان کو دلاسا دیتے ہوئے کہا "میں ان سے ملکر اور دوسروں سے ان کے متعلق معلومات کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ تو خود بھی بڑے اچھے آدمی ہیں اور دوسروں کو بھی بڑی اچھی باتیں سکھاتے ہیں ۔۔۔ اور ہاں وہ ایک ایسا عجیب و غریب کلام سناتے ہیں جو نہ شعر ہے اور نہ کہانت ......"

بھائی کا ایک ایک لفظ انھوں نے گوش دل سے سُنا اور دل کی پیاس اور بہت کچھ جاننے کے لئے بڑھ گئی ۔۔۔ وہ بے چین ہو گئے کہ کاش میں خود مکے گیا ہوتا اور اپنی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھا ہوتا جس کے تذکروں میں کانوں کے لئے اس قدر مٹھاس ہے ۔۔۔ جذبات شوق کے ہچکولے کھاتے ہوئے وہ فی الفور اٹھ کھڑے

ہوئے اور قطعاً بے سر و سامانی کے عالم میں وجد کرتے ہوئے سوئے مکہ چل کھڑے ہوئے۔ وہ دنیا میں دنیا کے بنانے والے کو ڈھونڈنے جا رہے تھے ——— انھیں اس کھوئی ہوئی سیدھی راہ کی تلاش بیکل بنائے ہوئی تھی جس پر چل کر وہ اپنے معبود سے ملاقات کر سکیں۔

گرد و غبار میں اٹا ہوا ایک پرشوق مسافر دھوپ اور سائے سے بے نیاز ——— اونچے نیچے ریگستانوں کی خاک چھانتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ گرتے پڑتے مکے میں داخل ہوئے اور سیدھے مسجد حرام میں چلے گئے ——— کیا نازک سفر تھا یہ! ——— وہ اس ہستی کو جانتے پہچانتے تک نہ تھے جس کی تلاش انھیں وطن سے دور پردیس میں اس طرح کھینچ لائی تھی ——— اور دوسروں سے پوچھتے ہوئے اندیشہ تھا کہ سچائی کے دشمن ان کی اس آخری امید کو توڑ نہ ڈالیں جو زندگی کی ہولناک تاریکیوں میں انھیں روشنی کی واحد کرن محسوس ہو رہی تھی۔

سورج چڑھا۔ ڈھلنے لگا۔ شام ہو رہی تھی اور اس پردیسی کے پاس کھانے اور ٹھکانے تک کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اپنے مہمان کی پذیرائی کے لئے خود خدا نے ایک پرخلوص میزبان کو بھیجا۔ یہ حضرت علیؓ تھے جنھوں نے اس پردیسی کو دیکھا اور اس کے متعلق کچھ اور پوچھ گچھ کرنے کی کوئی ضرورت سمجھے بغیر مہمان نوازی کے پرشوق بازو پھیلا دیئے۔ وہ انھیں اپنے گھر لے آئے اور استطاعت بھر میزبانی کی۔ لیکن مہمان

نے اس رات اپنے راز پر سے نقاب نہ اٹھایا۔ دوسرے دن وہ پھر خانہ کعبہ میں جا پہنچے کہ شاید وہ اس آدمی کو پا سکیں جس کے انتظار میں ان کے روح و دل میں جذبات نے ہلچل ڈال رکھی تھی دوسری رات وہ پھر حضرت علیؓ کے حصے میں آئے ـــ اسی طرح تیسرا دن کٹا اور تیسری رات آ پہنچی۔ ـــ آج بھی وہ حضرت علیؓ کے مہمان تھے۔ آج رات میزبان نے یہ بھی اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ مہمان کا مقصدِ سفر معلوم کر کے اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے ـــ اور آج رات حضرت ابوذرؓ بھی دل کی بات ہونٹوں پر لے آئے۔

"میں کل صبح تمہیں حضرت محمدؐ کے پاس لے چلوں گا۔"

حضرت علیؓ نے مسرت انگیز آواز میں تسلی دی "لیکن اگر راہ میں کوئی ایسا شخص مل جائے جس کی موجودگی میں تمہارا میرے ساتھ دیکھا جانا مناسب نہ ہو تو میں جوتہ ٹھیک کرنے یا پیشاب کرنے کے بہانے رک جاؤں گا اور تم چلتے رہنا۔"

انتظار کی یہ پہاڑ سی رات بھی کٹ گئی ـــ صبح کی روشنی میں وہ حضرت علیؓ کے ہمراہ دربارِ رسولؐ پر حاضری دینے کے لئے چلے جا رہے تھے۔ بارگاہِ رسالت میں داخل ہوئے تو ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور جیسے ہی ان کی پہلی نظر خاتم النبیینؐ کے روشن ترین چہرے پر پڑی انھیں محسوس ہوا کہ دل کی ہر ایک دھڑکن میں چراغ سے روشن ہو گئے ہیں عقیدت کا سیلاب تھا جو حضرت ابوذرؓ کے پورے وجود سے پھوٹ نکلا تھا اور اجنبیت کا سارا احساس، شکوک و شبہات

کے تمام اندھیارے بیک نظر کافور ہوگئے تھے۔ وہ جانچ پرکھ کر جانے کیا کیا ذہنی نقشے بنا کر لائے تھے ۔۔۔ مگر یہاں تو تلاش حقیقت کا پورا سفر ایک ہی نظر میں طے ہو گیا۔۔۔ دو چار باتیں ہوئیں اور دل کی تمام گرہیں ایک ایک کرکے کھلتی چلی گئیں۔۔۔ قبیلہ غفار کا جگر پارہ بیتابانہ اُٹھا اور ساری دنیا سے کٹ کر آغوش ایمان واسلام میں آگرا۔

"ابھی تمہیں اپنے ایمان کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں" عرب الیار نومسلم کو تیسرا اسانی کے مذہب کی رخصت عطا کرتے ہوئے حضور ؐ نے تسکی دی "اب اپنے قبیلے میں واپس جاؤ اور جب ہم غالب آجائیں، تو ادھر پلٹ آنا۔"

"یارسول اللہ ؐ!" جوش ادب اور شدت ایمانی سے کانپتی ہوئی آواز حضرت ابو ذر ؓ کے ہونٹوں سے بلند ہوئی۔ "اس کی ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں تو اس کلمہ حق کو اُن بے ایمانوں کے اندر گھس کر چلا کر پڑھوں گا!" اور سچ مچ انھوں نے ایسا ہی کیا!

وہ غیرت حق سے بے قرار ہو کر اُٹھے ۔۔۔ جوش کے عالم میں روانہ ہوئے۔۔۔ بے تحاشا خانہ کعبہ میں در آئے اور کافروں کی بھیڑ میں گھس کر پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چیختے ہوئے اعلان کیا:۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود ہے ہی نہیں ۔۔۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ؐ خدا کے رسول ہیں۔"

خدا کے باغیوں نے یہ اعلانِ حق کی گرج سُنی اور ایک لمحہ کے لئے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کون شخص ہے جس نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ اعلان کیا ہے؟ —— اور دوسرے ہی لمحے حق کے اس اعلان کے خلاف دار و گیر شروع ہو گئی —— بے رحمانہ جنون کے عالم میں انسانی درندے اُٹھے اور ایک انسان کو ہر طرف سے لپٹ گئے۔ ہاں دیوانوں اور درندوں کا پورا مشتعل ہجوم اکیلے بندہ مومن پر ٹوٹ پڑا تھا۔ گھونسے تھے کہ پیاپے پڑ رہے تھے۔ ٹھوکریں تھیں کہ ہر طرف سے لگ رہی تھیں۔ گالیوں کی طوفانی بوچھار تھی —— لاف و گذاف کا طوفانِ بدتمیزی برپا تھا —— اور ان یورشوں کے نرغے میں کھڑا ہوا مومن صبر و استقامت کا مینارۂ نور بنا ہوا ایستادہ تھا —— دنیا اس بات پر آگ بگولا تھی کہ اس نے دنیا کے بنانے والے کا نام کیوں لیا ہے —— مگر بندۂ مومن مطمئن تھا کہ اس نے یہ اتنی بڑی بات کہی ہے جس کو سننے تک کی تاب دوسروں میں نہیں تھی۔ اس نے گالیوں کے جواب میں اُف تک نہ کی —— ٹھوکریں کھائیں اور کوئی فریاد تک نہ کی۔ وہ اپنا کام کر چکا تھا وہ اپنی بات کہہ چکا تھا اور اب سہنے کی باری تھی —— اسے خوف نہیں مکمل اطمینان تھا کہ خدائے کائنات اس کی پشت پناہی پر ہے۔ اس کو کوئی غم نہ تھا، دلی خوشی تھی کہ وہ خدا کی گلی میں زد و کوب کیا جا رہا ہے اور اس کے جذبۂ وفا کا یہ منظر اس کا خدا دیکھ رہا ہے۔ جسمانی درد و کرب کے تمام احساسات اس لطیف احساس میں گم ہو چکے تھے کہ اس مشتِ خاک کی طرف رحمٰن و رحیم خدا کی نظرِ خاص اٹھی ہوئی ہے۔

بہنے والا سب کچھ سہہ رہا تھا مگر دیکھنے والوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے ۔ شرافتِ انسانی کا درد اُٹھا اور اس درد سے تڑپتے ہوئے حضرت عباسؓ جو ابھی تک لذت ایمان تک نہ پہنچے تھے شرافتِ انسانی کے جوش میں آگے بڑھے ۔ اور مظلوم کے اوپر خود کو ڈالتے ہوئے ظالموں کو للکارا :۔

" ظالمو ! تمہیں کچھ ہوش بھی ہے ؟ ۔۔ یاد رکھو کہ اگر قبیلہ غفار کا یہ فرد مارا گیا تو تمہیں شام کے کاروباری سفر میں اس کے قبیلے میں سے گذرنا ناممکن ہو جائے گا ۔۔۔۔ "

عذاب آخرت کے بے فکروں نے جوں ہی مفادات دنیا کے نقصان کا خطرہ محسوس کیا ہوش ٹھکانے لگ گئے اور اس طرح درد و کرب کے بوجھ تلے سسکتے ہوئے مومن کی جان خدا خدا کر کے بچ سکی ۔

لیکن دوسرے دن اس سے بھی بڑا واقعہ پیش آیا ۔

خدا کی قسم ابھی جسم کی درد بھری چوٹوں پر ایک شبانہ روز کا وقت بھی نہ گذرا تھا کہ غیرت ایمانی کی چوٹ کھانے والا پھر اسی وادی قہر و ستم کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا ۔۔۔ ہائے وہ رستے ہوئے زخموں پر ایک اور زخم تازہ کھانے کا ولولۂ ایمانی ۔۔ اور ہائے وہ " اعلان حق " جو بزم ازل میں تمام ارواح انسانی نے اپنے خدا کے حضور کیا تھا مگر پھر مکرر تازہ کرنے کے لئے اتنکیار آدمؑ زمین پر اترے ۔۔۔ نوحؑ نے ساڑھے نو سو برس تک خونِ دل دجگر ٹپکایا اور عالمگیر طغیانی میں اپنا سفینہ خدا کے بھروسے پر چلایا ۔۔۔ ابراہیمؑ نے آگ کے بھڑکتے ہوئے الاؤ

میں خود کو بے خوف و خطر ڈالا ۔ یوسف ؑ نے جیل کاٹی ۔ موسیٰ ؑ فرعونی طاقت سے ٹکرائے اور بپھرے ہوئے دریا کا سینہ چیرتے ہوئے نکلے ۔ عیسیٰ ؑ نے تختہ دار دیکھا ۔ اور پھر صدہا انبیاء کی پوری تاریخ درد و کرب اکیلے محمد ؐ نے ۲۳ سال تک دُھرائی ۔

کیسے صاحب نصیب تھے ابو ذر غفاری ؓ ! کہ اسی "اعلان حق" کی سعادت دوسری یاران کے حصے میں آرہی تھی ۔

اس اعلان حق نے جس کو باطل نے کبھی معاف نہیں کیا آج تو جیسے بھڑوں کے چھتے کو بُری طرح چھیڑ دیا تھا ۔ ظلم و ستم کی قہرانی طاقتیں زخمی ناگ کی طرح اُٹھیں اور بندۂ مومن پر حملہ آور ہوئیں ۔ یقیناً اگر آج پھر خدا کے فضل سے حضرت عباس ؓ دوبارہ آڑے نہ آجاتے تو حضرت ابو ذر ؓ کا کام ہی تمام ہو چکا ہوتا ۔ آج وہ شہید ہو چکے ہوتے ۔ "شہید" ۔ وہ ممتاز جنتی جو جنت کی ٹھنڈی ہوا کھانے کے بعد یہ آرزو کرتا ہے کہ وہ پھر اسی دنیا ئے دنی میں واپس کیا جاتا تاکہ ایک بار پھر شہید ہو ۔ زندہ ہو اور پھر شہید کیا جائے ۔ پھر زندہ ہو پھر شہید کیا جائے ۔ زخموں اور چوٹوں سے پارہ پارہ وہ جسم اُٹھا جس کو حق کے نام پر خاک و خون میں مل جانے کی آرزو تڑپا رہی تھی ۔ وہ شہادت کی تڑپ میں کشاں کشاں آئے تھے اور شہادت کی آرزو اپنے ہر ہر زخم میں شعلہ زن کئے ہوئے واپس جا رہے تھے ۔

اللہ اللہ ! کیسے تھے وہ لوگ جو ہم سے پہلے اسی اسلام کے دائرے میں دیکھے گئے ! ان کے کارنامے ان کے ساتھ ساتھ

گئے اور ہمارے کرتوت ہماری جان کے لاگو ہیں۔ —— وہ اہلِ حق تھے جنھوں نے حق کی قیمت پہچانی اور جی جان سے یہ قیمت چکانے کی پروانہ وار کوشش کی —— اور ہم "حق فروش" ہیں کہ دنیائے فانی کے چند ٹکوں میں ہم نے سدا کی راحتوں کو ہنسی خوشی بیچ ڈالا ہائے ہم!! جو اس دنیا سے لپٹے جاتے ہیں جو ہمیں اپنے سینے سے نوچ کھسوٹ کر منوں مٹی کے نیچے گاڑ دینے والی ہے —— اور اس خدائے رحیم وکریم سے گریزاں ہیں جس کی رحمتِ بیکراں عمر بھر کے مجرموں کی آنکھ میں دو آنسو دیکھتی ہے تو جوش میں آجاتی ہے اور شہید وفا کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر ٹپکتے ہی جنت خلد کے دروازے کھول دیتی ہے

تجلی جولائی سنہ ۶۲ء

جان و دل کی بازی

"اسلام کو سینے سے لگانے کے بعد تمہارے اوپر کیا گذری؟"

ایک بار حضرت سیدنا عمر فاروق رضؓ نے حضرت خبابؓ بن الارث سے سوال کیا۔ یہ وہ دور تھا جب مومنین اور مجاہدین اپنی شدید مظلومیت کی وادیٔ پرخار طے کرکے ساحل مراد پہ آپہنچے تھے کفر و شرک توحید و رسالت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا ظلمت سمٹ چکی تھی اور نور پھیل چکا تھا ـــــ لیکن سوال نے ایک بار پھر حضرت خباب رضؓ کو ماضی میں واپس پہنچا دیا اور مکہ کا وہ تیرہ سالہ عہدِ خوں چکاں ان کی آنکھوں میں پھر گیا جس کو اہل ایمان و یقین کے سوا دنیا کا کوئی انسان ایک یا دو دن بھی شاید ہی برداشت کرسکے ـــــ آنسوؤں اور خون میں لتھڑی ہوئی لمبی کہانی حضرت خبابؓ کے پاک ہونٹوں تک اُبھر کر آئی اور ـــــ تمام الفاظ گنگ و بے ہوش ہو گئے۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کچھ بھی نہ کہہ سکے ـــــ انھوں نے اس سوال کا جواب دینے کے لئے اپنا کرتہ ہٹایا اور اپنی کمر حضرت امیر المومنین رضؓ کے سامنے بے نقاب کر دی ـــــ کمر کیا تھی چھالوں اور آبلوں کے نشانات کا ایک فرشِ گل تھا۔ زخموں کے داغ ہی داغ تھے۔ چوٹوں اور ضربوں کی بے شمار بدھیاں تھیں یہ مظلومیت کی ایک مُرصّع داستان تھی ـــــ یہ جہاد و عزیمت کا ایک طویل افسانہ تھا ـــــ خدا کی قسم! یہ زندگی کا بہترین سازو سامان تھا۔

—— یہ تو آخرت کے ناپیدا کنار سفر کا بہترین توشہ تھا۔

اللہ اکبر! عقیدت اور درد کے مارے حضرت عمر فاروق رض بے ساختہ پکار اٹھے "یہ تمہاری کمر ہے! —— میں نے تو آج تک ایسی کوئی انسانی کمر کبھی نہیں دیکھی!......"

"جی ہاں!" حضرت خباب رض کے لبوں پر ادائے شکر کا وہ تبسم کھل اٹھا جو صرف ایک مومن کے چہرے پر نظر آسکتا ہے "خدا جانے کتنی ہی بار مجھے ایمان کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگانی پڑی —— شعلوں کے بستر پر میری راتیں کٹی ہیں اور تپتی ہوئی زرہ پہنا کر مجھے ریگستان کے تنور میں گھسیٹا گیا ہے اور یہ آگ سچ مچ میرے لہو اور میری چربی سے بجھتی تھی۔ زندگی کے ہر سانس کو درد و کرب کا جہنم بنا کر مجھ سے کہا جاتا تھا کہ میں اپنے خدا کو چھوڑ دوں —— لیکن حقیقی دوزخ کی لپیٹ سے بچنے کے لئے میں نے دنیا کے ہر الاؤ کو ہنسی خوشی برداشت کیا —— یہ خدا کا فضل و کرم تھا وہ جس پر چاہتا ہے اس کی بارش فرماتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھیں رشک اور عقیدت سے چھلک رہی تھی۔

"پھر مظلومیت کی خوں چکاں گھاٹی آخر آخر طے ہوگئی اور ظلم و ستم سے انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کا دوسرا معرکہ آپہنچا ہائے جہاد زندگی کے وہ بیقرار لمحے! —— جب تلواروں کی چھاؤں میں میٹھی نیند سونے کے لئے ہم اپنے اپنے گھروں سے یہ دعائیں مانگتے ہوئے نکلتے تھے کہ اے کاش میدانِ جہاد سے ہماری واپسی ہمارے خدا

کی طرف ہو! — جب خدا سے ملاقات کرنے کی بیقرار آرزو میں ہم زندگی کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر زمین و آسمان سے دور — بہت دور نکل جانا چاہتے تھے .... جب ...."

یکایک حضرت خبابؓ پر گریہ طاری ہو گیا — آواز سینے میں بیٹھ رہی تھی اور آنسوؤں کی بوندیں پلکوں سے ٹپک کر انکی داڑھی تر کر رہی تھیں۔

"اے خبابؓ بن الارت! — رونے کی کیا بات ہے؟" لوگوں نے تڑپ کر سوال کیا:۔

حضرت خبابؓ نے آنسوؤں کے درمیان سے جواب دیتے ہوئے فرمایا — "میں اس لئے روتا ہوں کہ ان تمام معرکوں کے بعد ہم پر خدا نے دنیا کے خزانوں کا منھ کھولدیا — ہمارے سروں پر عزت و حشمت کے پرچم لہرائے ...... تو میرے بھائی! میں ڈرتا ہوں ... کہ .... کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ہمارے حقیر کاموں کا حساب اسی دنیا میں چکا دیا گیا ہو۔ اور آخرت کے بازار میں ہم خالی ہاتھ کھڑے نہ رہ جائیں۔"

یہ وہ شخص دنیا کی خوشحالی کو دیکھ کر آخرت کے خسران کے تصور سے رو رہا تھا جس نے زندگی کی صرف میتیس بہاریں دیکھی تھیں یہ وہ جوان تھا جس کے نفس کی ہر مادی امنگ کو دار البقا کے خطروں نے بوڑھا کر دیا تھا — جس نے یہ تہہ کی بات پالی تھی کہ یہ دنیا کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو مگر بہر حال سرائے فانی ہے یعنی حسن رہگذر ہے جو منزل تک پہنچانے کے بجائے مسافر کو اس کی منزل سے غافل کر دیتا

چاہتا ہے ۔۔۔ دنیا سے بھاگ کھڑے ہونا بدترین بزدلی تھی اس لئے وہ اس کے درمیان سے گذرا مگر دنیا میں پاؤں پھیلا کر سو جانا بدترین موت تھی اس لئے وہ ادھر اُدھر دیکھنے کے بجائے اُس دنیا پر نظر جمائے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہا تھا جو آنکھ بند ہوتے ہی آنکھوں کے سامنے ہو گی۔ دنیا میں رہ کر اس نے دنیا کو اس حد تک چھوڑ دیا تھا کہ بسترِ موت سے اسے وصیت کرتے ہوئے سنا گیا۔

" مجھے آبادیوں میں مت دفنا دینا ! ۔۔۔ کوفہ کے ویرانوں میں میری پہلی قبر بنائی جائے ۔ ...... دیکھو جنگل میری طرف بازو پھیلا رہے ہیں "

ان کے انتقال کے بعد ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی قبر پر سے گذرے تو بے اختیار رقت طاری ہو گئی

" اللہ خباب رضؓ پر رحمت کی بارش کرے " انھوں نے کہا " جو خوشی سے مسلمان ہوا ۔۔۔ پھر خوشی سے ہجرت کی ، جہاد میں اپنی عمر کاٹی اور مصائب پر مصائب برداشت کئے ۔۔۔ مبارک ہے وہ شخص جو زلزلۂ محشر کو یاد رکھے ۔۔۔ میزان عمل کے پاس کھڑے ہو کر زندگی کا وزن کرانے کی تیاریاں کرے ۔۔۔ گذران کے بقدر مال پر قناعت کرے اور اپنے مولائے حقیقی کو راضی کر لیجائے ..... "

جس وقت آلِ یاسر رضؓ پر ظلم و ستم کی قیامت ٹوٹی پڑ رہی تھی ۔۔۔ جب حضرت یاسر رضؓ کا بڑھاپا آتشیں زنجیروں میں جکڑ ڈالا گیا تھا جب ان کی بوڑھی شریک زندگی حضرت سُمیّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ٹھوکروں اور کچوکوں، شعلوں اور زنجیروں کے درمیان سے گذرتی ہوئیں جان والے بہ جان دینے کی ریت ڈالنے کے لئے اسلام کی پہلی شہادت کا افتتاح کرنے جارہی تھیں ـــــ جب ان بوڑھے ماں باپ کا جواں سال عمار رضؓ ظلم واستبداد کے آخری شکنجوں میں کسا جارہا تھا ـــــ اُس وقت وہ عاشقانِ پاک طینت لہو کے فواروں اور آنسوؤں کی موسلا دھار برسات میں یکایک فرطِ مسرت سے مسکرا اٹھے ـــــ صرف اس لئے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ان سوختہ سامانوں کے پاس سے یہ کہتے ہوئے گذر گئے تھے :

"صبر کرو اے آلِ یاسر! وعدہ ہے کہ تم سے ملاقات جنت میں ہوگی ....."

سمیہ رضؓ کی روح پر وجد طاری ہو چکا تھا ـــــ شدّت کرب سے جب زبان اینٹھ گئی تھی وہ ظالموں سے کہہ رہی تھیں کہ "خدا ایک ہے ـــــ خدا کی قسم!" بوڑھے ماں باپ نے اسلام پر جانیں نثار کر دیں اور جواں سال عمار رضؓ اس لئے زندہ رہے تاکہ ہجرت وجہاد کے حوصلے نکالنے کے بعد شہید ہوں۔ انھوں نے مکہ میں اپنا گھر چھوڑا اور ہجرت مدینہ کی راہ پر چل کھڑے ہوئے ـــــ مدینے کے قریب دامن قبا میں انھوں نے پُر شوق مزدور کی طرح اللہ کا گھر تعمیر کیا ـــــ مسجد قبا کے لئے سب سے پہلا پتھر جس شخص نے اٹھایا وہ خاندان یاسر رضؓ کا یہی چشم وچراغ تھا تو تھا۔ پھر شمشیر وسناں کی زد میں کھڑے ہو کر انھوں نے شہادت کی چاپ سُنی تو روح رقص کرنے لگی اور ہونٹوں پر یہ نعرہ مستانہ گونج اٹھا،

"اب جاکر دوستوں سے ملیں گے ہم !۔۔۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملیں گے ۔۔۔ ان کی جماعت سے ملاقات ہوگی"۔

یہ نعرہ شوق بلند کرتے ہوئے ہونٹ خشک ہونے لگے اور کسی سے پانی مانگا تو دودھ سامنے کیا گیا، اس کو پیا اور پی کر فرمایا:۔

"حضورؐ نے فرمایا تھا کہ دنیا کی سب سے آخری چیز دودھ پیے گا ۔۔۔۔۔"

یہ کہہ کر خوشی سے بے قابو ہو گئے ۔۔۔ اور شہادت نے بڑھ کر ان کو سچ مچ سینے سے لگا لیا ۔۔۔ وہ جس دنیائے فانی میں چورانوے سال تک مقیم رہے تھے ۔ اس دنیا سے بچھڑنے کا انھیں کچھ غم نہ تھا وہ خوش تھے کہ جس خدا کے وہ ہیں اسی کی طرف پلٹ کر جا رہے ہیں اور کامیاب و سرخرو جا رہے ہیں۔

حضرت صہیب رومی رض خدا اور اس کے رسول صؐ کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور دنیا ان کو پکارتی ہوئی پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔

"ہم تمھیں مدینے نہ جانے دیں گے ۔۔۔ ہرگز نہ جانے دینگے" مکہ کے کفار تعاقب کرتے ہوئے چیخ رہے تھے "ہمارے نیزے تمہارے خون کے پیاسے ہیں ۔۔۔ ہماری فولادی ٹھوکریں تمہارے وجود سے کھیلنا چاہتی ہیں ۔۔۔ ہم تمھیں اے اللہ والو! یوں آسانی سے نہیں جانے دیں گے۔"

حضرت صہیب رض نے مردانہ وار پلٹ کر تعاقب کرنیوالوں

کی طرف دیکھا :-

دنیا کی سب چیزیں میں تمہارے پاس چھوڑ آیا ہوں اور صرف ایمان بچا کر ساتھ لئے جا رہا ہوں ۔۔۔ میری دولت، میرا مال، میرا گھر بار، میری خوبصورت باندیاں ۔۔۔ وہ سب کچھ تم لے لو ۔۔۔ اور مجھے جانے دو ۔۔۔ اور اگر اس پر بھی تم آڑے آتے ہو تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا مگر خدا کی طرف پیٹ پھیر کر مکے کی طرف ہرگز رخ نہ کروں گا ۔۔۔ آؤ! تم میری لاش لے جا سکتے ہو ۔۔۔ مگر یہ لاش بھی اُس وقت جا سکے گی جب میرے ترکش کا آخری تیر ختم ہو چکا ہوگا ...."

یہ کہا اور مکہ کے اُس مشہور قادر انداز نے اپنی کمان دوہری کر لی ۔۔۔ دنیا دنی کے پروانوں نے جب دیکھا کہ وہ اپنی ساری دنیا پیچھے چھوڑ کر جا رہا تھا تو فاتحانہ خوشی کے ساتھ اس دیوانے کو چھوڑ کر گھر چلے آئے ۔۔۔ مگر یہ حق کا پروانہ جب مدینہ کے قریب پہنچا تو قرآن کی یہ آیتیں اس کے استقبال کے لئے عرش کی بلندیوں سے فرش زمین پر اتر رہی تھیں کہ :-

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ"

"اور ایسے بھی لوگ ہیں جو رضائے الٰہی کے لئے اپنی جان کو خرید لیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔"

جس وقت وہ مدینے کے قریب پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں ہی تشریف فرما تھے۔

"تم نے اے صہیبؓ نفع کی تجارت کی!" صہیب رضہ کی

صورت دیکھتے ہی اللہ کے رسولؐ نے مبارکباد پیش فرمائی۔

یہ سُننا تھا کہ حضرت صہیب رضؓ کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔۔۔ اس وقت ان کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ مکہ میں دولتِ دنیا سے دامن جھاڑ کر چلے آئے ہیں۔۔۔ حضورؐ کے سامنے کھجوریں رکھی تھیں اور حضرت صہیب رضؓ اُس تبرک پر جٹ گئے۔ وہ اتنے خوش نظر آتے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

"تمہاری آنکھیں دکھ رہی ہیں اور کھجوریں کھاتے ہو" حضورؐ نے شفقت بھری تنبیہ کی۔

"حضورؐ"! حضرت صہیب رضؓ نے پُرمزاح جواب دیا:۔ "اُس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جو دکھ نہیں رہی!۔۔"

اور اس جواب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔ ۔۔۔ پوری محفل پر مسرت کی فضا چھا گئی۔۔۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ آنے والا ابھی ابھی ساری دنیا لٹا کر آیا تھا!۔

کیسی تھی وہ محفل جہاں ایمان کی شمع روشن تھی، جہاں وہ لوگ رونق افروز تھے جو خدا کے خریدار تھے اور خدا ان کا خریدار تھا! جو متاعِ دنیا کو پاتے تھے تو آخرت کے افلاس کا ہلکے سے ہلکا اندیشہ صبر و ضبط کا پیمانہ چھلکا دیتا تھا مگر جو دنیا کو لٹا کر اس طرح خوش ہوتے تھے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سر سے اُتر گیا ہو!۔۔۔

لیکن۔۔۔ آج ایک عرصہ سے ہمارے سینوں میں کیسی تاریکی ہے کیسی بے کنارہ تاریکی اور ویرانی۔۔۔ کیا خدانخواستہ اندر ہی اندر ہمارے

ایمان کی شمع گل ہو چکی ہے ؟ — خدارا کوئی بتاؤ — کیا ہم مسلمان ہیں ؟ — آہ ! — کیا ہم مسلمان ہیں ؟ — قبریں ہماری طرف منہ کھولے بڑھ رہی ہیں مگر ہم بیٹھے مڑ مڑ کر للچائی ہوئی نظروں سے اسی دنیائے فانی کو تک رہے ہیں جس کے ذرّے ذرّے میں ہمارا دل اٹکا ہوا ہے — زمین ہمارے پاؤں تلے سے کھسک رہی ہے مگر گرتے گرتے ہم چاہتے ہیں کہ خدا کے آستانے کے بجائے ہمارا سر دنیائے دنی کے قدموں پر جا گرے ! اُف ! میرے خدا ! یہ ہم کیا کر رہے ہیں ؟ —

ہم کہاں ہیں — یہ کیسا اندھیرا ہے جو ہماری روح کو ڈس رہا ہے اور یہ کیسی ویرانیاں ہیں جو ہمارے دلوں کی وسعتوں میں بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہیں — تجلی اگست ۶۲ء

ہدایت کی راہ پر

باپ سے آگے اگر بیٹا نکل جائے تو یہ خدا کی دین نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ لانت جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایمان کے لئے جان اور وطن دونوں کو بے جھجک داؤں پر لگایا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی قدموں سے لپٹ کر ساری دنیا اور تمام ماضی کو نثار کیا تھا تو اسی رات کی صبح کو مکہ نے یہ سنا کہ ان کے والد بوڑھے قحافہ حضرت علی رض کو دیکھ کر تیوری چڑھاتے ہوئے یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں :-

" ان قریشی لونڈوں نے میرے بچے کا بھی ناس کر کے رکھدیا !"

لیکن آٹھ سال بعد —— دنیا نے دیکھا کہ ضعف پیری سے لڑکھڑاتے ہوئے یہی قحافہ ٹھیک اسی سمت میں اور ٹھیک ان ہی شغاف قدموں کو چھو لینے کی تڑپ میں اپنے بیٹے ابوبکر رض کا سہارا لئے ہوئے کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں کہ جس سمت میں کبھی ایک قدم چلنا ان کی نظر میں سعادت دکامرانی نہیں معاذ اللہ خسران و نامرادی کے ہم معنی تھا۔

کتنا روشن ضمیر تھا وہ " بیٹا " جس نے سچائی کو اس وقت دیکھ لیا اور دیدہ و دل میں اُتار لیا تھا جب ایک سفید ریش جہاں دیدہ

بوڑھے باپ کی نظر میں وہی "عظیم سچائی" محض بچوں کے ایک احمقانہ کھیل سے زیادہ کچھ نہ تھی! ــ فریب دیدہ و دل سے خدا کی پناہ! کتنی سچی ہے یہ بات کہ یہ خدا ہی ہے جو انسان کو جب چاہے سیدھا راستہ دکھا دے اور اگر کسی بدنصیب نے اس کے در سے زندگی کی یہ عظیم ترین بھیک نہیں مانگی تو اس کی آنکھوں کی کیا مجال ہے کہ حقیقت کو دیکھ کر پہچان سکیں اور دل کی دھڑکنوں میں کیا یارا ہے کہ اس پراسرار ہستی کو محسوس کر سکیں جو نظروں سے جتنی دور ہے دل اور رگِ جاں سے اتنی ہی قریب تر ہے۔ خود قحافہ حق کی آواز پر اس وقت نہ بڑھ سکے جب ان کی آنکھوں میں بوڑھی بینائی کی ایک آدھی کرن اور ان کی ٹانگوں میں قدم اٹھانے کی تھوڑی بہت طاقت موجود تھی سچائی اس وقت بھی ان کی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر تھی لیکن اسے دیکھ کر ان آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ خدا کی پکار اس وقت بھی ان کے کانوں کے پردوں تک آپہنچی تھی لیکن اس کو سنتے ہی وہ منہ پھیر کر چل دیئے تھے۔ لیکن جب قادرِ مطلق کی نظرِ کرم اپنے بندے کے حالِ پریشان کی طرف اٹھی تو وہی بندہ اپنے معبود کی طرف والہانہ انداز میں گرتا پڑتا ہوا اس وقت آگے بڑھا جب اس کی آنکھوں میں بینائی کی رمق بھی باقی نہ رہی تھی اور ضعفِ پیری سے تھرتھراتی ہوئی ٹانگوں کو خود اس کے اپنے جسم کا بوجھ اٹھا کر چلنا دوبھر ہوگیا تھا!

یہ رقت انگیز منظر خدا کے رسول ؐ نے دیکھا کہ فتح مکہ کے بعد مکہ کا یہ معمر آدمی اپنے انمول لختِ جگر حضرت ابوبکرؓ کے شانوں پر

جھولتا ہوا ۔۔۔ ٹھوکریں کھاتا ہوا، ہانپتا کانپتا ہوا دنیا بھر کو چھوڑ کر آخرت کی دھن میں کشاں کشاں چلا آرہا ہے۔ آج اس کی نظر میں وہ ساری عمر دراز ایک بدترین حماقت کا شاہکار تھی جو اسلام سے محرومی کے عالم میں بیتی تھی آج تو قبر کے کنارے پر پہنچکر اس نے ایک ایسی سچائی کو پا لیا تھا جس کے چند شب و روز اپنی قیمت اور لذّت کے اعتبار سے اس کی پوری عمر پر بھاری تھے۔

حضورؐ نے اس درد بھری خوشی کا جذبات انگیز منظر دیکھا اور پھر اپنے رفیق جلیل حضرت ابو بکرؓ کی آنکھوں میں باپ کے اس حسین و جمیل انقلابِ زندگی پر پاکیزہ آنسوؤں کی نمی ملاحظہ کی اور فرمایا۔

تم نے غضب کیا کہ ان کو اس قدر تکلیف میں ڈالا! میں خود ان کی خدمت میں چلا آتا!"

کتنا عظیم تھا وہ واقعہ کہ جس کے خیر مقدم میں آخری اولوالعزم رسولؐ کے پاک ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے! ۔۔۔ کتنا شاندار تھا وہ "بیٹا" جو اپنے باپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کو اپنے شانوں کا سہارا دیتا ہوا دوزخ کی ہولناک آگ سے دور خدا کی جنت کی طرف لے کر چلا تو بارگاہ رسالتؐ میں اس کی اتنی شاندار پذیرائی ہوئی۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرطِ مسرت میں کھڑے ہوئے ۔۔۔ دنیائے حقیقت کے اس نووارد کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر بوڑھے قحافہ کے سینے پر حبیبِ پیغمبرؐ کے ہاتھوں کی پرشوق

تھپکی سے روح و دل کی گہرائیوں میں سوئی ہوئی زندگی جاگ اٹھی تو حضرت قحافہؓ نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ آنکھیں جاتی رہنے کے باوجود اگر کسی کے دل کی آنکھ کھل جاتی ہے تو کیا نظر آتا ہے کسے خبر ہے کہ اس وقت ان کو کیا نظر آیا؟ —— دنیا نے تو صرف اتنا دیکھا اور سنا کہ آٹھ سال پہلے اسلام کو بچوں کا حقیر کھیل سمجھ کر کڑ کنے برسنے والا بوڑھا مکی بے اختیار بے تحاشا چیخ اٹھا:۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تو بس اللہ ہی ہے —— اور میرا گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے بھی ہیں اور رسولؐ بھی!۔"

ہاں —— یہ خدا کی بارگاہ ہے جہاں اس کے در کے سوالی جب جب عرفان حق کی خالی جھولی لے کر ایک عاجز ترین بھکاری کے عجز کے ساتھ دامن پسارتے اور ہاتھ پھیلاتے ہیں تو بوڑھی سے بوڑھی زندگی پر آناً فاناً حقیقت و صداقت کا شباب آجاتا ہے۔ یہ ہے "وہ بھیک" جو خدا کے سوا کوئی بھی نہیں دے سکتا —— اور ہاں یہی ہے وہ "بھیک" کہ جس کسی کو یہ نہ مل سکی تو ہفت اقلیم کے شاہی خزانے بھی اس کے "افلاس" کے داغ نہیں دھو سکے۔ پھر کون ہے جس کو اس کی ضرورت نہیں لیکن کتنے ہیں جو اس کے در کے سوالیوں کی صف میں کھڑے ہو کر خود اسی کو بھیک میں مانگ رہے ہوں؟

ابھی اسلام رسولؐ خدا کے ہونٹوں تک ہی آیا تھا کہ ابوبکرؓ کا سینہ کھلا اور اس نور کو اپنے اندر جذب کر کے خدا کے سوا ہر شے کے لئے بند ہو گیا اور ابھی اسلام صرف انتالیس سینوں کی آڑ

میں خون اور سیاہی، کفر اور شرک اور درندگی و وحشت کے خوگر انسانوں کی طرف ایک خاموش دعوتِ حیات کی صورت میں آگے بڑھ رہا تھا کہ ابوبکر رضؓ کو محسوس ہوا حق کی آواز کو سینے کے اندر ہی اندر ضبط کرتے کرتے ان کا سینہ شدّتِ ضبط سے پھٹ جانے کے قریب ہے۔ جھوٹ چھپانے ہی کے قابل ہے اور حق ظاہر ہو جانے ہی کے لائق ہے۔ یہ بات سوائے ایک حق پسند کے کوئی نہیں جانتا کہ جس حق کو اٹھانے سے پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا اس حق کو اٹھانے والے انسان کو اس حقیقت کا طوفان سینے کے اندر دبانے سے کیسی تکلیف ہوتی ہوگی! جب خطرات کی ڈراؤنی پرچھائیاں در و دیوار پر ناچتی ہوں گی حق پسندوں کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ اب "خدائے واحد" کا نام زبان پر لانا ایسا تھا جیسے کوئی کعبہ میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ پتھروں سے سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے کے لئے تیار ہو جائے اس وقت یہ ایک معبود کا بے لوث پجاری بارگاہِ رسالتؐ میں یہ التجا کر رہا تھا۔

"اجازت دیجئے کہ ایک بار کھل کر وہ بات زبان سے کہہ دوں جو میرے دل میں ہے۔ یہ خدا سے مایوس اور پتھروں سے آس لگانے والے نادان لوگ۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے سامنے اپنا سینہ چیر کر رکھ دوں۔۔۔"

رسولِ خداؐ کی نگاہوں سے موج در موج ابلتا ہوا جذبۂ حق ابوبکر رضؓ کے سینے میں آنکھوں کی راہ سے اتر کر جیسے ایک زبردست طوفان بن چکا تھا۔ حضورؐ نے کمالِ پذیرائی کے ساتھ اس

بندۂ مومن کی طرف دیکھا اور اجازت عطا فرما دی گئی ۔ اجازت عطا فرما دی گئی کہ جس امانت کو اٹھانے کے تصور سے یہ اونچے اونچے سر بفلک پہاڑ لرز اٹھے تھے تم اس امانت کو اٹھا کر اینٹ پتھر کی اونچی نیچی دنیا میں جا سکتے ہو اور دنیا کو بتا سکتے ہو کہ وہ خدا ہے جو اس کی کائنات میں انسان کو اپنی زندگی سے بھی پیارا ہو جاتا ہے ۔

عجز و عرفان کی دو آتشہ کیفیت میں حضرت ابو بکر رضؓ کیسے وقار اور کس متانت کے ساتھ خدا کا نام لیکر میدانِ عمل میں تشریف لا رہے تھے ! یہ جان پر کھیل جانے کی تمنا قبول ہو گئی تھی کہ دنیا بھر کے شاہی خزانوں کی کنجیاں کسی سائل کی جھولی میں ڈال دی گئی تھیں ۔ اعلان حق جو تلوار کی دھار سے زیادہ خطرناک راستہ ہے وہ اس شمشیر آبدار پر کس خوشی اور کس کیف کے ساتھ وجد کرتے ہوئے چلے تھے ۔

اعلان حق کے جواب میں نہ پھول برسے نہ واہ واہ ہوئی ۔ وہی ہوا جو سدا سے اس جگ میں ہوتا آیا ہے ۔ اسی ادائے بندگی پر تو ہمیشہ دنیا خفا ہوتی آئی ہے اور سر فروشوں کو فقط ایک آن دیکھے خدا کے سہارے جینا پڑتا ہے ۔ ابو بکر رضؓ کو یہی خوشی مطلوب تھی اسی لئے جب چاروں طرف سے نفرت ، سنگدلی ، درندگی اور سفاکی کی وحشیانہ یلغار ہوئی ۔ جب خدا کی مخلوق نے خدا کا نام سنکر غیظ و غضب کے عالم میں داعی حق کی ایک ایک ہڈی پر آہنی ہتھوڑے برسانے شروع کئے تو چوٹ پر چوٹ کھاتے ہوئے

بندۂ مومن کی نظر سوئے فلک اُٹھی اور خون چکاں زخموں کی گود میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی! یقیناً اس عظیم ترین خوشی کا راز صرف یہی احساس تھا کہ اس وقت ان زخموں کو وہ آنکھ دیکھ رہی ہے جس کو نہ نیند پکڑ سکتی ہے نہ اونگھ ـــــ جس کو صرف ایک بار اپنی طرف اٹھتا ہوا دیکھنے کے لئے انسان ہزار بار آگ اور خون کی بھٹیوں میں گر جانے کے لئے سر کے بل چل کر بھی جائے تو سودا سستا ہے گھائل ابو بکر رضہ کی سمت خدا کی نظر اُٹھی اور دکھ درد کے سارے احساسات نے بے ہوشی کی آغوش میں دم توڑ دیا۔ کتنے دردناک ستم ہوئے تھے کہ خود ظالموں کے دل ہل گئے! کفر پر خود کفر نے ملامت کی اور ابو بکر رضہ کو زخموں سے چور چور حالت میں اُٹھا کر ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔ لیکن جیسے ہی ہوش و حواس پلٹے پھر وہی آواز حق ان کے دل سے اُبل کر ہونٹوں تک آنے لگی جس کو بے ہوشی میں ڈوبتے ہوئے انسان کے آخری سانس تک سُنا گیا تھا۔ اب اس آواز کے مخاطب غیر نہیں اپنے تھے ـــــ وہ ماں اور باپ تھے جن کے خون جگر کے احسانات میں اپنے بال بال کو بندھا ہوا پا کر ابو بکر رضہ بے قرار تھے کہ ان احسانات کا کچھ صلہ پیش کر سکیں ـــــ درد میں ڈوبی ہوئی آواز ـــــ زخموں کی کسک اور خون دل و جگر میں نہائی ہوئی یہ پکار بھلا رائیگاں کیسے جاتی! باپ کے قدموں میں جنبش نہ ہوئی لیکن دل ضرور ہل گیا اور ماں کا تو پورا وجود بیتاب ہو کر اپنے بیٹے کے ساتھ ہو گیا ـــــ صبح ہوئی تو ابو بکر رضہ روحانی مسرت میں ڈوبے ہوئے اپنی والدہ ماجدہ کو ساتھ لئے ہوئے

بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور جس ماں نے ان کو جنم دیا تھا اس کو اس کے خالق و پروردگار کے قدموں تک پہنچا دیا!

ہماری رگوں میں دوڑتا ہوا خون بھی گواہ ہے کہ اس خون کے قطرے قطرے پر باپ کے پسینے اور ماں کی ممتا کی گہری چھاپ ایک انمٹ احسان کے نقش دوام کی طرح ثبت ہے۔ لیکن ہم میں سے کتنے احسان شناس ہیں ایسے مومن جو جذبۂ شکر و پذیرائی لیکر حیات دنیا کے ان دو عظیم محسنوں کو عذاب نار سے بچانے اور باغ فردوس تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہوتے ہوں جن کو دنیا والدین کے قیمتی نام سے یاد کرتی آئی ہے۔ خدا تو نظروں سے اوجھل ہے لیکن ماں باپ؟ ان کے احسانات کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کا جواز کیا ہے آخر؟ ۔۔۔ کاش ہم سچ مچ "مسلمان ہوتے تو احسان کی پذیرائی کا یہ پہلو ہمیں انسانوں کی شکر گذاری سے بڑھ کر معبود کے آگے تصویر شکر بن جانے کے بلند مقام تک کھینچ لاتا۔ شکر جو ریاضتوں اور مجاہدوں کے بغیر انسان کو کمال تقویٰ کی سربلندیوں تک لے جاسکتا ہے

"شکر" جس کے جذب و جنوں میں خدا کے رسولؐ کی یہ حالت ہوتی تھی کہ جائے نماز پر کردہ مقدس پاؤں سوج جاتے تھے اور سینے میں گھٹی ہوئی ہوک کی آواز اس طرح سننے والوں کو سنائی دیتی تھی کہ کلیجہ منھ کو آنے لگتا تھا۔ ایک معصوم رسولؐ کا اگر جذبۂ شکر سے یہ حال ہوتا تھا تو ان لوگوں کا کیا حال ہونا چاہئے جن پر مسلسل خدائی احسانات کی بارش ہو رہی ہے اور مسلسل غفلت

کی سرد مہریوں نے ان کے قرض بندگی کے احساسات کو پتھرا کر رکھدیا ہے --- ایمان آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا لیکن اس کے آثار نظر آیا کرتے ہیں --- تو کیا شکرِ والدین کی یہ ایمانی علامت بھی کہیں سے کہیں تک ہماری زندگی میں دیکھی جاسکتی ہے؟ (تجلی مئی ۶۳ء)

نیکی میں پہل ------ "ایک عظیم ترین نیکی"

بارگاہ خلافت کے دروازے پر

معززین کا ایک جلیل القدر وفد حضرت عمرؓ ابن خطاب کے پرجلال حضور میں بار پانے کے لئے اذن کا منتظر کھڑا تھا۔ ان میں جہاں مکے کے بڑے لوگ تھے وہاں ایک ایسا شخص بھی تھا جو کبھی ان ہی لوگوں کے درمیان ایک کچلا ہوا سیاہ فام غلام رہ چکا تھا۔ یہ حبش کے بلال رضؓ تھے۔

لیکن خلافتِ رسول صؐ کی عظیم بارگاہ کا دروازہ سب سے پہلے جس شخص کے لئے کھُلا وہ بھی یہی بلال رضؓ حبشی ہی تھے!

وفد کے وہ لوگ جو رنگ ونسل، عزّوجاہ اور دولت وثروت کے لحاظ سے کہیں زیادہ "ممتاز" تھے وہ سب کھڑے کے کھڑے رہ گئے، دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور حضرت بلال رضؓ اندر داخل ہو گئے۔ یقیناً یہ ایک امتیازی سلوک تھا جو ایک "غلام" کے حصّے میں آیا اور آزاد بڑے لوگ اس سے محروم رہ گئے۔ چہروں کا رنگ تبدیل ہوا۔ دل شکنی اور خفّت کا احساس چہروں سے ٹپک پڑا۔ بعض لوگ تو اس حد تک آزردہ اور مجروح ہوئے کہ مہرِ سکوت ٹوٹ گئی۔ بات طنز تک جا پہنچی۔

"اشراف مکہ منتظر بیٹھے ہیں اور ——— ایک غلام کو شرف باریابی حاصل ہو رہا ہے!......"

وفد کے لوگوں میں وہ تاریخی ہستی بھی تھی جس کا نام عکرمہ رضہ ابن ابی جہل تھا ــــ بدترین کافر کا ایک بہترین مومن بیٹا! دنیاوی عزت وجاہ میں ڈوبا ہوا یہ طنزیہ ریمارک ان کی ایمانی ذکاوت حس میں چبھ کر رہ گیا ــــ اور ــــ اس وقت یکایک ان کے دل ودماغ اس عظیم اور لرزہ خیز ماضی میں واپس چلے گئے جب عکرمہ خود کفر وشرک کی زہریلی تلوار تھے اور بلال رضہ اسلام کا جراحت کیش سینہ ــــ جب عکرمہ خود تو اسلام کو مٹانے کی کوشش کر رہے تھے اور بلال رضہ حق کے لئے آنسو پی پی کر اور زخم کھا کھا کر کہے جا رہے تھے کہ "خدا ایک ہے اور میں اس کا حقیر بندہ ہوں!"

"کیا کہہ رہے ہو!!" عکرمہ تڑپ اُٹھے "بلانے والے نے سب کو ایک آواز سے بلایا تھا۔ لیکن ... ہم نے اس وقت بھی اس آواز کو بعد میں سنا۔ لہذا اب بھی وہی لوگ پہلے باریابی کے بجا طور پر حقدار ہیں جنھوں نے اسلام کی آواز پر ہم سے پہلے لبیک کہا ــــ ارے ہمیں تو شکایت کی زبان کھولنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا!..."

بات بیحد وزنی تھی اور آواز انتہائی جذباتی۔ سب ہی لوگ سوچنے لگے کہ واقعی ایک مومن کو اسی طرح سوچنا چاہیے۔ سوچنا چاہیے کہ نیکی کو اپنانے کے مقابلے میں نیکی میں پہل کرنا بہت ہی بڑی نیکی ہے۔ ... لیکن ... لیکن ہم اس دور کے مسلمان مسلمان اور مومن ہوتے ہوئے اس طرح کیوں نہیں سوچتے آخر؟ ــــ کہ آج ایک بار پھر جب خود مسلم ممالک کی عدالتوں، ایوانوں، گھروں، سڑکوں اور گلیوں سے

نکلا ہوا "اسلام" اپنے ہی نام لیواؤں کو نام بہ نام پکار رہا ہے
کہ تم میرے ہو تو مجھ سے دور کیوں بھاگے جاتے ہو؟! تو ہم اس
وقت "اپنے اسلام" سے پیٹھ پھیرے ہوئے اور باطل کی طرف
قبلہ رو کھڑے ہوئے اس بات کے منتظر بیٹھے رہتے ہیں کہ کوئی اللہ
کا بندہ نیکی میں پہل کرے تو ہمارے منہ بھی ادھر سے اُدھر
پھیر دے یا — لیکن نہ جانے کیوں اب یہ بات ہمارے گوشۂ
دل کو نہیں چھیڑتی کہ نیکی میں آگے نکلنے والے کی جھولی میں خود "خدا"
ہوتا ہے جبکہ نیکی میں پیچھے رہ جانے والوں کو محض خدا کا انعام
ہی ہاتھ آتا ہے — اور یہ کہ نیکی میں پہل وہ شے ہے جو چھوٹے
کو بھی بہت بڑا بنا دیتی ہے۔

شاید ہم جیسے چھوٹوں کے لئے ایک بڑا بھاری انعام
حاصل کرنے کا یہی ایک شاندار دروازہ اور ایک زبردست
موقعہ ہے۔ کون ہے جو اس مبارک دروازے پہ دستک دے؟
— ہے کوئی جو اس موقعہ سے فائدہ اٹھائے؟ —

حضرت سلمانؓ فارسی، حضرت بلالؓ حبشی اور حضرت صہیبؓ
رومی یکجا بیٹھے ہوئے تھے۔

تینوں ہی "غلام" رہ چکے تھے۔

لیکن سچائی کو ڈھونڈنے اور قبول کرنے کی پہل اور پھر
اس سچائی کے لئے زخم کھانے کی والہانہ ہمت نے انھیں کیا
سے کیا بنا دیا تھا! — اللہ کے تینوں چاہنے والے اور خود اللہ

کے چہیتے بندوں نے دیکھا کہ اپنے زبردست دورِ کفر کا ابوسفیان ان کے سامنے سے نکلا جا رہا ہے۔ ابوسفیان کی صورت دیکھنا اس وقت گویا خدا سے بغاوت و سرکشی کو چلتا پھرتا دیکھنا تھا۔ غیرت ایمانی کے ان دیوانوں کو اس منظر کی تاب کہاں تھی۔ تینوں بےچین ہو گئے۔ سینوں میں جوش مارتا ہوا غیرت ایمانی کا لاوا ہونٹوں سے پھٹ پڑا۔

"ارے! اللہ کی تلوار نے اس دشمن خدا کی گردن نہیں اڑائی!" ایک جوشیلی آواز آئی۔

حضرت ابوبکرؓ پاس سے گزر رہے تھے۔ یہ اندازِ گفتگو جس میں تلوار کی سی کاٹ تھی بڑا جارحانہ محسوس ہوا۔

"تم لوگ قریش کے ایک بڑے آدمی کے متعلق ایسا کہتے ہو!" حضرت ابوبکرؓ نے مخلصانہ تنبیہ کی۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچکر جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ واقعہ بیان کیا تو ان کے پاؤں تلے کی زمین کھسکنے لگی۔

"تم نے شاید ان کو خفا کر دیا؟!" حضورؐ نے فرمایا"..... ..اگر سچ مچ انہیں خفا کر دیا ہے تو گویا تم نے اپنے خدا کو خفا کر دیا ہے......"

کتنے بھاری تھے یہ پیغمبرانہ الفاظ! — جو نیکی میں پہل کرنے والے چند غلاموں اور بیکسوں کے متعلق اس ہستی سے کہے گئے جس نے خود بھی نیکی میں پہل کی تھی! — مگر یہ فرق اس برابری کی

پہل کے بعد بھی کبھی نہ مٹ سکا کہ حضرت ابو بکرؓ نے آزادی و آسودگی کی زندگی میں اسلام قبول کیا تھا جب کہ سلمانؓ، بلالؓ اور صہیبؓ نے جاں گسل غلامی کے بوجھ تلے پستے ہوئے خدا کے رسول کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا تھا۔ اللہ اکبر! ان بلا کشان حق کا درجہ! ان کے ماتھے کی ایک شکن سے آخرتیں تہ و بالا ہو سکتی تھیں ـــ وہ جدھر غصہ سے دیکھتے تھے ادھر ہی خدا کا عتاب ساتھ آتا تھا۔ لرزتے کلپتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ صدیق پھر ان تینوں کے پاس پہنچے اور سامنے جاتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔

"میرے پیارے بھائیو!" حضرت ابو بکرؓ گڑگڑائے "کیا.... میں نے.. تمہیں خفا کر دیا؟...."

"نہیں نہیں!!" ان تینوں اللہ والوں کے منہ سے اخلاق کریمانہ کے پھول جھڑے "ہم غصے نہیں ہوئے۔ ہم تو دعا کرتے ہیں کہ خدا تم کو بخش دے۔"

اور ـــ ان کے یہ الفاظ سنکر حضرت ابو بکر خوشی سے اس طرح مسکرائے جیسے یہ آواز بھی ان تینوں کی نہیں ان کے اپنے خدا کی تھی!۔

عمارؓ بھی ایک غلام خاندان کے چشم و چراغ تھے ـــ ایک چراغ جو بیکسی کے آنسوؤں سے جلتا اور اپنے ہی خون سے روشن ہوتا تھا۔

لیکن ہائے وہ "غلام خاندان" جس کو آقائے جن و انس

نے توحید و رسالت کے لئے کفر و شرک کے جبڑوں میں پستے ہوئے دیکھا ہو اور کہا ہو ـــــ

"صبر! ـــــ اے آل یاسر! صبر!! ـــــ سچ کہتا ہوں خدا کی جنت ہی تمہارا ٹھکانہ ہے"

عمارؓ کے مقابلے میں حضرت خالدؓ ابن ولید ایک بڑے قریشی سپہ سالار تھے۔ جو کفر کے وقت بھی سپہ سالار تھے اور اسلام لانے کے بعد بھی۔ پھر اسلام لانے کے بعد جہاد و عزیمت کے بیسیوں میدانوں میں انھوں نے اپنی ایمانی طاقت اور فولادی تلوار کے وہ جوہر دکھائے وہ تو ایسے تھے کہ پھر تو خالدؓ کا نام ہی "اللہ کی تلوار" پڑ گیا تھا

عمارؓ نے بھی اگرچہ جہاد و عزیمت کی قربانگاہوں کو زینت بخشی اور تیروں تلواروں کی زد میں اپنا بیقرار سینہ کھول کھول کر خدا سے عہد بندگی وفا کیا، لیکن ان کی قربانیاں ایک سپاہی کی قربانیاں تھیں اور خالدؓ کے کارنامے ایک سپہ سالار کے کارنامے تھے

ـــــ پھر بھی! ـــــ ہاں، پھر بھی!!

خدا کی نظر میں وہ عمارؓ جس نے محض اپنی زندگی کا دروازہ حق و صداقت کے لئے پہلے کھولا تھا اُس خالدؓ سے کس قدر اونچا اُٹھایا گیا جس کی تلوار کی برق بیاں نے خدا کی وسیع و عریض سرزمینوں پر کوند کوند کر باطل کے خرمن خاک کئے اور اسلام کے پرچم لہرائے!!

کسی بات پر دونوں میں بحث ہو رہی تھی کہ دونوں طرف جذبات تیز ہوگئے

اور حضرت خالدؓ کے منہ سے بے اختیار ایک ایسی بات نکل گئی جو حضرت عمارؓ کے لئے کسرِ شان تھی۔ آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپؐ حضرت خالدؓ سے روٹھ گئے۔

"اے خالدؓ!" خدا کے رسولؐ نے دلریشی کے عالم میں فرمایا "عمارؓ کو برا نہ کہو۔ جو اس کو بُرا کہتا ہے اس کو اللہ بُرا کہتا ہے۔ جو عمارؓ سے بغض رکھتا ہے وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہے — جو عمارؓ کی تحمیق کرتا ہے اللہ اس کی تحمیق کرتا ہے۔"

"یہ دن!" حضرت خالدؓ نے لوگوں کو خود بتایا "میرے لئے بڑا سخت دن تھا! میں نے حضورؐ سے التجا کی کہ اللہ سے میرا گناہ معاف کرا دیجئے اور میں خود عمارؓ کے پاس دوڑا ہوا گیا اور ان سے عفو و درگذر کی درخواست کی۔"

..... کبھی ہمارا یہی حال تھا کہ ہم مومنین — خدا کے بندوں کے غصے سے بھی ڈر جاتے تھے۔

لیکن!— کیا یہ ایک بہت ہی بُرا واقعہ نہیں ہے کہ اب خود خدا کے قہر و غضب سے بھی ہمیں ڈر نہیں لگتا؟....

اور — اور

پھر بھی — ہم "مسلمان" ہیں

..... پھر بھی ..... "مسلمان" ہیں۔

ان لوگوں میں کچھ لوگ نیکی میں پہل کرنیوالے تھے اور کچھ لوگ نیکی میں ذرا پیچھے رہ جانیوالے — ہم لوگ، ہائے ہم لوگ آخر کہاں ہیں؟—

..... کون کسے بتائے!..... کون کسے بتائے!! (غیر مطبوعہ)

ایمان افروز کتابیں

بدعت کیا ہے؟

چار ایسے مدلل اور قیمتی مقالات جن میں بہترین عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ بدعتوں کی تردید اور سنتوں کی تائید کی گئی ہے۔ ہر عام و خاص کے لئے مفید۔ مجلد تین روپے

رد بدعت

مجدد الف ثانی رح کے ارشادات کی روشنی میں بعض خاص بدعات کا رد سوا روپیہ

وجد و سماع

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رح کا بیش بہا رسالہ جسے پڑھ کر آپ پر قوالی، گانا بجانا اور وجد و حال کی شرعی حیثیت واضح ہوگی مذہبیت جس کا فکر انگیز مقدمہ سونے پر سہاگے کا کام دے رہا ہے قیمت صرف ایک روپیہ۔

تفسیر سورۂ نور

سورۂ نور ہر مسلمان کے کام آنے والی اخلاقی ہدایات کا خزانہ ہے اور مولانا مودودی نے اسکی تفسیر میں علم و فراست اور توضیح و تشریح کا حق ادا کر دیا ہے پچھلے مفسرین، محدثین اور فقہا کی آثار کا نچوڑ۔

قیمت ---- مجلد ...... چار روپے

کیا ہم مسلمان ہیں

شمس نوید عثمانی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ایک ایک سطر سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی دلپذیر انشا، اثر آفرین زبان و بیان اور روح نواز و دل بستہ۔ یہ کتاب بار بار مطالعے کے قابل ہے۔ سوا دو روپے

مکتبہ تجلی ― دیوبند یوپی ― حصہ دوم مجلد تین روپے